دسمبر 2012

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

کہنی سُنتی — مدیرہ — 14
کرن کرن روشنی — ادارہ — 15
ہمارے نام — نادرہ خاتون — 270

آپ سے کیا پردہ

بہاریں کراچی کی — انشا جی — 20

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے — امت الصبور — 266

مجھ سے ملیے

جنید خان نیازی — شاہین رشید — 27

انٹرویو

سنبل شاہد — شاہین رشید — 22
میری خاموشی — ادارہ — 278

ناول

میرے خواب لوٹا دو — نگہت عبداللہ — 194
کوہ گراں تھے ہم — عنیزہ سید — 30

مکمل ناول

زمین کے آنسو — نگہت سیما — 216
تیرے میرے درمیان — مہوش افتخار — 146
کچھ پھول کچھ چراغ — سلویٰ علی بٹ — 84

ناولٹ

بیلی کاولی — وجیہہ احمد — 124

افسانے

سب سمجھوتا — نعیمہ ناز — 68
مجبوری کا نام — ثریا انجم — 118
یارو دعا کرو — سائرہ رضا — 182
ارمان — رشک حبیبہ — 76
کیسا انتقام — نظیر فاطمہ — 256

نظمیں غزلیں

غزل — اظہر عباس — 261
نظم — افتخار عارف — 260
غزل — حمیدہ شاہین — 260
نظم — وقاص ہاشمی — 261



دسمبر 2012
جلد 40 شمارہ 8
قیمت 50 روپے

رنگا رنگ پھول

رنگارنگ سلسلہ — شگفتہ حیاء — 262
خبریں وبریں — تبصیر نشاط — 282
روشن حرف — عروج انجم — 269

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے — خالدہ جیلانی — 268

پکوان

آپ کا باورچی خانہ — بشریٰ نوید باجوہ — 285
موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 287

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں — عدنان — 288

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے — امت الصبور — 290

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کھی باتیں

خواتین ڈائجسٹ کا دسمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

دسمبر۔ سالِ رواں کا آخری مہینہ۔

پے در پے حوادث سے الجھتا ایک اور سال اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔

آتے جاتے موسم اور چڑھتے ڈوبتے روز و شب اداسی کا احساس گہرا کرتے جاتے ہیں۔ گزرتے وقت کا ساتھ نہ دے پانے، پیچھے رہ جانے کا احساس ملال کی کیفیت میں اضافہ کرتا ہے۔ کتنے سالوں سے دن رات کے الٹ پھیر اور موسموں کے تغیر و تبدل کے باوجود وقت جیسے جامد سا ہو گیا ہے۔

وطنِ عزیز جن بحرانوں کی زد میں ہے، صاحبانِ اختیار و اقتدار کو اس کا احساس و ادراک ہے اور نہ ان بحرانوں سے نکلنے کی حکمتِ عملی کا شعور۔ دائرے میں گھومتے سفر کا اختتام ہے نہ منزل۔

آنے والے وقت کی بہتری کی دعا کرتے ہوئے امید کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ اس چراغ کو جلتے رہنا چاہیے۔ خالقِ کائنات ہر شے پر قادر ہے۔

سالِ نو نمبر۔ سروے،

جنوری کا شمارہ سالِ نو نمبر ہوگا۔ اس میں دیگر دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ قارئین کی شمولیت کے لیے حسبِ روایت سروے بھی شامل ہوگا۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔ گیا سال کیا دے گیا؟ کوئی ملال، کوئی خوشی، کوئی خوبصورت احساس یا آگہی؟

2۔ سنہ 2012ء کی ابتدا میں آپ نے خود سے کئی عہد و پیماں کیے ہوں گے۔ ان میں سے کتنے پایۂ تکمیل کو پہنچے اور کتنے ادھورے رہ گئے؟

3۔ اس سال جو کتابیں پڑھیں، ان میں سے کس کتاب نے آپ کو متاثر کیا؟

4۔ کوئی شعر یا اقتباس جو آپ کو اچھا لگا؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 20 دسمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- نگہت سیما کا مکمل ناول۔ زمین کے آنسو،
- سلویٰ علی بٹ کا مکمل ناول۔ کچھ پھول، کچھ چراغ،
- مہوش افتخار کا مکمل ناول۔ تیرے میرے درمیان،
- بیلی کا ولی۔ وجیہہ احمد کا ناولٹ،
- نعیمہ ناز، رشک حبیبہ، ثریا انجم، سائرہ رضا اور تنظیر فاطمہ کے افسانے،
- عنیزہ سید اور نگہت عبداللہ کے ناول،
- ٹی وی فنکارہ سنبل شاہد سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

سالِ رواں کا یہ آخری شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں اپنی رائے سے نوازیے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دینِ اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

قناعت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے

کہ میں نے ستر اہل صفہ کو دیکھا۔ ان میں سے کسی کے پاس جسم کے اوپر کا پورا حصہ چھپانے کے لیے چادر نہیں تھی۔ کسی کے پاس (نچلا دھڑ ڈھانکنے کے لیے) ازار (پاجامہ، تہ بند اور شلوار وغیرہ) ہوتی اور کسی کے پاس چادر ہوتی، جسے وہ اپنی گردنوں میں باندھ لیتے وہ کپڑا کسی کی نصف پنڈلی تک پہنچتا اور کسی کے ٹخنوں تک۔ پس وہ اسے اپنے ہاتھ سے اکٹھا کر کے رکھتے کہ کہیں ان کا قابلِ ستر حصہ عریاں نہ ہو جائے۔

(بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ صفہ، چبوترے یا ڈیوڑھی کو کہتے ہیں۔ مسجد نبوی کے آخر میں یہ چبوترہ تھا، جس پر چھت ڈالی گئی تھی۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے علم دین حاصل کرنے والے اور جہاد کی تربیت لینے والے صحابہ وقت گزارتے تھے۔ ان کو اہل صفہ کہا جاتا تھا۔ ان کی کوئی متعین تعداد نہیں تھی اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ یہ اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ یا نبوی درس گاہ تھی اور معسکر بھی۔

اس میں آج کل کے طلبائے علوم دینیہ کے لیے بڑی عبرت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کس طرح ایک چبوترے پر اپنے شب و روز گزار کر اور اسی طرح کھانے سے بے نیاز ہو کر (کہ کبھی مل گیا تو کھا لیا، نہیں تو فاقہ) دین کا علم حاصل کیا اور جہاد کی تربیت لی۔

ایسے رہو

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھے سے پکڑ کر فرمایا۔

"تم دنیا میں ایسے رہو گویا تم ایک پردیسی یا راہ گیر ہو۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار مت کرو اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار مت کرو اور اپنی صحت میں بیماری کے لیے اور اپنی زندگی میں موت کے لیے (کچھ) حاصل کر لو۔ (بخاری)

علماء نے اس حدیث کی شرح میں اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ (اس کا مطلب ہے) تم دنیا کی طرف زیادہ مت جھکو' نہ اسے مستقل وطن بناؤ' نہ اپنے جی میں زیادہ دیر دنیا میں رہنے اور اس پر زیادہ توجہ دینے کا پروگرام بناؤ۔ اس سے تم صرف اتنا ہی تعلق رکھو' جتنا ایک مسافر اجنبی دیس سے تعلق رکھتا ہے اور دنیا میں زیادہ مشغول نہ ہو' اسی طرح جیسے ایک مسافر' جو اپنے گھر جانے کا ارادہ رکھتا ہو' دیار غیر سے زیادہ وابستگی نہیں رکھتا۔

فائدہ :

1۔ جو شخص دنیا کو ایک مسافر خانہ اور گزر گاہ سمجھے گا' وہ یقیناً" دنیاوی چیزوں سے اپنا دامن الجھانا پسند نہیں کرے گا۔ انسان کی غلطی یہی ہے کہ وہ اس کی اس حیثیت کو نہیں سمجھتا اور پل کی خبر نہ ہونے کے باوجود سو برس کے سامان کی تیاری میں لگا رہتا ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔

اللہ کی محبت

حضرت ابو عباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! مجھے ایسا عمل بتلایئے' جب میں وہ کروں تو اللہ بھی مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی مجھے محبوب جانیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے' اس سے بے نیاز ہو جاؤ تو لوگ تم سے محبت کریں گے۔" (یہ حدیث حسن ہے' اسے ابن ماجہ وغیرہ نے حسن سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل

1۔ زہد' دنیا اور اس کے علائق سے کنارہ کشی کا نام نہیں' بلکہ زہد کا مطلب ہے کہ رزق حلال پر قناعت کرنا اور کمائی کے ناجائز ذرائع اختیار کرنے سے اجتناب کرنا' کیونکہ اسلام میں ترک دنیا کی اجازت ہے' نہ مال و دولت کے حصول کی سعی و کوشش مذموم' اس لیے دنیا سے تعلق اور معاش کے لیے سعی و جہد زہد کے منافی نہیں۔ بلکہ صرف حلال ذرائع اور حلال آمدنی پر کفایت' اسے عبادت کا درجہ عطا کر دیتی ہے۔ اسی طرح لوگوں کے مال و دولت سے بے نیازی اور ان سے صرف نظر کر لینا بھی زہد اور استغنا و قناعت کا حصہ ہے۔

2۔ اس سے ایک اضافی فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ انسان لوگوں کی نظروں میں محبوب اور معزز ہو جاتا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے برعکس لوگوں کے سامنے دست طلب دراز کرنے سے انسان ذلیل ہوتا ہے اور لوگ اسے پسند نہیں کرتے' جبکہ اللہ کا معاملہ ہے کہ اس سے جتنا مانگو' وہ اتنا ہی خوش ہوتا ہے' بلکہ نہ مانگنے پر وہ ناراض ہوتا ہے۔

دنیا کی تنگی

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دنیا کے اس مال و اسباب کا ذکر کیا' جو لوگوں کو (پہلے کے مقابلے میں زیادہ) حاصل ہو گیا تھا اور پھر فرمایا۔

"میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ سارا دن بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر جھکے رہتے (تاکہ بھوک کی شدت کم محسوس ہو) آپ کو ردی کھجور بھی میسر نہ ہوتی جس سے آپ اپنا پیٹ بھر لیتے۔" (مسلم)

فائدہ :

1۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کثرت فتوحات کی وجہ سے لوگ پہلے کی نسبت زیادہ خوشحال ہو گئے تو انہوں نے لوگوں کو یاد دلایا کہ وہ وقت یاد رکھو جب اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان نہایت کٹھن حالات اور فقر و فاقہ سے دوچار رہے حتیٰ کہ پیغمبر اسلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک کی یہ حالت تھی' جو روایت میں بیان ہوئی ہے۔ مقصد اس کے بیان سے لوگوں کو تنبیہ کرنا تھا کہ تمہیں مال و دولت کی فراوانی اور دنیوی آسائشوں کی کثرت تمہیں دنیا کی محبت میں اس طرح نہ پھنسا دے کہ آخرت کی زندگی کو تم بھلا بیٹھو اور غفلت کا شکار ہو جاؤ۔

صرف جو

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ میرے گھر میں کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو کوئی جان دار کھائے' سوائے ان تھوڑے سے جو کے جو میرے طاق رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں ایک مدت دراز تک اسی میں سے (لے لے کر) کھاتی رہی! (بالآخر ایک دن) میں نے اسے ماپا تو وہ ختم ہو گیا۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری دور میں اگرچہ مال غنیمت کے آنے کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو پہلے کی نسبت آسودگی کے ساتھ وقت گزار سکتے تھے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی فقر و تنگ دستی کی زندگی کو اختیار کیے رکھا' جو غنیمتوں کے آنے سے پہلے تھی۔

2۔ اس میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی زاہدانہ زندگی کا تذکرہ فرمایا ہے' حالانکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ چہیتی بیوی کا گھر تھا۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل و انصاف کا بھی پتا چلتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شدید محبت کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ' دوسری بیویوں کے مقابلے میں کوئی ترجیحی سلوک نہیں کیا بلکہ سب کے ساتھ یکساں معاملہ فرمایا۔

3۔ اس میں علمائے کرام اور ان کے اہل خانہ کے لیے بڑا سبق ہے کہ وہ اہل دنیا اور ان کو میسر آسائشوں کی طرف نہ دیکھیں بلکہ پیغمبر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی زندگیوں کو سامنے رکھتے ہوئے کم سے کم آمدنی میں گزارہ کرنے کو سعادت سمجھیں۔

4۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کھانے پینے کی چیزوں کو بغیر ناپے تولے استعمال کیا جائے' اس میں برکت رہتی ہے اور ناپنے تولنے سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔

ترکہ

حضرت عمرو بن حارث' ام المومنین حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے بھائی' سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موت کے وقت کوئی دینار و درہم چھوڑا' نہ کوئی غلام لونڈی اور نہ کوئی اور چیز۔ البتہ وہ سفید خچر چھوڑا' جس پر آپ سوار ہوتے تھے اور اپنے ہتھیار اور وہ زمین جسے آپ نے مسافروں کے لیے صدقہ (وقف) کر دیا تھا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ سن 5 ہجری میں غزوہ بنی المصطلق ہوا۔ اس میں جو کافر مرد و عورت قیدی بنے' ان میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسلمان کر کے ان سے نکاح کر لیا اور اپنے حرم میں شامل فرما لیا۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معلوم ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سسرالی

رشتے کا لحاظ کرتے ہوئے انہوں نے **بنوالمصطلق** کے تمام قیدیوں کو' جو سو کے قریب تھے' رہا کردیا۔

2۔ ہتھیار سے مراد آپؐ کا نیزہ اور تلوار ہے اور زمین سے مراد آپؐ کا وہ حصہ جو فدک اور خیبر وغیرہ میں آپؐ کو ملا تھا۔ اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فرمادیا' کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا" ہم انبیاء کی جماعت ہیں ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا' ہم جو کچھ چھوڑ جائیں' وہ صدقہ ہے۔" وفات کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی غلام اور لونڈی ایسی نہیں چھوڑی' جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد نہ کردیا ہو۔

اللہ کی رضا

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے اللہ کی رضا کی تلاش کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی تو ہمارا اجر اللہ پر ثابت ہوگیا۔ چنانچہ ہم میں سے بعض وہ ہیں' جو فوت ہوگئے اور اپنے اجر میں سے کوئی حصہ (مال غنیمت وغیرہ کی صورت میں) انہوں نے نہیں کھایا۔ ان میں سے ایک حضرت **مصعب بن عمیر** رضی اللہ عنہ ہیں جو جنگ احد میں شہید ہوئے۔ انہوں نے ایک کمبل اپنے پیچھے چھوڑا تھا۔ جب ہم اس کے ساتھ ان کا سر ڈھانپتے تو ان کے پیر ننگے ہوجاتے اور جب پیر ڈھانپتے تو سر کھل جاتا۔ چنانچہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم ان کا سر ڈھانپ دیں اور ان کے پیروں پر کچھ اذخر گھاس ڈال دیں اور بعض ہم میں سے وہ ہیں' جن کے پھل پک گئے ہیں اور وہ اسے چن رہے ہیں (یعنی ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں)

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں ہجرت اور جہاد کی فضیلت اور اس کے اجر و ثواب کا بیان ہے۔ یہ اجر دنیا میں مال غنیمت کی صورت میں بھی ان غازیان اسلام کو ملتا ہے' جو جہاد سے بخیریت واپس آجاتے ہیں اور آخرت میں بھی ملے گا اور جو لوگ میدان جہاد ہی میں جام شہادت نوش کرجاتے ہیں' انہیں ان کا سارا اجر قیامت ہی کو ملے گا۔

2۔ بسا اوقات انسان اپنی نیکی کا پھل کھائے بغیر ہی اس دنیا سے چلا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی اولاد کو اس کی نیکیوں کی بدولت خیر و برکت عطا فرمادیتا ہے۔ جیسا کہ سورہ کہف میں خضر علیہ السلام کے واقعہ میں دو یتیموں کی دیوار کو درست کرنے کا واقعہ میں جتایا گیا ہے۔

دنیا کی وقعت

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر دنیا کی وقعت اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کسی کافر کو اس میں سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا۔" (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے' یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ :

1۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ کے نزدیک دنیا اور اس کے مال و اسباب کی قطعاً" کوئی اہمیت نہیں ہے' لہٰذا اہل ایمان کے نزدیک بھی اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہونی چاہیے اور اسے صرف آخرت کی زندگی سنوارنے کے لیے ایک ذریعہ یا امتحان سمجھنا چاہیے۔

دینی علوم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"لوگو! آگاہ رہو۔ دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے' وہ بھی ملعون ہے' سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور ان چیزوں کے جو اس سے تعلق رکھتی ہیں اور سوائے دینی علوم سے بہرہ ور اور اس کا علم حاصل کرنے والوں کے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا اور کہا ہے' یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے مراد دنیا کا مطلقاً" ملعون ہونا نہیں' بلکہ اصل مطلب دنیا کی ان چیزوں کا ملعون ہونا ہے' جو انسان کو اللہ سے دور اور اس کی اطاعت سے مشغول کر دیں۔ اس اعتبار سے دنیا کی کوئی چیز مذموم بھی ہوسکتی ہے اور محمود بھی' **مثلاً**" مال محمود ہے' اگر اسے حلال طریقے سے حاصل اور حلال مصارف ہی پر خرچ کیا جائے' بصورت دیگر یہی مال مذموم و ملعون ہے۔

2۔ وہ علم بھی محمود و مطلوب ہے' جو اللہ کے قریب کر دے۔

بنو قریظہ کا انجام

اس مصیبت سے رہائی کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کو بلا بھیجا کہ وہ سامنے آکر اپنے اس طرز عمل کی وجہ بیان کریں۔ اب بنو قریظہ قلعہ بند ہو بیٹھے اور لڑائی کی پوری تیاری کرلی۔ اس وقت مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا کہ بنو نضیر کا سردار حیی بن اخطب جو بنو قریظہ کو مسلمانوں سے مخالف بنانے آیا تھا۔ اب تک ان کے قلعے کے اندر موجود ہے۔

بنو قریظہ کا یہ غدر ان کی پہلی حرکت ہی نہ تھی۔ بلکہ جنگ بدر میں انہوں نے قریش کو (جو مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے تھے) اسلحہ سے مدد دی تھی۔ مگر اس وقت رحم دل نبی کریمؐ نے ان کا یہ قصور معاف کردیا تھا۔

اب ان کے قلعہ بند ہوجانے سے مسلمانوں کو مجبوراً" لڑنا پڑا۔ بہ ماہ ذی الحجہ محاصرہ کیا گیا جو 25 دن تک رہا۔ محاصرہ کی سختی سے بنو قریظہ تنگ آگئے۔ انہوں نے قبیلہ اوس کے مسلمانوں کو جن سے ان کا پہلے ربط و ضبط تھا' بیچ میں ڈالا اور نبی کریمؐ سے منوالیا کہ بنو قریظہ کے معاملے میں سعد بن معاذ کو (جو اوس کے سردار قبیلہ تھے) حکم (سرپنچ اور منصف) تسلیم کیا جائے۔ جو فیصلہ سعد کردے خدا کا نبی (صلعم) اسی کو منظور کرلے۔

بنو قریظہ قلعہ سے نکل آئے اور مقدمہ سعد بن معاذ کے سپرد کیا گیا۔ خدا جانے بنو قریظہ کے یہودیوں اور اوس کے مسلمانوں نے سعد بن معاذ کو حکم بناتے ہوئے کیا' کیا امیدیں ان پر لگائی ہوں گی' مگر ضروری تحقیقات کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ دیا۔

1 ۔ بنو قریظہ کے جنگ جو مرد قتل کیے جائیں۔
2 ۔ عورتیں اور بچے مملوک بنائے جائیں۔
3 ۔ مال تقسیم کیا جائے۔

اس فیصلہ کی تعمیل کے متعلق صحیح بخاری میں جو روایت ابو سعید خدریؓ سے ہے' اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ آور مرد قتل کیے گئے تھے' لیکن اس حدیث میں عورتوں اور بچوں کے مملوک بنائے جانے کا کچھ ذکر نہیں۔ اس فیصلہ کے متعلق قارئین یہ بھی یاد رکھیں کہ یہودیوں کو ان کے اپنے منتخب کردہ منصف نے قریباً" وہی سزا دی تھی' جو یہودی اپنے دشمنوں کو دیا کرتے تھے اور جو ان کی شریعت میں ہے۔ تقریباً" اس لیے لکھا گیا کہ یہودی اپنے قیدیوں کو اس سے زیادہ سخت سزائیں دیا کرتے تھے۔

ہمارے پاس یہ امر باور کرنے کی وجوہات اور نظائر موجود ہیں کہ اگر بنو قریظہ اپنا معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کردیتے تو ان کو زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جاتی' وہ یہ ہوتی کہ جاؤ! خیبر میں آباد ہوجاؤ۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر کا معاملہ اس کی نظیر ہے۔ نبی کریمؐ نے تو ان بنو قریظہ میں سے بھی بعض کو رحم شاہانہ سے اس فیصلہ کی تعمیل سے مستثنیٰ فرمایا دیا تھا۔ **مثلاً**" زبیر یہودی کے لیے مع اہل و عیال و فرزند و مال رہائی کا حکم دے دیا تھا اور رفاعہ بن شموئیل یہودی کی بھی جان بخشی فرمادی۔





پھر دیکھو بہاریں کراچی کی

انشاجی

کراچی والے کیا کھاتے ہیں، کیا پیتے ہیں۔ جب تک اس پر پردہ پڑا رہا، اچھا تھا، لیکن اب جو پردہ اٹھنے لگا ہے تو نہ کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے، نہ پینے کو جی چاہتا ہے۔ ہمارے دوست داؤد سبحانی مشہور قد آور صحافی ہیں۔ کان پر قلم اور کندھے پر کیمرا رکھ کر بیرونی بستیوں میں نکل جاتے ہیں، جہاں شہر بھر کے لیے دودھ تیار ہوتا ہے اور گوشت تیار ہوتا ہے۔ مذبح، بھینسوں کے باڑے کے شہر کے مضافات میں واقع ہیں، پرسوں انہوں نے سراغ لگایا۔ یہ ہم ٹی وی کے روزنامہ پروگرام کے باتصویر حوالے سے لکھ رہے ہیں کہ جو بھینسیں بیمار اور قریب المرگ ہو جاتی ہیں، ان کا کیا کیا جاتا ہے۔ ان کی ویسے ہی تجہیز و تکفین کر دی جائے یا کوتوں کے لیے چھوڑ دیا جائے تو وہ بڑا قومی نقصان ہوگا۔ ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت شہریوں کو سپلائی کر دیا جاتا ہے۔ داؤد سبحانی نے پہلے تو میٹ انسپکٹر یا ہیلتھ آفیسر کو پکڑا اور ان کا انٹرویو لیا۔ انہوں نے کہا۔

"صاحب! بھلا ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ ہم بڑے چوکس لوگ ہیں۔ مہریں لیے پھرتے رہتے ہیں، کوئی شخص بیمار بھینس کو ذبح کر کے گوشت شہر نہیں بھیج سکتا۔" داؤد سبحانی نے اس کے فوراً بعد ایک ٹرک پکڑا اور اس کے ساتھ قصائی کو کھڑا کر کے انٹرویو لیا۔ اس نے کہا۔

"ہاں صاحب! یہ بیمار بھینسوں کا گوشت ہے، شہر جا رہا ہے۔" پوچھا "اسے کون کھاتا ہے؟" بولے "ہم تو دکان داروں کے ہاتھ اور ہوٹل والوں کے ہاتھ بیچتے ہیں، ہاتھوں ہاتھ بکتا ہے۔" کس بھاؤ! انہوں نے فرمایا "ہم دو پونے دو روپے سیر دیتے ہیں۔ دکان دار آگے تین ساڑھے تین روپے سیر میں شہریوں کو کھلاتا ہے۔" پوچھا "اس سے لوگ بیمار نہیں ہوتے؟" فرمایا "ضرور ہوتے ہوں گے، لیکن ڈاکٹر کس مرض کی دوا ہیں۔"

یہی دودھ کے معاملے میں ہوا۔ پہلے ہیلتھ آفیسر سے انٹرویو لیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمارے پاس بارہ کل

وقتی اور اٹھائیس جز وقتی انسپکٹر ہیں۔ وہ برابر گشت کرتے رہتے ہیں اور دودھ والوں کو چیک کرتے رہتے ہیں۔ کیا مجال کہ کوئی خراب دودھ بیچ جائے۔ اب داؤد سبحانی نے دودھ بیچنے والے کو پکڑا۔ اس نے اس کی تصدیق کی کہ ہاں فرض شناس انسپکٹر گھومتے تو رہتے ہیں، بلکہ ہر دودھ فروش کی اپنے ایک پھیرے میں محلہ در محلہ دو تین سے مڈبھیڑ ضرور ہوتی ہے لیکن..... لیکن ان سب کے وظیفے ہم نے باندھ رکھے ہیں زیادہ تر کو تو فی دودھ فروش دس روپے ماہانہ ملتا ہے۔ کوئی زیادہ سخت اور بدمزاج ہو تو پندرہ روپے مہینہ۔ دودھ بیچنے والے خوردہ فروش شہر میں کوئی پینتیس ہزار ہیں، باقی حساب آپ پھیلا لیجیے۔

اب سوال آیا دودھ میں پانی کی ملاوٹ کا، بلکہ یہ چیز تو ثابت ہے۔ اس کی مقدار کا، دودھ والا سچ بولنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے کہا جب بھینسوں سے دودھ خریدتے ہیں بیچ والے ٹھیکیدار۔ جنہوں نے "انجمن رفاہ عام بھینس کالونی" کے نام سے ایک انجمن بھی بنا رکھی ہے۔ وہ سیر میں کم از کم پاؤ بھر دودھ ملاتے ہیں اور ان سے ہم خوردہ فروشوں کو 95 روپے من ملتا ہے، یعنی سوا دو اور اڑھائی روپے فی سیر کے درمیان۔ اب ہمیں آگے گاہکوں کے ہاتھ دو روپے سیر بیچنا ہوتا ہے۔ آپ خود ہی حساب لگائیے کہ اپنا گزارہ بھی اس میں سے نکالنا ہے۔ بس باقی پانی، ہم ڈالتے ہیں۔"

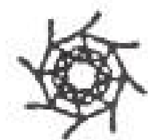
داؤد سبحانی نے پوچھا۔ آپ لوگ کتنا پانی ڈالتے ہیں؟ دودھ والے نے کہا، جتنا بھی ڈال سکیں، جتنی بھی گاہک میں برداشت ہو۔ اگر کسی گاہک میں برداشت کم ہے اور ناک بھوں زیادہ چڑھاتا ہے تو ہم اس کے دودھ میں پانی کی مقدار واجبی یعنی ذرا کم کر دیتے ہیں۔ اس کو الگ ڈول سے دودھ دیتے ہیں۔ شیر فروش نے اس بات کی سختی سے تردید کی کہ دودھ میں سارا پانی ہوتا ہے۔ اس نے کہا صاحب کچھ نہ کچھ تو دودھ ہوتا ہی ہے ورنہ رنگت سفید کیسے ہو۔

اس انٹرویو کے بعد پھر ہیلتھ آفیسر صاحب سے رجوع کیا گیا کہ جناب آپ نے سن لیا، کہتی ہے تم کو خلق خدا غائبانہ کیا؟ اس پر وہ بات کو اکنامکس کی تھیوری میں لے گئے کہ جناب ضرورت زیادہ ہے، رسد کم ہے۔ علاج صرف ایک ہے کہ لوگ دودھ پینا بند کر دیں۔ ویسے ہی پروٹین وغیرہ کھا لیا کریں تاکہ بچوں کو دودھ ملا کرے۔ جب دودھ کی طلب کم ہو گی تو خالص ملے گا۔

جواب تو ٹھیک ہے، لیکن وہ جو اڑتیس انسپکٹر دودھ چیک کرتے اور وظیفے وصول کرتے پھر رہے ہیں، ان کا کیا ہو گا اور وہ فی الحال کس مرض کی دوا ہیں؟ اس کا جواب ہیلتھ افسر نہ دے سکے۔

یہ احوال کراچی کا ہے۔ کراچی والے تو دودھ کے بغیر جی لیں گے، آخر دودھ پیتے بچے تھوڑا ہی ہیں۔ لاہور میں کیا ہوتا ہے۔ کم و بیش یہی ہوتا ہو گا۔ لاہور والے تو دودھ پیتے ہیں۔ لسی پیتے ہیں۔ کشمیری چائے میں دودھ ڈالتے ہیں اور بالائی بھی ڈالتے ہیں۔ ہاں! کچھ بات بالائی کی بھی ہوئی کہ یہ سارے بھاؤ اور ملاوٹیں اپنی جگہ۔ درمیان میں بلکہ شروع ہی میں دودھ کی کریم نکال کر الگ بیچ لی جاتی ہے۔ معلوم ہوا خود بھینس کالونی والوں نے اور ان کی رفاہ عام سوسائٹی نے بصرف زر کثیر بھینسوں کے باڑے ہی میں کریم نکالنے کی مشین لگا رکھی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دودھ کی تخصیص نہیں، ہر معاملے میں یہی ہوتا ہے۔ ہر بات کی کریم شروع ہی میں نکال لی جاتی ہے، شہریوں تک پھوگ پہنچتا ہے۔

(سنہ 1970ء میں لکھا گیا)



بُشریٰ انصاری کی بہن' اداکارہ' گلوکارہ

سُنبل شاہد سے مُلاقات

شاہین رشید

شوبز اور ادب کی دنیا میں دو خاندانوں کو میں نے بہت باصلاحیت پایا ہے۔ ایک انور مقصود صاحب کا خاندان جن کا ہر فرد نامور کہلایا اور دوسرا بشریٰ انصاری کا خاندان۔ والد سے لے کر ان کی بیٹیوں' نیلم' سنبل' بشریٰ اور اسماء سب ہی کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف خوب صورت آواز دی بلکہ ڈرامہ نگاری' شاعری' افسانہ نگاری اور اداکاری کی صلاحیتوں سے بھی نوازا۔

آج ان ہی کی فیملی کی ایک ہر دل عزیز شخصیت سنبل شاہد سے آپ کی ملاقات کرواتے ہیں۔ سنبل کو یوں تو آپ کافی ڈراموں میں دیکھ رہے ہوں گے' لیکن



سوپ "میری بہن میری دیورانی" میں ان کی اداکاری عروج پر ہے۔

س "جی سنبل! کیسی ہیں۔۔۔ ماشاء اللہ بہت اچھی پرفارمر ہیں اور آپ چاروں بہنوں پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ اس نے آپ سب کو اتنی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔"

ج "میں بالکل ٹھیک ہوں اور بہت شکریہ آپ کی تعریف کا اور پیارے اللہ میاں نے مجھے اچھی آواز تو دی' مگر پھر مجھے روک دیا کہ تو گانا نہیں گائے گی۔ اور جب میں چاہوں گا تب تو گائے گی۔"

س "کیا وجہ ہوئی؟"

ج "وجہ یہ ہوئی کہ جس خاندان میں میری شادی ہوئی' وہ فوجیوں کا خاندان ہے' تو ان کا نظریہ یہ تھا کہ آپ کو گانے کا شوق ہے تو آپ گھر میں گنگنا لیں' مگر باقاعدہ آپ گانا نہیں گا سکتیں اور یہ بات انہوں نے اتنے پیار اور اتنے آرام سے کی کہ انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں نکلی اور اس زمانے میں بشریٰ میدان مار رہی تھی۔ ہر چیز میں آگے' آگے' ترقی پہ ترقی اور میں گھر میں' تو اپنی صلاحیتوں کو آگے تک نہ لانے پر دل ہی دل میں تکلیف تو بہت ہوتی تھی مجھے' بشریٰ اور میرے درمیان تھوڑا فرق ہے' وہ مجھ سے تھوڑی چھوٹی ہے تو ہماری سوچ بھی تقریباً" ایک جیسی ہے۔ وہ بھی گاتی ہے اور میں بھی اور جب ہماری شادیاں نہیں ہوئی تھیں تو گھر والے میرے لیے کہا کرتے تھے کہ یہ ہماری سنگر بیٹی ہے۔ یہ بہت اچھا گاتی ہے۔ مگر اللہ کی شان دیکھیں کہ اس نے کہا کہ تو' تو گھر بیٹھ۔ تونے کچھ نہیں کرنا۔ بس تو بچے پال۔"

س "ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں آپ کے۔"

ج "ماشاء اللہ میرے تین بچے ہیں' سب سے بڑی بیٹی ہے اور پھر دو بیٹے ہیں۔ میاں فوج میں تھے' مگر انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا اور کراچی چلے گئے اپنا بزنس کرنے' تو پھر میں ہی تھی اپنے بچوں کے پاس۔ ان کو تربیت دی' زندگی کی ویلیوز سکھائیں' جو اپنے خون میں اچھائیاں تھیں' وہ سب اپنے بچوں میں منتقل کردیں۔ میاں اپنے بزنس میں مصروف رہے اور میں اپنے بچوں میں۔"

س "بیٹے بھی فوج میں گئے؟ اور بچوں کی تربیت تو ماں' باپ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔"

ج "نہیں بیٹے فوج میں نہیں گئے۔ حالانکہ تائے' چاچے' مامے' بابے' سب کوئی جرنیل ہے' کوئی بریگیڈیر ہے' کوئی میجر ہے' کوئی کرنل ہے۔ میری بیٹی بھی جرنیل کی بہو ہے اور میرا داماد بھی میجر ہے اور وہ زمین دار لوگ ہیں' تو تربیت بچوں کی اکیلے ہی کی۔ میاں صاحب کبھی کبھار آتے تھے کراچی سے۔ بچوں میں والد کا خون ضرور شامل ہے۔ مگر تربیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے اور یہ بچوں میں والد کے خون کا ہی اثر ہے کہ وہ انتہائی سچے اور ایمان دار ہیں۔ پیسوں کا لالچ نہیں ہے کہ دوسروں کی تقلید میں اندھے ہو جائیں کہ ہمارے پاس بھی چار بنگلے ہوں۔ بڑی بڑی گاڑیاں ہوں۔ مرسیڈیز ہو۔ یہ ہو وہ ہو۔۔۔ اور میں تمہیں اپنے بیٹوں کے بارے میں بتاؤں کہ میرے بیٹے شیراز ناصر کی اپنی ٹورازم کمپنی ہے جس کا نام "ایڈونچر ٹریول پاکستان" ہے اور ماشاء اللہ' اللہ نے اس کا ہاتھ پکڑا ہے اور وہ بہت ترقی کر رہا ہے۔

اور چھوٹا بیٹا جس کا نام احمد ناصر اس نے فلم میکنگ کی ڈگری لی ہے بی این یو لاہور کالج سے اور پھر اس نے "سماء نیوز" پہ ایک سال کام بھی کیا۔ لیکن کراچی میں اس کا دل نہیں لگا اور وہ واپس کراچی سے لاہور آگیا اور میں خود لاہور کی رہنے والی گزشتہ ایک سال سے کراچی میں رہائش پذیر ہوں۔"

س "اچھا؟ مگر کیوں؟ کراچی کے حالات تو خراب ہی رہتے ہیں۔ ڈر نہیں لگتا گیا؟ جبکہ لاہور میں تو کافی سکون ہے۔"

ج "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ کراچی کے حالات اچھے نہیں ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ میں نے لاہور بالکل چھوڑ دیا ہے۔ میں آتی جاتی رہتی ہوں اور کراچی شفٹ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ میرے اندر کا فنکار جو بہت بے چین رہتا تھا اور اتنی زندگی میں نے اس کے بغیر گزار دی تو ایک فرسٹریشن سی مجھے رہتی تھی اور اندر کا فنکار زندہ ہی رہا آخر ایک دن اٹھ کر کھڑا ہی ہو گا' تب میرے بچوں نے کہا کہ ہماری ماں ہر وقت پریشان رہتی ہے اور کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے بے چین رہتی ہے تو انہیں کام کرنے کی اجازت دے ہی دی جائے اور میری درخواست پر بچوں نے بڑی مجبوری کے ساتھ مجھے اجازت دی اور ساتھ ہی تمہاری والی بات کہ حالات بہت خراب رہتے ہیں کراچی کے' تو آپ اپنا بہت خیال رکھیے گا اور میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ مجھے جانا چاہیے یا نہیں۔ بس میں نے بکنگ کرائی اور اللہ کا نام لے کر کراچی آگئی۔۔۔ اس وقت احمد ناصر (بیٹا) بھی کراچی میں ہی تھا اور ہم دونوں ماں' بیٹا ۔ ایک تین بیڈ روم کے اپارٹمنٹ میں رہتے تھے اور وہ ایک بہت ہی بھیانک تجربہ تھا۔ فلیٹ کے اندر رہنے کا۔ میری صحت بھی خراب ہو گئی۔ ہراس منٹ والا معاملہ تھا۔ لوگ ہمارے پانی کے پائپ کاٹ دیتے تھے۔ کیبل کاٹ دیا جاتا۔ خوامخواہ ہی ہمیں تنگ کیا جاتا تھا کہ لاہور سے آئے ہیں۔ انہیں تنگ کرو' ان سے زیادہ پیسے مانگو۔ لاہور میں تو ہمیں پانی کا کبھی مسئلہ ہی نہیں ہوا تھا۔ یہاں پانی خریدنا پڑتا تھا۔ گیس کا پرابلم' جھوٹ بولتے رہے کہ گیس لگ جائے گی۔ بس کیا بتاؤں۔ بہت پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ میری صحت بھی گر گئی۔ میرا وزن بھی کم ہو گیا۔ مگر ساری

بات تو یہ کہ ایک جنون تھا کام کرنے کا اور شاید میری خواہش پوری کرنے کے لیے اللہ میاں نے میری یہی عمر لکھی تھی کہ اس عمر میں آؤں۔ میں اکثر کہتی ہوں کہ میں بہت دیر میں آئی ہوں۔ تو مجھے یہی جواب ملتا ہے کہ اتنے چینلز ہیں۔ اتنے لوگ ہیں اور آپ ان میں پہچانی جاتی ہیں تو یہ آپ کی کامیابی ہے۔"

س "بالکل ہے اور آپ بہت اچھا کام کرتی ہیں اور ایک سال سے تو آپ کافی کام کررہی ہیں۔ ڈراموں میں کام کرنے سے پہلے بھی تو آپ کچھ کرچکی ہیں؟"

ج "کراچی اس لیے شفٹ ہوئی ہوں کہ یہاں کام بہت ہے۔ لاہور میں اتنا کام نہیں ہے۔ جب لاہور میں تھی تو انٹرویوز کا ایک پروگرام "گولڈن گرلز" کیا تھا۔ وہ ایک بہت ہی اچھا "ٹاک شو" تھا اور ایک تاریخی قسم کا پروگرام تھا۔ وہ پہلا ٹاک شو تھا جس میں تین عورتیں ایک بہت ہی خوب صورت گھر کے خوب صورت ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سیاست دانوں کے انٹرویوز کرتی تھیں۔ ہر ہفتے ایک شخصیت ہوتی تھی اور یہ تین خواتین کچھ ایسے سوالات کرتی تھیں کہ وہ باتیں جو منظر عام پہ نہیں ہوتی تھیں' وہ بھی آجاتی تھیں۔ یعنی سوالات سے ان کو گھیر لیتی تھیں۔۔۔ تو وہ میرا "پہلا شو" تھا اور بہت زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ مگر نہ جانے کیا سیاست ہوئی' کیا کھچڑی پکی کراچی میں' کیا مسائل ہوئے' ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور اچانک ہی پروگرام بند کروا دیا گیا۔۔۔ اور ہم حیران کہ ہمارا تو سیدھا سادہ پروگرام تھا جبکہ "ہم سب امید سے ہیں" اور اسی طرح کے دوسرے پروگرام جس میں سیاست دانوں کے ساتھ کتنا برا کرتے ہیں' ان سے زیادہ تنقیدی پروگرام تو ہمارا نہیں تھا کہ بند کروا دیا جائے۔

کراچی آنے کا ایک مقصد اور بھی تھا کہ میں گانا گانا چاہتی ہوں اور اب آہستہ آہستہ میرا گانا یعنی میری گلوکاری بھی سب کے سامنے آئے گی' وہ میرا اصل فن ہوگا۔"

س "گولڈن گرلز کے بعد آپ نے کیا کیا؟"

ج "گولڈن گرلز کے بعد پھر میں نے پنجابی چینل "اپنا نیوز" میں چار سال کام کیا اور سیاست دان خواتین کے انٹرویوز کیے پنجابی میں ہی کرتی تھی اور یہ پروگرام بھی بہت مقبول ہوا۔ انٹرویو کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے بندہ گپیں مار رہا ہو۔ یعنی ایک بے تکلف انٹرویو ہوتا تھا اور اس کے لیے میں کوئی اسکرپٹ نہیں لکھتی تھی۔۔۔ بس مجھے یہ بتا دیا جاتا تھا کہ اس کا یہ نام ہے اور یہ کام ہے۔ باقی آپ کا کام ہے اور میں اپنا کام بڑی آسانی سے کرلیتی تھی۔"

س "پھر ڈراموں میں آمد کیسے ہوئی؟ کیسے دل چاہا۔"

ج "ڈراموں میں کام کرنے کے لیے کراچی آئی کہ کچھ تو کروں میں' کیمرے کے سامنے جاؤں اور بچپن سے جو شوق ہے اداکاری کرنے کا' اس کو پورا کروں۔ چنانچہ "ڈولی کی آئے گی بارات" سیزن میں "تانے کی آئے گی بارات" میں' میں نے "تانے" کی ماں کا رول ادا کیا اور بشریٰ نے خاص طور پر میرے لیے رول لکھا۔ "نو چھی" کا اور اس رول کو کرکے مجھے ایسا لگا کہ لوگ ہم دونوں بہنوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو بس پھر وہاں سے اداکاری کا اسٹارٹ ہوا۔"

س "میری بہن میری دیورانی" میں آپ کے جملے بڑے بے ساختہ ہوتے رہیں' تو کیا یہ اسکرپٹ کا حصہ ہوتے ہیں جن کو آپ مہارت سے ادا کرتی ہیں؟"

ج "یقین کرو کہ یہ بے ساختہ جملے اسکرپٹ کا حصہ نہیں ہوتے' بلکہ میرے اپنے ہوتے ہیں اور آپ "عامر خٹک" کا نام ضرور لکھئے گا۔ یہ ڈائریکٹر ہیں اور یہ سب کو کہہ دیتے ہیں کہ سنبل آپا جب کیمرے کے سامنے آئیں تو اسکرپٹ کے علاوہ جو یہ بولیں ان کو بولنے دینا۔ ان کو روکنا مت۔ اسکرپٹ میں تو تین لائنیں ہوتی ہیں' اس کے بعد تو میری اپنی باتیں شروع ہوجاتی ہیں۔ تو سنگیتا بہت ہنستی ہیں اور شہریار زیدی (بیونور کے میاں) بہت انجوائے کرتے ہیں اور بڑے مزے سے کہتے ہیں۔ "اس کو باندھو مت۔ اس کو کھلا چھوڑ دو۔ یہ خود بک بک کرتی جائے گی اور جب میں

بولتی ہوں تو سارے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے ہوتے ہیں۔"

س "تانے کی آئے گی بارات' میں پرفارم کرنے کے لیے آپ لاہور سے کراچی آئی تھیں کیا؟"

ج "ہاں جی۔ تانے کی آئے گی بارات' کے لیے میں لاہور آئی تھی اور پھر میری بہن میری دیورانی کے لیے بھی میں لاہور سے آئی تھی۔ تو ہمارے بہت ہی پیارے ایکٹر نعمان مسعود کی مسز "سبرین مسعود" اے آر وائی کی سینئر پروڈیوسر ہے' وہ میری چھوٹی بہنوں اور بیٹی کی طرح ہے۔ اس نے مجھے کہا کہ ہمارے سوپ "میری بہن میری دیورانی" میں آپ نے کام کرنا ہے تو میں نے کہا کہ اس کے لیے تو مجھے لاہور سے آنا پڑے گا تو سبرین مسعود نے کہا کہ آپا! آپ سامان باندھیں اور کراچی آئیں' بلکہ کراچی میں شفٹ ہوجائیں' میں تو پہلے ہی کراچی آنا چاہتی تھی' مگر میرے پاس کام نہیں تھا اور جب مجھے کام ملا تو پھر میں نے دیر نہیں لگائی اور کراچی آئی تو پھر تو چل سو چل' اللہ کا کرم ہوگیا۔"

س "انڈر پروڈکشن کیا کام ہے آپ کا؟ اور آپ اپنے ڈرامے دیکھتی ہیں۔"

ج "داغ" آپ دیکھ رہی ہوں گی۔ "پرچھائیاں" انڈر پروڈکشن ہے۔ کچھ "ہم" کے لیے کر رہی ہوں۔ کافی سارے کام ہو رہے ہیں۔ میری بہن میری دیورانی کو مزید ایک سال کے لیے بڑھا دیا ہے' کیونکہ لوگ اسے کافی پسند کر رہے ہیں اور میں اپنے ڈرامے بہت کم دیکھتی ہوں اور اس کی دو وجوہات ہیں' ایک تو مجھے پتا نہیں' ہوتا دوسری وجہ یہ کہ میں اپنے ڈرامے دیکھتے ہوئے گھبراتی ہوں کہ کہیں میں نے برا کام نہ کیا ہو۔ اس لیے میں کہتی ہوں کہ کوئی نہ ہی دیکھے میرا ڈرامہ' چپ کرکے گزر جائے تو اچھا ہے اور میں خود سے کسی کو بتاتی بھی نہیں ہوں کہ میرا فلاں ڈرامہ آرہا ہے' آپ ضرور دیکھیں۔"

س "آپ اپنے کرداروں میں کوئی چینج لائیں گی یا اسی قسم کے رول کریں گی' جیسے کہ آج کل کررہی ہیں۔"

ج "میں گھر میں بھی ایسے ہی ہنستی رہتی ہوں' کھلی طبیعت کی ہوں' جبکہ بشریٰ گھر میں اتنا زیادہ نہیں ہنستی' جبکہ میرا مزاج کچھ ایسا ہے کہ میں چھوٹی سی بات پر بھی خوش ہوجاتی ہوں' تو میری نیچر چونکہ ایسی ہے تو میرا امپریشن بھی کچھ ایسا ہی لوگوں پر پڑا کہ شاید میں فنی (مزاحیہ) قسم کے رول ہی کرسکتی ہوں' تو جہاں کہیں ماں کا رول ہو' پھوپھو کا رول ہو' جہاں مسالے لگانے کا رول ہو تو بس جی سنبل آپا کو لے لیتے ہیں تو کیا کروں کہ اس قسم کے رول مل جاتے ہیں اور عامر خٹک جو ہمارے ڈائریکٹر ہیں۔ وہ مجھ سے اکثر کہتے ہیں کہ آپ کے اندر میں ایک سنجیدگی دیکھتا ہوں اور آپ سنجیدہ رول بھی بہت اچھے کرسکتی ہیں اور میں خود بھی چاہتی ہوں کہ میں تھوڑے سنجیدہ رول بھی کروں۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے پی ٹی وی کا ایک ڈرامہ کیا تھا اور اس میں دکھایا گیا تھا کہ میرا نواسا کہیں گم گیا ہے اور جب وہ میرے پاس تھا تو میں اس کے ساتھ بہت لاپروائی سے پیش آتی تھی' لیکن جب وہ گم ہوجاتا ہے تب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میری کتنی پیاری چیز گم ہوگئی ہے تو اس کے ملنے کا سین مجھے کرنا تھا' تو ڈائریکٹر نے کہا کہ سنبل آپا! آپ گلیسرین لگالیں' تاکہ رونے کا سین صحیح طرح ہوجائے' تو میں نے کہا کہ اتنے چھوٹے سے سین کے لیے گلیسرین لگانے کی ضرورت نہیں ہے' میں کرلوں گی' تو وہ ایک جذباتی سین تھا اور جب میں اپنے نواسے کے ملنے پر اسے گلے لگاتی ہوں تو میں سچ مچ رو پڑتی ہوں۔ تو سب حیران رہ گئے کہ سنبل آپا تو سچ مچ رو پڑی ہیں' اور بہت تعریف ہوئی میری۔"

س "آپ ماشاء اللہ بڑے گھر میں رہتی ہیں' لیکن ایک آرٹسٹ ہونے کی وجہ سے کبھی غریبوں کے محلے میں جاکر یا ان کے گھروں میں جاکر ریکارڈنگ کروائی۔"

ج "بالکل اتفاق ہوا ہے۔ ایک ڈرامہ ہم نے کیا ہے' مگر نام یاد نہیں۔ اس میں ہمیں کراچی کے ایک محلے

میں جانے کا اتفاق ہوا' جہاں ساتھ ساتھ گھر تھے اور محلہ اور گلی بہت ہی گندی اور غلیظ سی تھی' تو میں کہتی ہوں کہ انسان کہیں بھی رہے اپنا محلہ' اپنی گلی اور اپنا گھر تو صاف ستھرا رکھے' تو جس گھر میں گئی' وہاں کے بستر کی چادر اتنی میلی تھی کہ بیان سے باہر ہے اور مجھے اس پر لیٹنا تھا تو مجھے تو صفائی کا جنون ہے اور میں کہتی ہوں کہ بھلے آپ کے پاس ایک چادر ہو' مگر صاف ستھری ہو' تو جب میں ریکارڈنگ کروانے لگی تو یہ بات میں نے ضرور کہی کہ کم سے کم صفائی تو کروا لیتے' اس میں تو کچھ پیسے نہیں لگتے۔ خیر' میں نے کروالیا وہ سین۔ بس ان لوگوں سے میری اتنی درخواست ہے کہ کم سے کم صفائی کا خیال ضرور رکھیں۔"

س "بشریٰ انصاری بہت اچھا لکھتی ہیں۔ آپ کو لکھنے کا شوق نہیں ہے کیا۔"

ج "لکھنے کا شوق ہے' مگر میری رائٹنگ بہت بری ہے۔ نقطے لگانا بھول جاتی ہوں۔ بشریٰ کہتی ہے کہ اگر تم نے لکھنا شروع کیا تو لفظوں کا کیا بنے گا۔ خیر یہ تو ایک مذاق کی بات ہے' لیکن میری بڑی بہن نیلم احمد بشیر جو ماشاء اللہ مشہور رائٹر ہیں اور جن کی سات کتابیں چھپ چکی ہیں' ان میں تین کتابوں کی کہانیاں میں نے ان کو دی ہیں اور میری ان کہانیوں کو انہوں نے اپنے قلم سے اور خوب صورت بنا دیا ہے۔ چونکہ لاہور میں' میں بہت سوشل تھی اور ہر طرح کے لوگوں میں میرا اٹھنا بیٹھنا تھا تو کافی ساری کہانیاں میرے مشاہدے میں رہتی تھیں جو کہ میں نیلم کو بتا دیتی تھی۔ تو نیلم آپا اسے اپنے حساب سے لکھ لیتی تھیں۔ اب چونکہ میں شوبز میں آ گئی ہوں تو میں نے ایک ڈائریکٹر کو ایک کہانی کا آئیڈیا دیا ہے اور ان شاء اللہ وہ اب اس پر کام کریں گے۔"

س "آپ کو جب کسی ڈرامے کی آفر آتی ہے تو اسکرپٹ دیکھتی ہیں' ڈائریکٹر دیکھتی ہیں یا پروڈیوسر کو؟ اور کبھی کمرشلز کیے۔"

ج "کچھ نہیں دیکھتی۔ اس لیے کہ میں کام کرنے آئی ہوں۔ اگر اس چکر میں پڑ جاؤں گی تو پھر کچھ نہیں کر پاؤں گی اور مجھے کام کرنا ہے' کیونکہ گھر میں بیٹھ کر فضول وقت نہیں گزارنا مجھے اور کمرشل میں نے تین سال پہلے کیا تھا چائے کی ایک کمپنی کا۔"

س "مزاج کی تو آپ کافی اچھی ہیں' بچپن سے ہی ایسی ہنس مکھ طبیعت کی مالک ہیں۔"

ج "بس ایسا ہی مزاج ہے جیسا تم دیکھ رہی ہو۔ میں ہمیشہ سے ہی ایسی ہوں مجھے نیگیٹو باتیں کرنا پسند نہیں ہے اور ادھر کی ادھر کرنا بھی پسند نہیں۔ جس باپ کی ہم اولاد ہیں' ہمارے خون میں ہی نہیں ہے کہ ہم کسی کے بارے میں کوئی غلط بات کریں یا کسی کے لیے کوئی نقصان دہ بات کریں۔"

س "بچے ماشاء اللہ بڑے ہیں۔ بہوؤں کے آنے کا وقت بھی ہے' مگر جب تک یہ ذمہ داری نہیں ہے تو کیا گھرداری خود ہی کرتی ہیں۔"

ج "مجھے گھرداری سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ میں جب سے لاہور آئی ہوں تو بس یہی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے بیٹوں کے لیے کچھ نہ کچھ بناتی رہوں' ان کو کھلاتی پلاتی رہوں۔"

س "فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

ج "ٹی وی دیکھنا مجھے بہت پسند ہے مگر میں اسٹار پلس نہیں دیکھتی چونکہ میں میوزک کی دلدادہ ہوں تو میں کلر چینل دیکھتی ہوں اور میوزک چینل بہت دیکھتی ہوں"

س "کلر چینل دیکھتی ہیں تو یہ بھی تو انڈیا کا چینل ہے' جبکہ ہمارے اپنے چینلز کے پروگرام بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

ج "بس ایک دو ڈرامے مجھے کلر ٹی وی کے اچھے لگتے ہیں تو دیکھ لیتی ہوں' ورنہ تو میں اپنے ہی ڈرامے دیکھتی ہوں جو کہ میں سمجھتی ہوں کہ بہت ہی اچھے ہوتے ہیں۔"

اور اس جواب کے ساتھ ہی ہم نے سنبل شاہد سے اجازت چاہی' اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔



مدیحہ رنگیلے اور یہاں پیار نہیں ہے
کے فنکار، گلوکار

جنید خان نیازی سے باتیں

شاہین رشید

1 اصلی نام؟
جنید خان نیازی۔

2 پیار کا نام؟
میرے خیال میں دنیا میں جتنے بھی جنید ہیں' سب کو جونی کہہ کر ہی بلاتے ہیں۔

3 تاریخ پیدائش / شہر؟
2 نومبر 1981ء / ملتان۔

4 اسٹار / قد؟
اسکارپیو / 5 فٹ 11 انچ

5 تعلیمی قابلیت؟
ایم بی اے۔

6 بہن بھائی اور آپ کا نمبر؟
ایک بڑے بھائی' ایک بڑی بہن اور ایک چھوٹی بہن تو میں ہوا تیسرے نمبر کا۔

7 شادی؟
جی بالکل دو سال ہو گئے شادی کو۔

8 پہلا پروگرام؟/ وجہ شہرت؟
پہلا ڈراما سیریل دل کی لگی تھا جو کہ اے ٹی وی سے ہوا تھا اور یہی وجہ شہرت بھی کہہ لیں۔

9 میوزک سے وابستگی؟
2003ء سے ہے اور پہلا پروگرام 2004ء میں لاہور میں ہوا تھا۔

10 کسی بڑے ایوارڈ کے لیے نامزدگی؟
بالکل ہوئی۔ لکس ایوارڈ کے لیے بہترین اداکار کے لیے نامزد ہوا۔ لیکن ایوارڈ نہیں ملا۔

11 شوبز میں آمد؟
میوزک کے ذریعے ہی ہوئی اور پہلا گانا انٹرنیٹ پہ ریلیز کیا تھا۔

12 پہلی کمائی / کیا کیا؟
پہلی کمائی میوزک کنسرٹ سے کی تھی اور گھر والوں کے ساتھ کھانے پر گیا تھا اب یہ یاد نہیں کہ کتنی تھی۔

13 سال کے کس دن کا بے چینی سے انتظار ہوتا ہے؟
کسی ایک دن کو میں اہمیت نہیں دیتا' ہر دن میرے لیے اہم ہوتا ہے۔ پھر بھی عید کا دن اہم ہے میرے لیے۔

14 کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟
شغل میں تو دکھاتا ہی رہتا ہوں اپنے دوستوں کے ساتھ مگر یقین نہیں کرتا۔

15 پاکستان کے کس شہر میں گھر بنانے کی خواہش ہے؟

لاہور میں ہی میری رہائش ہے اور لاہور میں ہی گھر بنانا چاہوں گا۔

16 کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟

میں نے تقریباً" آدھی دنیا دیکھی ہے۔ گھومنے کے لیے سب بہت اچھے ہیں۔ لیکن رہنے کے لیے پاکستان سے بہتر کوئی نہیں۔

17 کوئی تحفہ جسے پاکر بہت خوشی ہوئی ہو؟

جب لوگ میرے کام کو سراہتے ہیں تو میرے لیے یہ کسی تحفے سے کم نہیں ہوتا۔ پھر ماں باپ کا پیار۔

18 انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟

بالکل ہے..... بلکہ بہت ہے کیونکہ فینز کے ساتھ کمیونکیشن رہتا ہے میں ان سے باتیں بھی کرتا ہوں اور ان کے سوالوں کے جواب بھی دیتا ہوں۔

19 کس میں زیادہ کام کرنا ہے 'میوزک میں یا اداکاری میں؟

کوشش تو یہی ہوگی کہ دونوں میں کام کروں۔

20 میوزک میں کوئی نیا کام؟

جی اپنا ایک نیا گانا "کہہ دو" کے نام سے ریلیز کرنے لگا ہوں اور یہ اپنے پیاروں سے ایکسپریس کرنے والا گانا ہے کہ جب موقع ملے اظہار کردینا چاہیے۔

21 سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

سکون، ٹھہراؤ..... دنیا ایک طرف ہے 'سمندر ایک طرف ہے۔

22 مطالعہ ضروری ہے یا وقت گزاری ہے؟

بہت ضروری ہے۔ بہت کام آتا ہے۔ نالج میں اضافہ ہوتا ہے۔

23 پاکستانی معاشرے کی کوئی اچھی بات؟

ہمارے یہاں ابھی بھی فیملی ویلیوز کا خیال رکھا جاتا ہے۔

24 خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟

بہت بزدل ہوتا ہے۔ جو ہاتھ اٹھاتا ہے جو بندوق اٹھاتا ہے' وہ بھی بہت بزدل ہوتا ہے۔

25 آپ کی شخصیت کی طاقت؟

کہ میں اپنے اعصاب پر کنٹرول کرتا ہوں۔ غصے پہ قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں۔

26 شخصیت کی کمزوری؟

بہت رحم دل ہوں' جو کہ کبھی کبھی نقصان کا باعث بنتی ہے۔

27 میک اپ کی اہمیت آپ کی نظر میں؟

عورتوں کے لیے بہت ضروری ہے اور میک اپ کو میں ایک آرٹ کی طرح سمجھتا ہوں کیونکہ میک اپ کے ذریعے شخصیت کو بدلا جاسکتا ہے۔

28 کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟

میرا خیال ہے کہ تکبر والا رویہ۔

29 بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟

دوستوں کے ساتھ کھانے پینے کے لیے چلا جاتا ہوں یا گھر بیٹھ کر فلم دیکھ لیتا ہوں۔

30 کس کی یاد تنہائی میں سکون دیتی ہے؟

میں کوشش کرتا ہوں کہ تنہائی نہ ملے اور میں مصروف ہی رہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ فیملی دوست احباب سب ساتھ ہیں۔

31 معاشرے میں رائج رسموں میں کون سی رسم بہت پسند ہے؟

مہندی..... ہمارے کلچر کا بھی حصہ بن چکی ہے۔

32 کوئی تاریخی شخصیت جس سے ملنے کی خواہش ہو؟

نہیں! کوئی نہیں' کیونکہ میں کسی ایک شخصیت کو آئیڈیلائز کرنے پر یقین نہیں رکھتا۔ سوائے آنحضرت ﷺ کے۔ باقی تو سب میں کچھ کچھ اچھی باتیں ہوتی ہیں کچھ نگیٹو بھی ہوتی ہیں۔

33 کبھی ہجوم میں اکیلا پن محسوس ہوا؟

میں عموماً" ہجوم میں جاتا ہی نہیں ہوں۔

34 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟

گھر والوں سے ملوں اور ایکسرسائز کے لیے جاؤں۔

35 گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟

ماں کے کمرے میں ماں کے پاس۔

36 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟

کافی بری ہوتی ہے۔ لیکن آج کل تو ڈائیٹ پر چل رہا ہوں۔

37 کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاتے ہیں؟

امی کے ہاتھ کا ویسے آج کل کک کی خدمات حاصل کی ہوئی ہیں۔

38 کیا ناشتا شوق سے کرتے ہیں؟

جی بالکل شوق سے کرتا ہوں اور ناشتا اچھا ہونا چاہیے۔ کیونکہ ناشتا آپ کو سارا دن فریش رکھتا ہے۔

39 اپنے مسائل کس سے شیئر کرتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ سے۔

40 کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟

میری نیند کچی ہے اگر اٹھ بھی جاؤں تو دوبارہ آسانی سے سو جاتا ہوں۔

41 آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟

آئینے کو کافی وقت دینا پڑتا ہے۔ کیونکہ لوگ آپ کو نوٹ کرتے ہیں۔

42 کیا آپ اپنی مرضی کی زندگی گزار رہے ہیں؟

جی اللہ کا شکر ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ میں اپنی مرضی سے جی رہا ہوں۔

43 زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟

فیملی کے لیے 'لیکن کوشش کرتا ہوں کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ دوں۔

44 جب پہلی مرتبہ نیا قلم استعمال کرتے ہیں تو کیا لکھتے ہیں؟

آج کل قلم کا استعمال بہت کم ہوگیا ہے۔ آج کل تو کمپیوٹر پہ ہاتھ زیادہ چلتا ہے۔

45 کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟

نہیں! کبھی نہیں۔ کیونکہ کھانے پینے کا تعلق غصے سے نہیں ہے۔

46 دل کب ٹوٹتا ہے؟

دل تب ٹوٹتا ہے جب انسان کا بھروسا ٹوٹتا ہے۔

47 کون سی بات جذباتی کردیتی ہے؟

فیملی کی اور والدین کی ناراضی۔

48 موڈ کب خراب ہوتا ہے؟

کوئی غرور سے بات کرے یا کسی کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو۔

49 کیا آپ اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتے ہیں؟

جی جی بالکل۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو پہلے خود اپنی غلطیوں پر نظر رکھنی چاہیے اور اعتراف کرنا چاہیے۔

50 آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟

میرے خیال سے' جو شہرت ہے اور آپ کے فین جس طرح سے آپ کی تعریف کرتے ہیں اس سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہم دیگر لوگوں سے تھوڑے مختلف ہیں۔

51 کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟

والٹ اور موبائل فون۔

52 تنہائی میں کس سے ہم کلام ہوتے ہیں؟

اپنے آپ سے اور خدا سے۔ انسان کو اپنے آپ سے ہم کلام ضرور ہونا چاہیے۔

53 اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کرچکے ہیں؟

ابھی تک تو نہیں کیا کیونکہ لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ فیس بک پہ لوگوں سے رابطہ رہے تاکہ کسی کو فون کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

54 سفر کے لیے بہترین سواری؟

کوئی لمبا سفر ہے تو پھر ہوائی جہاز اور چھوٹا ہے تو کار پہ۔ لانگ ڈرائیو تو بالکل بھی پسند نہیں ہے۔

55 کن چیزوں پر بہت خرچ کرتے ہیں؟

کھانے پینے کی چیزوں پر۔

56 ایک کردار جو کرنا چاہتے ہیں؟

پوزیٹو قسم کے اور ہر طرح کے کردار اور ایسے کردار جس میں لوگوں کو Awareness (آگہی) دی جائے۔

57 دھوکا اپنے دیتے ہیں یا پرائے دیتے ہیں؟

کوئی بھی دے سکتا ہے۔ رشتوں سے پہلے انسان ہوتا ہے اور اس کے جذبات پہلے ہوتے ہیں۔ تو اپنے بھی دے سکتے ہیں اور پرائے بھی۔

اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟

شہرت ملی ہے تو زوال بھی آئے گا..... اس لیے نہ پریشان ہوتا ہوں اور نہ ہی سر پر سوار کرتا ہوں۔

☆

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بدر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ



WWW.PAKSOCIETY.COM

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ، ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے، سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے۔ سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا، وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔

ماہ نور، سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

فلزا ظہور، سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور، فاطمہ اور خدیجہ کو فلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

نویں قسط

"تمہیں نہیں لگتا کہ پچھلے کچھ سالوں کے دوران تم خاصی ڈل زندگی گزار رہے ہو، کیا تمہیں بوریت محسوس نہیں ہوتی؟" کسی دوست کی کہی یہ بات بلال سلطان کو اس رات سونے سے پہلے یاد آئی تھی۔ وہ سارا دن بہت مصروف گزرا تھا۔ اس صبح ہی کو وہ دو بزنس میٹنگز کے لیے کراچی پہنچے تھے۔ بزنس میٹنگز گویا زندگی کے معمولات کا حصہ بن گئی تھیں اور اب تو کسی بھی ایسی میٹنگ میں شریک ہونے سے پہلے ہی انہیں اس کے منٹس (چھوٹے مگر اہم نکات) کا علم ہوتا تھا۔ جن وفود اور افراد سے ان کی ملاقات ہونے والی ہوتی تھی۔ ان کے بارے میں ان کا سیکریٹری انہیں کوئی بریفنگ نہ بھی دیتا تو بھی انہیں معلوم ہوتا تھا کہ متوقع ملاقاتیوں کے مزاج، تیکنکی خوبیاں اور خامیاں کیا ہوسکتی تھیں۔ ایسی میٹنگز میں اب ان کا کوئی ایک لمحہ بھی ضائع ہونے نہ پاتا تھا۔ انہوں نے دن بھر کی مصروفیت کو یاد کیا اور اپنے دوست کی بات یاد آجانے پر خود اپنے آپ سے ایک سوال کیا۔

"کیا تمہیں اپنی زندگی ڈل لگتی ہے بلال سلطان! اور تمہیں بوریت محسوس ہوتی ہے؟"

"میں نے کبھی خود کو اتنا فارغ رہنے ہی نہیں دیا کہ بور، بورنگ اور بوریت جیسے احساسات سے میرا سامنا ہوپائے۔" انہوں نے خود کو ایک ایسا جواب دیا، جس کے بارے میں انہیں کوئی مغالطہ نہیں تھا۔

"لیکن کیا یہ ایک فطری زندگی ہے، کیا اس میں بہت کچھ ایسا نہیں ہے۔ جو غیر فطری سا لگتا ہے؟" ایک اور سوال ذہن میں آیا۔

"ہوں۔" انہوں نے اپنے ذہن کو اپنے دل میں اس سوال پر دادا دی۔

"میری زندگی میں یقیناً "ایک شدید قسم کی کمی ہے۔" وہ زیر لب مسکرائے۔ "میری جیبیں، میرے اکاؤنٹس اور میرا دماغ اپنی ضروریات پوری کرنے کی خاطر خالی کردینے والی ایک گھر والی کی کمی۔"

"ہاہاہا۔" اپنے اس خیال پر انہوں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"بیش قیمت ملبوسات، ہیرے جواہرات، سونا اور پلاٹینم، برانڈڈ جوتے، پرفیومز اور بیگز، قیمتی میک اپ، ہوم ڈیکور کو سیزن کے سیزن بدلنے والی، بیوٹی سیلونز اور جمز میں جاکر اپنے فگر اور شکل کو نئے نئے روپ دے کر خود اپنے دل کی تسلی کرنے والی ایک خاتون۔ جو مجھے اپنی انگلی کے اشارے پر چلانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔"

انہیں اپنے بہت سے دوستوں کی گھر والیاں یاد آگئیں، جو اپنے تئیں اپنے شوہروں کی زندگیوں میں بہت اہم حیثیت رکھتی تھیں اور جن کے شوہر انہیں اپنی زندگیوں کے بہت سے شعبوں میں مسز کے طور پر متعارف کروانے اور استعمال کرنے کے باوجود اپنی تنہائیوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے خود اپنے بنائے چور دروازوں سے کسی اور چاردیواری میں داخل ہوکر ڈل اور بور زندگی کی خلش مٹانے کا سامان کیا کرتے تھے۔

وہ خود بہت سی ایسی محفلوں میں شریک ہوتے رہتے تھے، جہاں ان کے حلقہ احباب کے لوگ بغلوں میں ایسے چہرے دبائے موجود ہوتے، جو ان کے گھروں میں موجود بیگم صاحباؤں سے مختلف ہوتے۔ کبھی وہ چہرے گرل فرینڈز کے، کبھی ون نائٹ اسٹینڈرڈ (ایک رات کی ساتھی) کبھی فل ٹائم مسٹریسز (ہمہ وقت داشتاؤں) اور کبھی پرسنل سیکریٹریز کے ہوتے تھے۔ وہ انسانوں کی ان دوغلی زندگیوں کو دیکھنے اور ایک نظر میں یہ جانچ لینے کے بھی عادی ہوچکے تھے کہ ان کے کسی دوست کے بازو کے گھیرے میں موجود حسینہ کا اس کی زندگی میں کیا اسٹیٹس (مقام) ہوسکتا تھا اور اس حسینہ کا متوقع ساتھ کتنے لمحوں، گھنٹوں، دنوں، مہینوں یا سالوں پر مشتمل ہونے کی توقع کی جاسکتی تھی۔

"کیا میں بہت شاطر ہوں جو جان جاتا ہوں؟" انہوں نے خود سے ایک اور سوال کیا۔

"ہوسکتا ہے۔" ان کے دل نے جواب دیا۔ "کیونکہ ایسے مناظر اب تک تو از بر ہوچکے ہیں۔"

"مگر وہ گھر سے رخصتی کے وقت محبت سے کوٹ پہنانے والی، ناشتے کھانے کا خیال رکھنے والی، شوگر، بلڈ پریشر چیک رکھنے والی، گھر کے ملازموں پر نظر رکھنے والی، گھر میں موجود سامان کا حساب رکھنے والی، کہاں کچھ کم ہوا، کیا ٹوٹا،

کیا غائب ہوا کیا مرمت طلب ہے اور کس کو بدل لینا چاہیے‘ لانڈری میں کتنے کپڑے گئے تھے‘ کتنے واپس آئے‘ کچن بجٹ میں کیا اتار چڑھاؤ آرہا ہے‘ صاحب کس ملک جارہے ہیں‘ اس ملک کے موسم کے حساب سے ان کا سفری بیگ کیسے تیار کرنا ہے‘ بیڈ روم کا ڈیکور کیسا ہونا چاہیے‘ ایسا جہاں داخل ہو کر صاحب باہر کے مسائل بھول جائیں اور ان کے دل میں ایک سکون سا اتر جائے۔ وہ عورت کہاں ہے۔“

انہوں نے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں اپنے لیے مخصوص کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچا۔ باہر اندھیرے میں روشنیوں کی جگمگاہٹ تھی اور سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی۔

”اسے ہم اپنے سے نیچے والے درجے میں چھوڑ آئے شاید۔“ ان کے دل نے جواب دیا۔

”مڈل کلاس میں؟“ ذہن نے سوال کیا۔

”شاید وہ عورت اب مڈل کلاس میں بھی نہ موجود ہو۔“ دل نے جواب دیا۔ ”مڈل کلاس کی عورت اب اور‘ اور‘ اور زیادہ پڑھنے لکھنے میں مشغول ہے۔ بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے جیسی ڈگری کے حامل مڈل کلاس مرد سے شادی کر لیتی ہے اور پھر اس کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے گھر‘ شوہر اور بچے کی خاطر کمائیاں کرنے نکل جاتی ہے۔ اسے اپنی ڈگریز کو استعمال میں لانا ہے۔ اتنی محنت سے حاصل کی گئی ڈگریاں ’اتنا پیسہ‘ لگا کر حاصل کی گئی ڈگریاں‘ بیس لاکھ‘ تیس‘ چالیس لاکھ لگا کر حاصل کی گئی ڈگری کو کیش بھی تو کرانا ہے۔ لاکھوں کے بدلے کروڑوں بھی تو کمانے ہیں اور پھر زندگی میں تعیشات کا داخلہ بھی فری ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے ٹاؤنز اور ہاؤسنگ اسکیمز میں ملنے والے پلاٹ اور بنگلے اپنی چھب دکھلاتے ہیں۔ ڈاؤن پے منٹ کے بعد قسطیں بھی ادا کرنی ہے۔ گھر میں ڈیزائنر فرنیچر ڈالنا ہے‘ کچن اسیسریز کی رینج اتنی وسیع ہے اس کا کھاتہ بھی پورا کرنا ہے۔ بیڈ شیٹس‘ بیڈ کورز‘ میٹس اور رنرز‘ دیواروں کے پینٹ اور فرش کے ٹائلز سے میچ کرنی ہیں اور ڈیکوریشن پیسز ان کے بغیر تو گھر کی سجاوٹ ہی ناممکن ہے۔“

اپنی اور شوہر کی تنخواہ کے زعم میں قسطوں پر ملنے والی تیرہ سو سی سی گاڑی بھی بک کروانی ہے۔ قسطیں‘ قسطیں‘ قسطیں‘ کیلکولیٹر پر مہینے بھر کے اخراجات کا حساب کرتے انگلیاں تھکاتی عورت‘ جسے کیریر ویمن ہونے کی وجہ سے اپنے لباس اور جوتوں‘ بیگز‘ دھوپ کے چشموں اور میک اپ کی مد میں بھی خرچ کرنا ہے اور بچوں کو بھی انٹر نیشنل چین اسکولز میں پڑھانا ہے۔ مہینے کی فیس کے علاوہ جہاں سے کلر ڈے‘ گیٹ ٹو گیدرز‘ ون ڈش اور اسٹڈی ٹرپس کی مد میں بھی اخراجات کے لیے چٹھیاں آتی ہی رہتی ہیں۔

اور اس سب کا نتیجہ‘ تھکی تھکائی مڈل کلاس عورت ہائی کلاس اور اپنے درمیان کا خلا عبور کرنے کے لیے ہائی جمپس لگا لگا کر اپنا ہاتھ ہائی کلاس کے بیریر پر جمانے کی کوششیں کرنے کے بعد جب تھکی ہاری گھر پہنچتی ہے تو کہاں کا کچن اور کیسے گرما گرم تازہ کھانے‘ فریزر میں رکھے منجمد کھانوں کے ڈبے نکال کر مائیکرو ویو اوون میں رکھ کر گرم کرتی ہے۔ اگر ماسی میسر ہے تو چپاتیاں ڈلوائیں‘ ورنہ کبھی مارے باندھے خود چپاتیاں ڈالیں۔ کبھی شوہر سے کہہ کر روٹیاں یا نان منگوا کر کھانا‘ ڈائننگ ٹیبل پر پہنچتی‘ بچوں کی ہوم ورک ڈائری دیکھ کر الرٹ ہوتی‘ ان کو ہوم ورک کراتے کبھی اونگھتی‘ کبھی آنے والی کل کی تیاری کے لیے چونکتی بے چاری عورت۔

اسے کہاں یاد رہتا ہے کہ صبح خود اپنی اور بچوں کی تیاری میں شوہر کو کوٹ بھی پہنانا ہے‘ اس کے جوتے بھی پالش کرنے ہیں‘ اس کو محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ رخصت کرتے ہوئے ”آج جلدی گھر آیئے گا۔“ جیسا جملہ بھی بولنا ہے۔ اس کے حواسوں سے ”بریڈ ہے یا نہیں‘ جیم تو ختم نہیں ہو گیا‘ فریج میں کتنے انڈے باقی ہیں اور پیاز لال تھی‘ دودھ والے کا بل‘ کسی بچے کی نوٹ بک‘ موبائل فون کا کریڈٹ“ جیسے مسائل ہٹیں تو بے چارے شوہر کا خیال بھی ذہن میں در آئے۔

”اوہ!“ بلال سلطان نے جھرجھری سی لی اور کمرے میں ٹہلتے ہوئے سامنے کی دیوار پر سجی پینٹنگ کے قریب رک کر اسے غور سے دیکھنے لگے۔

”طبقہ سوم کی عورت۔“ پینٹنگ میں خوب صورت رنگوں کے امتزاج سے ایک علامتی ہیولہ سا بنا تھا۔ اسے سمجھنے کے لیے ذہن پر زور دینے کے تردد سے بچتے ہوئے انہوں نے اپنی سوچ کا دائرہ ایک اور سمت مرکوز کر دیا۔

جو اگر سگھڑ ہے تو کسی دکان دار‘ کلرک‘ چپڑاسی‘ دیہاڑی دار مزدور‘ مستری‘ مکینک‘ ترکھان یا دودھ دہی والے کی بیوی ہونے کے باوجود چھوٹی چھوٹی بچتوں اور بڑے بڑے سلیقوں سے گھر کا نظام توازن میں رکھ سکتی ہے‘ مگر آج کے دور میں وہ بھی کیا کرے۔ اس کی زندگی میں موبائل فون اور ٹی وی داخل ہو گئے ہیں۔ شوہر کو کام پر اور بچوں کو اسکول بھیج کر اسے باری باری سب رشتہ داروں کی خیر خیریت موبائل فون کے ذریعہ دریافت کرنی ہے۔ کس کے گھر میں کس بات پر جھگڑا ہوا‘ کس گھر کے مرد نے باہر سے روپے بھیجے‘ کس کی کمیٹی نکلی‘ کون بیمار ہوا‘ کون شادی پر گیا‘ کس نے کیا پکایا۔

مہنگائی کا رونا تو بہت ضروری ہے‘ پھر بھی اس نے ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے میں ملنے والے کئی ڈیکوریشن پیسز خرید لیے ہیں۔ منے کے ابا سے نظر بچا کر لان یا کاٹن کا نیا جوڑا بھی خرید لیا ہے۔ لیسوں اور فیتوں کی دکان پر دو گھنٹے لگا کر پانچ سو روپے میٹر میں بکنے والی لیس ڈھائی سو میں خریدنے کا کارنامہ بھی سرانجام دے لیا ہے۔ آمدنی کم ہے تو کیا ہوا۔ بچے بہترین انگریزی اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ آخر عمر بھر کی کمائی بچے ہی تو ہوں گے۔ ان ہی کے لیے تو منے کے ابا دن بھر کھپائی کرتے ہیں۔ دو ڈھائی گھنٹے خیر خیریت دریافت کرنے میں گزارنے کے بعد اسے گھر سمیٹنے اور بکھرے برتن دھونے کا خیال آتا ہے۔ اگر وہ ساس سسر‘ دیور‘ نندوں کے ساتھ رہتی ہے تو پھر تو بڑبڑاہٹ اس کا حق ہے۔ ایک اس کی جان ہے اور ہزاروں جھنجھٹ ہیں۔

رات بھی وہ دو ڈرامے مس کر گئی تھی۔ اب دوبارہ ٹیلی کاسٹ ہوں گے۔ اس سے پہلے اسے باقی کام نپٹانے ہیں۔ مارننگ شوز تو چھوڑے جا ہی نہیں سکتے۔ وہاں آنے والی لڑکیوں کے لباس دیکھ کر ہی تو اپنے کپڑے ڈیزائن کرنے ہیں۔ مارے باندھے‘ الٹے سیدھے کام ختم کیے۔ دو تین ڈرامے دیکھنے کے بعد اب اسے ٹوکری اٹھا کر سودا سلف لانا ہے۔ برقعے میں خود کو پھنسا کر وہ ٹوکری لیے مارکیٹ کا رخ کرتی ہے۔ موبائل فون۔۔۔ ہاں! اس کے بغیر وہ کیسے باہر جا سکتی ہے۔ گھر میں پیچھے سے کسی کو اس سے کام پڑ گیا تو۔۔۔ وہ فون کان سے لگائے خراماں خراماں خریداری کرنے جاتی ہے۔ مول تول‘ بھاؤ تاؤ‘ کتنا ہی وقت تو یوں ضائع ہوتا ہے۔

گھر واپسی تک دوپہر چڑھ گئی۔ کھانا بناتے تک بچے اسکول سے واپس آئے‘ انہیں کھانا کھلا کر ٹیوشن والی ٹیچر کے گھر چھوڑنا ہے اور ان کے یونیفارم دھونے ہیں‘ انگریزی اسکول والے یونیفارم میلا ہونے پر بچوں کو جرمانہ کر دیتے ہیں۔ اس کے بچے انگریزی قاعدے پڑھ رہے ہیں۔ مولوی صاحب کا کیا ہے۔ ڈنڈے برسا کر کبھی نہ کبھی تو قرآن پاک پڑھا ہی دیں گے وہاں فیل پاس کا مسئلہ نہیں‘ مگر انگریزی اسکول والے وہ تو کم نمبروں والے بچوں کو اچھا ہی نہیں سمجھتے جب ہی تو منے کے اسکول کی ٹیچر کہتی ہے ٹیوشن بھی مجھ ہی سے پڑھائیں‘ ورنہ بچہ پاس نہیں ہو گا۔ مجبوراً ”اسکول کی فیس کے ساتھ ساتھ ٹیوشن کے پیسے بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔

اوپر سے گھر کا کرایہ‘ بجلی‘ پانی‘ گیس کے بل۔۔۔ لگتا ہے دوسرے دن مہینہ ختم ہو جاتا ہے۔ منے کے ابا کو ڈبل کام کرنا چاہیے‘ سرکاری ملازم ہے تو خوب رشوت لے‘ اللہ کو بھی پتا ہے کتنی مہنگائی ہے تنخواہوں میں کہاں گزارا ہوتا ہے۔ دکان دار ہے تو ناپ تول کے فرق سے کما کر لائے۔ گھر کی عورت کو گھر چلانا ہے‘ جو کوئی مذاق نہیں۔ ایک وہی تو ہے جو اتنے جنجالوں سے اتنے کم پیسوں میں نپٹتی ہے۔ منے کے ابا‘ اس کی سلیقہ شعاری سے مرعوب‘ باسی روٹی ٹھنڈے سالن کے ساتھ کھا کر شکر کرتے ہوئے کام پر روانہ‘ کہاں کا استری شدہ لباس اور کیسے

محبت بھرے الوداعی الفاظ۔ غنیمت ہے کہ زندگی کا نظام چل رہا ہے۔

"کیا میں اتنا قنوطی ہو چکا ہوں کہ مجھے وہ آئیڈیل عورت کسی بھی طبقے میں نظر نہیں آ رہی؟" انہوں نے کمرے میں کچھ دیر ٹہلنے کے بعد صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو وہ نقشے ہیں جو میں نے تینوں درجوں میں موجود ایک ایوریج عورت کو دیکھ کر باندھے ہیں' ایکسیپشنز (exceptions) بھی تو ہوتی ہیں۔"

"ہاں! ہوتی ہیں۔" پھر ان کے ذہن میں بہت سی منفی شبیہوں نے ڈیرا جمایا۔ 'چور دروازے صرف مرد ہی تو نہیں کھولتے۔ ان تینوں درجوں میں موجود عورتیں بھی تو کھولتی ہیں۔ مزید' مزید' مزید کی خواہش کے چنگل میں گرفتار عورتیں۔" ان کی نظروں کے سامنے کئی مناظر اور کئی چہرے گھوم گئے۔ "نہیں! مجھے ان کے بارے میں نہیں سوچنا۔" انہوں نے اپنے ذہن سے ان شبیہوں کو جھٹکا۔

"بس! ٹھیک ہے۔" انہوں نے کپڑے بدلنے کے ارادے سے اٹھتے ہوئے دل میں کہا۔ "میرے لیے میری دن بھر کی مصروفیات' ہوانا سگار' ہیلتھ کانشس ڈائٹ' فرصت کے لمحوں کی سوئمنگ' صبح کی سیر اور جاگنگ' ہوائی سفر اور ان سفروں کے دوران ملنے والے نئے نئے لوگ' سال بھر میں ایک آدھ بار اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر جانا اور بزنس ٹرپس کے دوران ملنے والا وی آئی پی اسٹیٹس ہی کافی ہے۔ میرے گھر کو دیکھنے والے ہاؤس کیپرز' مینیجرز اور ان کا عملہ مخلص' مستعد اور ایمان دار ہے۔ کیونکہ میں شاید ان کی خود سے وفاداری کا معاوضہ ادا کرنے کے لیے ہی تو کمائے پر کمائے چلا جا رہا ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرائے اور شاور لینے کے لیے باتھ روم کی طرف چل دیے۔

"میں تو خیر اس روٹین کا عادی ہو چکا اور اس میں سیٹ اور مطمئن بھی ہوں' مگر سعد..." سونے کے لیے لیٹنے کے بعد انہیں یاد آیا۔ "سعد کی تو زندگی پڑی ہے۔ کبھی میں نے غور ہی نہیں کیا کہ اسے اپنی زندگی کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت ہے اور وہ اس کا انتخاب کب کرے گا؟" انہوں نے سوچا۔

"یہ جو گوناگوں مصروفیات کا احوال اس کے بارے میں مجھے سننے کو ملتا ہے' اس میں کئی قسم کی لڑکیوں کا تذکرہ بھی تو موجود ہوتا ہے۔" پھر انہیں یاد آیا۔ "جیوفری بتا رہا تھا' پیر اور منگل کے دو دن اس نے لندن میں کسی لڑکی ہی کے ساتھ گزارے ہیں۔ بظاہر ایسا دکھتا تو نہیں' مگر جیوفری کو دھوکا نہیں ہو سکتا۔"

وہ زیر لب مسکرائے۔

"واہ میاں... تمہیں پکڑنے کی طاقت بھی رکھتا ہوں' مگر پکڑنے کو جی نہیں چاہتا' سو کیے جاؤ عیاشیاں۔"

انہوں نے تصور میں سعد کا چہرہ لاتے ہوئے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔ ان کو دن بھر کی تھکان کے بعد کسی مسکن دوائی کے بغیر اچھی نیند آ جاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"وہ تو ملک میں نہیں ہے' فرینکفرٹ گیا ہوا ہے۔"

یہ ایک ایسا جملہ تھا جو ماہ نور کے دماغ میں بیٹھ گیا تھا اور دن بھر کی مصروفیات کے دوران بھی ٹھک ٹھک اس کے ذہن میں بجتا رہتا تھا۔ کئی بار وہ اس جملے کو بے معنی' غیر اہم جان کر "ہیل ود" کہتے ہوئے ذہن سے جھٹک کر خود کو کسی اور کام میں مصروف کر لیتی۔ مگر اس کے ہاتھ اس کام میں مصروف ہوتے اور ذہن جیسے دوبارہ اس جملے کی گونج کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ اس نے اپنا موبائل فون بیگ سے نکالا۔ وہ کالج لائبریری کی سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی تھی۔ اس کے ان باکس میں کئی پرانے پیغامات محفوظ تھے۔ اس نے چند پیغامات کھول کر پڑھے۔

"ماہ نور! میرے سر میں شدید درد ہے۔ میں آخری کلاس لینے سے پہلے ہی گھر جا رہی ہوں... شاہ بانو" اس نے پہلا میسج پڑھا۔

"میں ایک گھنٹے بعد ملتان کے لیے نکل رہا ہوں... اجلال۔" دوسرا پیغام اس لڑکے کا تھا جس کے ساتھ وہ کئی کیمپنز بنا چکی تھی۔

"ماہ نور! میں آج تمہیں لینے نہیں آ سکوں گا۔ باس نے بلا لیا ہے' معذرت خواہ ہوں۔" سلمان کا پیغام۔

"ہیلو ماہی! شائستہ ہیر۔ مجھے آج تمہارے گھر آنا تھا' مگر نمرہ نے ڈنر پر بلا لیا۔ بہت معذرت خواہ ہوں۔" اس کی قریبی دوست شائستہ کا پیغام۔

"ماہ نور... میں ایک ہفتے کے لیے ملائشیا جا رہا ہوں' کچھ چاہیے ہو تو بتانا۔" عظمی پھوپھو کے بیٹے وقار کا پیغام۔

"ماہی! آج سنڈیکیٹ کی میٹنگ ہے۔ تم وقت پر گھر واپس پہنچ جاؤ تو کھانا کھا لینا۔ میں تمہارے لیے سموکی چکن کے ٹکڑے' گرلڈ آلوؤں کے قتلوں کے ساتھ بنا کر آئی تھی۔" ممی کا پیغام۔

اس نے یہ پانچ پیغام دو' تین بار پڑھے۔ بھیجنے والوں کے نام اس کے موبائل فون کے تعلقات کی لسٹ میں اہم ترین ناموں میں شامل تھے۔ اہم ترین اور قریب ترین دوست جو اگر کسی وجہ سے رابطہ نہ کر سکیں' کہیں جانے آنے کی اطلاع دینا چاہتے ہوں' مقررہ وقت پر آ نہ سکیں تو اس جدید ترین ذریعہ مواصلات کے ذریعہ اپنا مدعا اسے ضرور پہنچاتے تھے۔ پھر ان ہی اہم ترین رابطہ نمبرز میں سے اس نمبر سے' جو نہ جانے کیوں وہ دن میں کئی مرتبہ کال کرنے کے لیے ملاتی تھی۔ اسے یہ پیغام کیوں نہیں آیا تھا کہ اس نمبر کا مالک کسی کام سے ملک سے باہر جا رہا تھا۔ یقیناً" وہ اس کے لیے اتنی غیر اہم تھی کہ اس نے اخلاقاً" اور مروتاً" اسے ایک بار پیغام یا کال کے ذریعے اتنا بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیا وہ خیریت سے واپس گھر پہنچ چکی تھی۔ چلو! یہ نہ سہی' وہ اسے یہ تو بتا سکتا تھا کہ وہ کہیں جا رہا تھا' لہٰذا وہ اس سے رابطہ کرنے کی زحمت نہ کرے۔

"میں تمہیں اس سونگ کا لنک ضرور بھیجوں گا۔" اسے ایک بات شاید پچاسویں مرتبہ یاد آئی۔

"کہاں بھیجو گے؟" ماہ نور کے دل میں ایک بے نام سی اذیت نے سر اٹھایا۔ "تمہارا نمبر بند ہے اور کوئی میلنگ ایڈریس نہ تم نے مجھے دیا' نہ میں نے تمہیں' پھر یہ لنک کہاں ملے گا مجھے؟"

آسمان پر کہیں کہیں بادل ٹکڑیوں کی شکل میں بکھرے تھے اور ہلکی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ ماہ نور نے ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کو کان کے پیچھے اڑسا۔

"میرا دل کیسے مانے کہ تم نے مجھ سے غلط بیانیاں کیں' تم نے اپنے متعلق مجھے جو بتایا' وہ جھوٹ تھا۔ میرا دل یہ بات قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتا' کیونکہ مجھے تمہارے چہرے پر' نہ آنکھوں میں' نہ لہجے میں کبھی کوئی ریا محسوس ہوئی' نہ مکر نظر آیا۔ پھر وہ کیا تھا جو تمہارا رویہ تھا۔"

اس نے الجھتے ہوئے سوچا۔ سامنے کالج کے گراؤنڈ میں فری پیریڈ اور کلاس بنک کر کے باہر آنے والی لڑکیاں ادھر ادھر بکھری خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

"کیا وہ محض اس کوفت کا تدارک تھا جو تمہیں مختلف بہروپ بدلے مختلف جگہوں پر نظر آنے پر مجھے ہوئی ہے؟ اور اگر وہ اتنا وقتی اور غیر اہم ساتھ تھا تو میرے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ میں تمہیں بھول کیوں نہیں جاتی' میں اپنے ذہن سے تمہیں جھٹک کیوں نہیں پاتی؟"

اسے کچھ فاصلے پر بیٹھی لڑکیوں کے ایک گروپ کے کسی بات پر زور سے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے اس گروپ کی لڑکیوں کو دیکھا۔ وہ موبائل کے کسی جدید سیٹ پر تصویریں دیکھنے میں مگن تھیں اور زور و شور سے تبصرے کرتے ہوئے وقفے وقفے سے قہقہے بکھیر رہی تھیں۔

"کچھ عرصہ پہلے میں بھی ایسی ہی بے فکری' اتنی ہی مگن اور شاید اس سے بھی اونچی آواز میں ہنسنے والی لڑکیوں میں شامل تھی۔" اس کے دل میں درد کا ایک ہلکا سا احساس اٹھا۔ "مگر اب ایسا کیا ہے کہ میں الجھ کر رہ گئی ہوں' ایسا کیا ہے کہ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا؟"

اس نے آنکھوں میں پھیلتی نمی کو ٹشو پیپر سے دبا کر صاف کیا اور ہاتھ میں پکڑے موبائل فون پر کال ملانے لگی۔

"ہیلو شاہ بانو! تم کدھر ہو؟" وہ کہہ رہی تھی۔ "میں یہاں لائبریری کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوں۔ تم بھی یہیں آجاؤ۔ آج باہر لنچ کرتے ہیں۔ آج بہت دن کے بعد کہیں بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کرتے ہیں۔"

"لیکن میں اس وقت تک تم سے نہیں پوچھوں گی' جب تک تم خود نہیں بتاؤ گی کہ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔"

دوسری طرف سے فون بند کرنے کے بعد شاہ بانو نے سوچا تھا۔

✡ ✡ ✡

پٹواری غلام حسین کا جنازہ پڑھانے کے لیے مولوی سراج سرفراز کو گاؤں کی بڑی جنازہ گاہ میں ماسٹر کمال نے پہنچایا تھا۔ چوہدری سردار' پٹواری غلام حسین کا جنازہ پڑھنے کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ تیار جنازہ چوہدری صاحب کے انتظار میں رکھا تھا۔

"پچھلے ہفتے گاما مچھی مرا تھا' چوہدری صاحب گاؤں ہی میں تھے' پر نہیں آئے جنازے میں۔" مولوی سرفراز کے کان میں ادھر ادھر کھڑے بیٹھے لوگوں میں سے کسی کی آواز پڑی۔

"آج تو صبح ہی اعلان ہو گیا کہ چوہدری صاحب جنازے کے لیے آ رہے ہیں۔ پٹواری صاحب کا جنازہ ہے نا! آج تو چوہدری صاحب کو آنا ہی تھا۔" کسی اور نے کہا۔

"بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ پٹواری صاحب' چوہدری صاحب کے کام کے بندے تھے۔ گاما مچھی کیا دیتا تھا انہیں۔" تیسری آواز آئی۔

"لاحول ولا....." مولوی سرفراز تسبیح کے دانے گراتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ "میت سامنے رکھی ہے اور لوگ غیبتوں میں مشغول ہیں۔ اللہ شان و جل کے غضب سے خوف نہیں آتا انہیں۔"

وہ آنکھیں بند کیے بظاہر تسبیح میں مشغول تھے' لیکن دراصل لوگوں کی نفسیات کا مقدور بھر تجزیہ کرنے میں مصروف تھے۔

"اور غیبت بھی کس کی؟ چوہدری سردار صاحب کی جن کے سائے تلے یہ گاؤں کے لوگ موجیں مارتے ہیں۔ اس قدر نیک دل' نیک نیت' نیک فطرت انسان میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔ اب بھلا چوہدری سرکار کو کیا فرق پڑتا ہے کہ مولوی سراج سرفراز کے گھر کا چولہا جلتا ہے یا نہیں۔ مولوی کے گھر میں ایندھن ہے یا ختم ہو گیا۔ اناج مولوی کا خاندان کم کھاتا ہے یا زیادہ' مگر نہیں' وہ پورا خیال رکھتے ہیں یہ پوچھے بغیر کہ اگلا ذخیرہ ختم ہوا کہ موجود ہے.... اور بھیج دیتے ہیں۔ سبحان اللہ! بھئی عمر بھر کوئی اور ایسا دل والا شخص نہ ملا جو مولوی کا یوں تا تر رکھنے کی فکر کرتا رہے۔ استغفر اللہ... انسان گمان میں نہ پڑے' گمان انسان کی اپنی نیکیوں کو بھی کھا جاتا ہے اور دوسروں کو بھی مخمصے میں ڈال دیتا ہے۔ استغفار' استغفار۔"

اب مولوی صاحب کی زبان استغفار پڑھ رہی تھی اور انگلیاں سرعت سے تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں۔

جنازے سے فارغ ہونے اور میت کو دفن کرنے کے بعد چوہدری صاحب کافی دیر تک مرحوم کے بیٹوں' بھائیوں اور دامادوں کے پاس بیٹھے رہے اور مولوی سراج' سرفراز کو انہوں نے خصوصی طور پر اپنے ساتھ بٹھائے رکھا۔

پٹواری صاحب مرحوم کے سمدھی نے کھانا کھلوایا۔ کھانا کھلتے ہی مولوی سرفراز کی قوت شامہ جاگ اٹھی۔

"لگتا ہے سپر کے چاول پکوائے ہیں پٹواری کے سمدھی نے۔"

ان کے ذہن میں فوراً" خیال آیا اور جب اچار کے مسالے والی گرم بریانی کی ٹرے مولوی صاحب کے سامنے رکھی گئی تو ان کی عقابی نظروں نے چاولوں کے ڈھیر میں چھپی چھوٹے گوشت کی بوٹیوں کی تعداد کو سیکنڈوں میں گن لیا۔

"سچ ہے' بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" پلیٹ میں بریانی کا پہاڑ بناتے ہاتھ سے کھاتے ہوئے مولوی سراج سوچ رہے تھے۔ "مرنے پر بھی چھوٹا گوشت' اس کا مطلب ہے اب سوئم تک اچھا ہی کھانے کو ملے گا اور دسویں' چالیسویں کی تو کیا ہی بات ہو گی' سبحان اللہ کیا شان ہے تیری میرے مولا! ہم جیسوں کو اچھا کھلانے کے لیے بھی تو کیا کیا انتظام کر دیتا ہے۔"

پیٹ بھر کے کھا لینے کے بعد مولوی سرفراز کے کان اس آواز کے منتظر تھے جس کو "مولوی صاحب کی روٹی باندھ دو بھئی! انہیں گھر پہنچانا ہے۔" کے الفاظ ادا کرنے تھے۔

"اچھا پھر مولوی صاحب! میں چلتا ہوں۔" اسی دم چوہدری سردار نے مولوی صاحب کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور مولوی صاحب چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"پرسوں ملاقات ہو گی' قل کے ختم پر۔" وہ کہہ رہے تھے۔ "کوئی نیک بات سنائیے گا دعا میں۔ کوئی اونچا مسئلہ بیان کیجیے گا۔ روشنی کا کوئی چراغ ہمارے ہاتھ میں بھی تھمائیے گا۔ ہم تو اندھیرے راستے پر اندھوں کی طرح چلے جا رہے ہیں۔ کوئی اچھی بات سنا کر ہمارے راستے' ہماری منزلیں بھی آسان کرنے کی کوشش کیجیے گا۔"

"جی سرکار' بالکل سرکار۔" مولوی! صاحب دونوں ہاتھوں سے سر پر بندھا صافہ درست کرتے عاجزی سے بولے۔

"تو! اب چوہدری صاحب کی خاطر محنت کر کے آنا پڑے گا ختم کے لیے۔ رابعہ بی بی سے مدد لینی پڑے گی اور اس کی جلی بھنی نظروں کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔" ان کے دل میں خیال آ رہا تھا۔

"کوئی چیز' کوئی سوغات چاہیے ہو مولوی جی! تو بتائیے۔" چوہدری صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔ "کوئی بالن' کوئی اناج' کوئی پھل سبزی۔" انہوں نے مولوی صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اصل میں کھاری لاہور گیا ہوا ہے' بی بی کے ساتھ۔ وہ ہوتا ہے تو میں بے فکر ہوتا ہوں۔ اس کا آپ کے پاس آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اسے خبر ہوتی ہے کہ کب کیا پہنچانا ہے۔ یہ باقی لڑکے تو لاپروا اور من موجی ہیں۔ اگر کوئی غفلت کر جائیں تو در گزر کر دیجیے گا۔"

"نہیں' نہیں سرکار!" مولوی صاحب نے ایک بار پھر صافہ سنبھالتے ہوئے کہا۔ "سب موجود ہے' اللہ شان و جل کے فضل اور آپ کی عنایت سے' سب موجود ہے۔"

"اچھا! یہ تو اچھی بات ہے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔ "پھر بھی کوئی ضرورت ہو تو تکلف والی کوئی بات نہیں' اب یہ سارا پنڈ ہی آپ کا ہے۔ پچھلا پنڈ آپ کا چاہے ساہیوال کا ہو یا چیچہ وطنی کا' اب تو آپ ہمارے ہیں... ہے نا جی۔" انہوں نے رک کر مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ مولوی صاحب کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

"ہاں جی' ہاں جی!" انہوں نے اپنی سرمہ بھری آنکھیں چراتے ہوئے جواب دیا۔ چوہدری صاحب زیر لب مسکرائے اور پٹواری کے بیٹوں کے ساتھ باہر کی طرف چل دیے۔

"بات ہی پکڑلی چوہدری صاحب نے۔" مولوی صاحب نے صافے کے کنارے سے پسینہ پونچھتے ہوئے سوچا اور دزدیدہ نظروں سے اُس کونے کی طرف دیکھنے لگے' جہاں سلیم نائی دیگ سے چاول نکال کر ایک بڑے شاپر میں ڈال رہا تھا۔

"شاباش او منڈیو! مولی جی (مولوی صاحب) کی روٹی باندھ دو۔ مجھے انہیں گھر پہنچا کر ٹوب ویل پر جانا ہے۔" ان کے کان میں ماسٹر کمال کی آواز آئی اور ان کا دل کھل اٹھا۔

☼ ☼ ☼

"میں آج کل ڈائٹنگ پر ہوں اور تم مجھے زبردستی پزا کھلا رہی ہو۔" شاہ بانو نے پزا ٹاپنگ سے ہرے زیتون کے ٹکڑے اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا اور جواب نہ ملنے پر ماہ نور کی طرف دیکھا جو بے دھیانی سے سامنے دیکھ رہی تھی۔

"ہے ماہ نور" شاہ بانو نے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں پھیلا کر ماہ نور کی نظروں کے سامنے ہلائیں۔ "کہاں گم ہو؟"

"ہوں..." ماہ نور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کہیں نہیں... ادھر ہی ہوں۔" اس نے اپنا دھیان پلیٹ میں رکھے پزا کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"ادھر تو نہیں ہو۔" شاہ بانو نے کہا۔ "اور یہ تو اب تمہاری عادت سی بن گئی ہے۔ جدھر تم ہوتی ہو' وہاں دراصل ہوتی نہیں ہو۔"

"کیا مطلب؟" ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔

"مطلب تم غیر حاضر دماغی کا شکار ہوتی جا رہی ہو' اب اس کی وجہ کیا ہے' یہ تو میں نہیں جانتی' مگر کوئی تو وجہ ہے۔"

"یہ محض تمہارا وہم ہے۔" ماہ نور نے سر جھٹک کر کہا۔

"وہم نہیں' مجھے یقین ہے۔" شاہ بانو کے لہجے میں تیقن تھا۔ ماہ نور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"جب ہم اسلام آباد میں تھے' اس وقت کی بات تم کر سکتی ہو۔ اب تو ایسا نہیں ہے۔" ماہ نور نے سر جھکا کر کہا۔

"جبکہ مجھے لگتا ہے' اب تمہاری ذہنی کیفیت اس وقت سے زیادہ الجھی ہوئی ہے۔" شاہ بانو نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔

"تمہارا وہم ہے... اور کچھ نہیں۔" ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ لاشعوری طور پر اس کی انگلی ہاتھ میں پکڑے موبائل فون پر ایک ایسا نمبر بار بار ملا رہی تھی۔ جس سے اسے جواب موصول ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔

"جسٹ انجوائے دس پزا۔" (بس اس پزا سے لطف اٹھاؤ۔) اگلے لمحے فون میز پر رکھ کے اس نے موضوع بدلنے کی شعوری کوشش کی۔

"ماہ نور! میں نے اسلام آباد سے آنے کے بعد رائی حانہ کا وہ گانا اتنی بار سنا ہے کہ مجھے ایک ایک لفظ یاد ہو گیا اس کا۔"

شاہ بانو' ماہ نور کے نارمل انداز کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولی۔ اسی وقت ماہ نور کا ہاتھ لگنے سے کافی کا کپ میز پر الٹ گیا۔

"اوہ! آئی ایم سوری۔" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔

"اوہ! تمہارا ہاتھ تو نہیں جلا؟" شاہ بانو نے ٹشو پیپر زمیز پر پھیلتی کافی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔

"ہاں! تو میں بتا رہی تھی کہ رائی حانہ کا گانا..." میز کی سطح صاف کرنے کے بعد شاہ بانو نے کہا۔

"اس کو چھوڑو... تم یہ بتاؤ! تم نے برونو مارس کو سنا ہے کبھی؟" ماہ نور نے اپنے موبائل پر میوزک فائلز نکال کر شاہ بانو کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کو سنو! یہ برونو مارس ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ غور سے سنو۔"

"یہ تو میں کئی بار سن چکی ہوں۔" شاہ بانو نے موبائل اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "خاصا رومانٹک گانا ہے۔"

"خاصا نہیں' انتہائی رومانٹک۔" ماہ نور نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ "سحر زدہ کر دینے کی حد تک رومانٹک"

"بہت ہی لکی ہے بھئی! برونو مارس کی محبوبہ' جسے وہ یقین دلا رہا ہے کہ اس سے زیادہ خوب صورت لڑکی کوئی نہیں ہے۔" شاہ بانو نے کہا۔

"اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی کو برونو مارس کا یہ گانا خصوصی طور پر سنائے تو اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"ہائے!" شاہ بانو نے مسکراتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے ٹکایا۔ "اس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہ لڑکی بہت بہت خوش قسمت ہے۔" اس نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" ماہ نور کے چہرے اور آنکھوں پر لمحہ بھر کے لیے چمک آئی' لیکن اگلے لمحے وہ بجھ گئی۔ "ایسا ہونا مشکل ہے نا؟"

"کیوں مشکل کیوں ہے؟" شاہ بانو نے کہا۔ "اگر کوئی اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے اس گانے کا سہارا لینا چاہتا ہے تو اس میں کیا مشکل ہے؟"

"اور اگر کوئی یوں ہی کسی کو یہ گانا یہ کہہ کر سنوا دے کہ یہ اس کا پسندیدہ ترین گانا ہے تو..."

"مطلب' کوئی لڑکا اگر ایسا کرے تو؟" شاہ بانو نے سوال کیا۔

ماہ نور نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر تو ظاہر ہے' وہ اپنا پسندیدہ گانا ہی سنوا رہا ہے۔" شاہ بانو نے کہا۔ "یا پھر لڑکی کو پٹانے کے لیے بہانہ بنا رہا ہے۔" شاہ بانو ہنسنے لگی۔

"ایسا کیوں کرے گا؟" ماہ نور نے بھولپن سے سوال کیا۔

"تم خود سوچو' ایک لڑکا کسی لڑکی کو یہ کہہ کر یہ گانا سنوائے کہ یہ میرا پسندیدہ ترین گانا ہے تو لڑکیاں تو ہوتی ہی بے وقوف ہیں۔ اس لڑکی کے دل میں ضرور یہ خیال آئے گا کہ شاید یہ الفاظ اسی کے لیے کہے گئے ہیں اور وہ پھنس جائے گی ان لفظوں میں۔"

ماہ نور نے بمشکل شاہ بانو کی اس بات کو حلق سے اتارا۔

"اچھا! پھر یہ بتاؤ کہ آمنہ اپنے لان پرنٹس کب لا رہی ہے مارکیٹ میں؟ پہلے ایگزیبیشن ہو گی یا یوں ہی ڈائریکٹ مارکیٹ میں لائے گی۔" اس نے تیزی سے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

گھر واپس آنے تک ماہ نور کا جذباتی دل کافی حد تک ٹھکانے پر آچکا تھا۔ گھر واپس آکر اس نے بیگ سے موبائل فون نکال کر اپنے سامنے کی دیوار کی طرف اچھال دیا۔ فون دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرا۔ اس کا کور دو حصوں میں تقسیم ہوا اور بیٹری دور جا پڑی' ماہ نور نے فون کی طرف دیکھے بغیر اپنے جوتے اور موزے اتار کر کمرے کے دوسرے کونے کی طرف اچھال دیے اور بیڈ پر لیٹ کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے دیکھا' ہر طرف خزاں چھا گئی ہے۔" سارہ نے ناشتا کرتے ہوئے یمی آنٹی سے کہا۔ چائے کی پیالیوں میں دودھ انڈیلتے ہوئے یمی آنٹی نے ہاتھ روک کر سارہ کی طرف دیکھا۔

"پچھلے دو سال سے ہم یہاں رہ رہے ہیں اور دو سالوں میں دو دفعہ یہ وقت آیا ہے۔ تم نے اب نوٹس کیا۔" انہوں نے پوچھا۔

"اچھا!" سارہ نے پورج کھاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ "پتا نہیں' شاید پہلے بھی ایسا موسم آیا ہو' مجھے تو ابھی پتا چلا۔"

"ہوں!" یمی آنٹی نے کہا۔ "اور دوبارہ سے پیالیوں میں دودھ انڈیلنے لگیں۔"

"اچھی بات ہے' جو تمہیں ابھی بھی پتا چل گیا...... اور یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے کہ تمہیں پتا چل رہا ہے۔"

"آپ کا کچھ پتا نہیں چلتا۔" سارہ نے دلیے کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں ٹھیک نہیں ہوں تو آپ ناخوش رہتی ہیں' ذرا بستر ہو جاؤں تو بھی ناخوش۔ اگر کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہ پڑے تب بھی آپ ناخوش اور اگر پڑنے لگے تو بھی ناخوش۔ یہ بتائیں اب آپ کو میری ذمہ داری کھلنے لگی ہے یا کیا؟"

یمی آنٹی' سارہ کے اس سوال پر کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتی رہیں' پھر انہوں نے نظریں کھڑکی سے باہر پھیلے ہوئے منظر پر ٹکالیں۔

"کیوں...... اب خاموش کیوں ہو گئیں؟" سارہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جواب کیوں نہیں دے رہیں؟"

"تمہیں لگتا ہے' میں تمہاری ذمہ داری سے تنگ آگئی ہوں؟" انہوں نے نظریں واپس سارہ کی طرف ٹکا کر پوچھا۔ "اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو ٹھیک ہے' تمہارے لیے کسی اور کا بندوبست کر دیتے ہیں اور میں یہاں سے رخصت ہو جاتی ہوں۔" سارہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"یمی آنٹی کی جگہ کوئی اور......" اس نے تصور کرنے کی کوشش کی اور اس کے دل نے اس کے سر کو نفی میں ہلنے پر مجبور کر دیا۔

"تم جانتی ہو' مجھے زندگی میں کیا چاہیے؟" یمی آنٹی نے پوچھا۔ "اس عمر میں جواب میری ہے۔" انہوں نے خود اپنی طرف اشارہ کیا۔ "ان حالات میں جو میرے ہیں۔" سارہ نے ان کے لہجے کی سختی کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

"میرا اس ملک میں کون ہے؟" یمی آنٹی نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اس ملک میں میرا کیا ہے؟" انہوں نے سارہ کی طرف دیکھا۔

"ایک ایسی عورت جس نے اپنا بچپن اور لڑکپن ایک سرد ملک کے سرد جذبات والے لوگوں کے ساتھ ایک یتیم خانے میں گزارا' بڑی ہوئی تو وہ یتیم خانے سے بھاگی۔ تعلیم اور ہنر کی کمی کی وجہ سے سڑکوں سے کوڑا چننے کے کام پر مامور ہو گئی۔ قصبہ قصبہ پھرتی' سرکس پارٹی کا حصہ بن کر بینڈ بجانا سیکھنے لگی اور پھر ایک اجنبی ملک کے اجنبی شخص کے اظہار محبت سے متاثر ہو کر اسے اپنا سب کچھ جانتے ہوئے اس سے بیاہ رچا بیٹھی۔ ایک گھر' ایک خاندان سے متعلق ہو جانے کا نرم گرم تصور لیے سرد فضا چھوڑ کر اجنبی ملک کی گرم ہوائیں کھانے یہاں آگئی۔" انہوں نے ہوا میں کہیں اشارہ کیا۔

"یہاں...... جہاں ایسی بہوئیں قبول کی جاتی ہیں نہ سینے سے لگائی جاتی ہیں۔ سو وہ عورت بھی دھتکاری گئی اور کئی سال کی خدمت چاکری کے بعد گھر سے نکالی بھی گئی۔ وہ ایک......" انہوں نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سنگدل دل بھی جیتنے میں ناکام رہی۔"

سارہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا۔

"نہ پاسپورٹ اس کے پاس' نہ کوئی ویزا اس کے پاس۔ بے شناخت' بے نام عورت...... کیا کرتی' کہاں جاتی؟" انہوں نے جیسے سارہ سے سوال کیا۔

"بھلا ہو خان محمد کا جس نے اسے اپنے سرکس میں ملازمت دے دی۔ بینڈ بجانا تو وہ بھول چکی تھی۔ ہاں! جانوروں کا راتب تیار کرنا اور انسانوں کے لیے کھانے پکانا اسے آگیا تھا' سو رزق کا وسیلہ بھی بنا اور سر چھپانے کا ذریعہ بھی۔ اس کے بعد......"

"اس کے بعد کیا ہوا' کیا کیا ہوتا رہا؟" سارہ نے ہاتھ اٹھا کر یمی آنٹی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے سب معلوم ہے۔"

"پھر بھی۔" یمی آنٹی نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔ "پھر بھی کہتی ہو' میں تمہاری ذمہ داری سے تنگ آگئی ہوں؟"

"نہیں! میں نہیں کہتی۔" سارہ نے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر جوڑا بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کوشش میں اس کے بازوؤں کے پٹھے تھوڑی ہی دیر میں تھک گئے اور اپنی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے اس نے بالوں کو ایسے ہی چھوڑ دیا۔ یمی آنٹی اس کی اس کوشش کو بغور دیکھ رہی تھیں۔

"لیکن تمہارے سامنے ابھی لمبی زندگی پڑی ہے۔" انہوں نے کچھ اور کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے بات بدلی۔ "سوچو! اگر تمہارے لیے یہ سب انتظام کرنے والا تنگ پڑ گیا تو کیا کرو گی؟"

سارہ نے جھنجلا کر یوں سر جھٹکا جیسے کہہ رہی ہو "چلو! پھر وہی بات لے کر بیٹھ گئیں۔" مگر یمی آنٹی کو اس کی جھنجلاہٹ کی کوئی پروا نہیں تھی۔

"تم جانتی ہو' اس فلیٹ کا کرایہ کتنا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔ "بجلی اور گیس کے بل' کچن کے اخراجات' لانڈری اور مینٹیننس کے اخراجات' تمہاری دواؤں اور خوراک کا خرچہ......" انہوں نے سارہ کو کچھ باور کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ جو ابھی تک یہ سب انتظام کر رہا ہے' وہ تنگ پڑ گیا تو کیا ہو گا' کبھی سوچا ہے تم نے؟"

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔" سارہ نے تنگ آتے ہوئے یمی آنٹی کی طرف دیکھا۔ "میری حالت نہیں دیکھتیں؟" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "میں کسی کام کے قابل رہ گئی ہوں؟" اس نے یمی سے سوال کیا۔

"آپ کا کیا خیال ہے' میں دوبارہ سرکس کے تاروں' رسیوں اور بازو پر کرتب دکھا سکتی ہوں؟ شیروں اور کتوں کے ہمراہ آگ کے کھیل کھیل سکتی ہوں؟ کیا میں دوبارہ اس پنڈال میں اس طرح داخل ہو سکتی ہوں' جہاں اتنے برس میں نے موت اور زندگی کے درمیان بقا کی جنگ لڑتے گزار دیے؟"

یمی آنٹی کچھ دیر سارہ کے بگڑے تیور دیکھتی رہیں اور پھر تحمل بھرے لہجے میں بولیں۔

"جو سرکس میں کام نہیں کرتے' وہ روزگار کمانے سے عاری ہوتے ہیں کیا؟"

"کماتے ہوں گے۔" سارہ نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "مگر مجھے تو جو کام آتا ہے' میں اسی سے کما سکتی ہوں اور وہ کام کرنے کے قابل میں اب نہیں رہی۔"

"میں نے زندگی میں ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں' جو کئی اعضاء سے معذور ہونے کے باوجود بھی اپنی روزی خود کمانے کی سعی کرتے ہیں اور کما بھی لیتے ہیں۔ ٹانگوں سے معذور' ہاتھوں سے معذور' آنکھوں اور زبان سے معذور' کانوں سے معذور' کئی ایسے بھی جو معذور جسم کو فرش پر گھسیٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں' مگر اپنا رزق خود کما رہے ہیں۔" یمی آنٹی سارہ کی کسی بھی دلیل سے متاثر نہ ہوئیں۔

”بھیک ‘خیرات مانگنے والوں کا ذکر کر رہی ہیں؟“ سارہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”وہ معذور جو اپنے ادھورے اعضاء پر پٹیاں باندھے راستوں‘ بازاروں اور سڑکوں کے کناروں پر پڑے اپنی بے بسی کو مظلومیت کا نشان بنائے دوسروں کے ہاتھوں اور جیبوں سے اپنے لیے سکے اور روپے نکلوا رہے ہوتے ہیں۔“

”تو یہ کیا ہے؟“ سیمی آنٹی نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”کیا یہ خیرات نہیں‘ جو تم انجوائے کر رہی ہو؟“ سارہ نے چونک کر سیمی آنٹی کی طرف یوں دیکھا‘ جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا ہو۔

”تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کیا ہے‘ جو سعد سلطان تمہاری مد میں خرچ کر رہا ہے؟“ سیمی آنٹی نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ نچاتے ہوئے سوال کیا۔ ”یہ خیرات ہے‘ زکوۃ ہے کہ صدقہ ہے؟“

سارہ کا دل ایک دم اپنے معمول سے تیز رفتار میں دھڑکنے لگا۔

”مگر یہ چیریٹی ہے تو بھی صدقہ ‘خیرات ہے سارہ خان!“ سیمی آنٹی نے اپنے الفاظ کی برہنگی اور کاٹ کی پروانہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کھلے عام نہ سہی۔ ڈھکے چھپے ہی سہی‘ یوں دو کہ دینے والے ہاتھ کو ہی خبر ہو‘ دوسرا ہاتھ بے خبر رہے۔ یہ وہ بھی ہو‘ تو بھی ‘ ہے تو صدقہ اور خیرات ہی نا۔“ انہوں نے سارہ کو خوش فہمیوں کے جہان سے ایک وار میں باہر نکالتے ہوئے کہا۔

”سوچو سارہ خان!“ انہوں نے سارہ کا ہاتھ ہلایا۔ ”کب تک صدقے اور خیرات پر زندگی گزارو گی؟ تمہارے اعضا تمہاری کیا گواہی دیں گے‘ جب وہ مالک کے حضور حاضر ہوں گے۔“

سارہ پھٹی آنکھوں سے سیمی آنٹی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”سعد سلطان تمہارا کچھ نہیں لگتا‘ اس نے کوئی چیریٹی ہوم بھی نہیں کھول رکھا۔“ سیمی آنٹی نے اس کے کسی بھی رد عمل کی پروانہ کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”وہ تمہاری معذوری کا احساس کر کے تمہاری مدد کرتا ہے‘ مگر اپنی بے شمار دولت میں سے تمہاری مدد کی مد میں جانے والے پیسوں کو وہ کس کھاتے میں شمار کرتا ہے۔ کبھی تم نے اس سے پوچھا؟“ وہ دم لینے کو رکیں۔

”کبھی یہ سوچا کہ وہ اس مد سے ہاتھ کھینچ لے تو کسی بھی مشقت کا عادی نہ رہ جانے والا تمہارا جسم تمہارا کتنا اور کیسے ساتھ دے گا؟

سوچو! اگر سعد کو کبھی کچھ ہو گیا تو تمہارا پرسان حال کون ہو گا؟“

”چپ کر جائیں سیمی آنٹی!“ سارہ نے برداشت جواب دے جانے پر چلا کر کہا۔ ”مجھے کوسیں‘ مجھے ڈانٹیں‘ مستقبل کے ڈراؤنے روپ دکھائیں‘ لیکن سعد کے لیے ایسی بات مت کریں۔ محض مجھے ڈرانے کے لیے آپ اس کے لیے ایسے الفاظ کیوں بول رہی ہیں؟“

”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اس دنیا میں انسانوں کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگلے پل کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ اس لیے اپنے لیے خود سوچو‘ خود کوشش کرو۔“ سیمی آنٹی نے اٹھ کر ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

”اور اگر وہ ساری باتیں جو آپ مجھے فرض کرا رہی ہیں تو آپ کا کیا ہو گا؟ آپ نے سوچا کبھی؟“ سارہ نے الٹا وار کرتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ جو آپ سعد کی وجہ سے یہاں اتنی مزے کی زندگی گزار رہی ہیں‘ اگر وہ ڈراؤنا مستقبل آگیا جو آپ مجھے دکھا رہی ہیں تو آپ کیا کریں گی‘ کہاں جائیں گی‘ کیا یہ سب آپ کو خیرات میں نہیں مل رہا؟“

”ہونہہ!“ سیمی نے ہاتھ روک کر سارہ کی طرف دیکھا اور سر جھٹکا۔ ”میں ایک پل بھی ادھر نہ رہتی‘ اگر خیرات ہوتا یہ سب کچھ۔“

”کیوں‘ آپ کے لیے کیوں نہیں؟“ سارہ نے سر اٹھا کر کہا۔

”میں یہاں تمہاری خدمت پر مامور ہوں‘ جس کا معاوضہ یہ چھت اور تین وقت کی روٹی ہے۔ میں کروشیا بنتی ہوں اور قصبے میں ہینڈی کرافٹس شاپ والے کے پاس رکھواتی ہوں۔ مجھے اپنے کام کے اچھے دام مل جاتے ہیں‘ جن سے میں اپنی باقی ضرورتیں پوری کر لیتی ہوں۔ دو‘ تین سوٹ‘ دو سویٹرز‘ دو جوڑی جوتے اور کچھ دوائیں ... میری ضرورتیں بس اتنی ہی ہیں‘ جن کے لیے میں اپنے ہاتھوں سے محنت کرتی ہوں۔“ سیمی آنٹی نے اپنے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

سارہ نے سیمی آنٹی کے ہوا میں بلند ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ مضبوط ساخت کے حامل ان ہاتھوں کی جلد سخت تھی۔ انگلیوں کی گرہوں پر سیاہ نشان تھے۔ ہاتھوں کی جلد کی رنگت پیلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ ہاتھ مجموعی طور پر محنتی ہاتھ ہونے کا تاثر دے رہے تھے۔ ان ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے سارہ کو گزرے وقت کے کچھ مناظر یاد آنے لگے۔ پیاز کا ڈھیر چھیلتے اور کاٹتے یہ ہاتھ‘ سرعت سے سبزی کے ڈھیر چھیلتے اور کاٹتے ہاتھ‘ دیگ نما دیگچیوں میں مسالا بھونتے ہاتھ‘ جستی ٹب میں گوشت کے ڈھیر دھو کر رکھتے یہ ہاتھ‘ جستی بالٹیوں اور ٹبوں میں توڑی دانہ ملاتے ہاتھ‘ گوشت ابال کر اس کو لکڑی کے لمبے ہینڈل والی ڈوئیوں سے بھرتہ بنا کر جانوروں کا راتب تیار کرتے ہاتھ‘ محنت شاقہ کے عادی ہاتھ۔ اس کی نظریں ہاتھوں سے ہٹ کر سیمی آنٹی کے چہرے پر منتقل ہو گئیں۔ وقت کی گردشوں کے باقی رہ جانے والے آثار کی جھلک دکھاتا چہرہ‘ چہرے کی رنگت جو اس نے کبھی سفید اور گلابی دیکھی تھی‘ زرد اور گندمی ہو رہی تھی‘ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور گالوں پر بھورے رنگ کے مدھم نشان‘ ماتھے پر بڑھتی عمر کی لکیریں‘ بالوں میں سفیدی اتر چلی تھی۔ چہرے سے پھسل کر اس کی نگاہیں سیمی آنٹی کی گردن پر آکر ٹک گئیں۔ گردن کی جلد ڈھلکنے لگی تھی اور چہرہ جھکانے پر اکٹھی ہو جاتی تھی۔ گلے میں سلور کی ایک لمبی زنجیر تھی جو ان کے چشمے کو اپنی گرفت میں لیے اسے سینے تک لٹکائے رکھتی تھی۔

سارہ نے سیمی آنٹی کو اس وقت بھی دیکھا تھا‘ جب ان کی عمر چونتیس‘ پینتیس برس کے قریب تھی اور اب جب ادھیڑ عمری میں تھیں‘ وقت کتنا آگے سرک چکا تھا اور وقت نے ان کے چہرے کے نقوش اور ان کے جسمانی دم خم پر کیسا اثر چھوڑا تھا۔

”یہ وقت جو تم پر ہے‘ یہ بھی گزر جانا ہے سارہ خان! اور ایک وقت وہ آنے والا ہے‘ جب تم سیمی آنٹی کی اب والی عمر کو پہنچ جاؤ گی۔“ اس کے ذہن میں ایک دم خیال آیا۔ ”اس وقت تمہارے چہرے کے نقوش بھی اسی طرح بدل چکے ہوں گے اور تمہارا جسم ...“ اس نے خود پر نظر ڈالی ”جو ابھی کمزوری اور معذوری کا شکار ہے۔ اس کی کیا شکل ہو گی؟“ اس نے تصور کرنے کی کوشش کی اور اس کا دل خوف سے لرز اٹھا۔

”میرے لیے ایک وہیل چیئر منگوا لیں سیمی آنٹی!“ اس نے خود کو کہتے سنا۔



”یہ جو سلمان صاحب ہے اس کی تو زندگی بڑی عذاب ہے بھئی! وچارہ ہر وقت کسی نہ کسی جلدی میں رہتا ہے۔“ چوکیدار کے پاس اسٹول رکھ کر بیٹھے کھاری کے ذہن میں خیال آیا۔ ”لگتا ہے ہر ویلے (وقت) اسے کسی نے پا جھڑ (بھاگ دوڑ) ہی ڈالی ہوتی ہے۔ گاڑی چلاتا ہے تو لگتا ہے سڑک پر سامنے دیکھ بھی رہا ہے‘ نہیں بھی دیکھ رہا۔“

اس نے گھاس کے چھوٹے سے قطعے پر مشین پھیرتے مالی کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ نرم ہری گھاس کے کٹنے پر ایک مخصوص سی باس ساری فضا میں پھیلی تھی۔

”اس وچارے کا ذہن ہر ویلے کسی اور طرف کی سوچ رہا ہوتا ہے۔ کیڈی (کتنی) وخت (مشکل) میں ہے اس

کی جان۔" اس نے سر جھٹکا اور مالی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کٹی ہوئی گھاس مشین کے آگے لگے ڈبے سے نکال کر ایک سائیڈ پر الٹا رہا تھا۔ ہری ہری نم گھاس کی ڈھیری سے بھی باس اٹھ رہی تھی۔

"ابھی یہ گھاس جان میں ہے۔ اس واسطے رنگ بھی دے رہی ہے اور باس بھی۔ رات تک باسی ہو جائے گی' کل سویرے تک رنگ بدلے گی' سوکھنے لگے گی اور پھر سڑ کر سواہ تنکا ہو جائے گی۔" وہ سوچنے لگا۔ "بندہ وچارہ بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ بنیادوں اکھڑا بندہ اور ایس (اس) گھاس میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔" اس کے ذہن میں عجیب وغریب سوچیں خود بخود آئے چلی جا رہی تھیں۔ "مولی صاب وچاروں کی طرح" اسے ایک نیا خیال سوجھا۔

"مولی صاب بھی تو لگتا ہے بنیادوں اکھڑ گئے ہیں۔ اسی واسطے نہ تو ان کا رنگ ہے۔ نہ ہی ان میں کوئی باس ہے۔ جیسے میں خود۔" اس کی نظریں گھاس کے اس قطعے پر رکیں جس کی گھاس تازہ تازہ ترشی گئی تھی۔

"میں خود بھی تو بنیادوں اکھڑا بندہ ہوں۔ مولی جی کو تو خود ے (شاید) خبر ہو کہ ان کی بنیاد کدھر ہے' مجھ کو تو یہ بھی نہیں پتا۔" مالی اب جھاڑو سے گھاس میں رہ جانے والے کٹے پھونس اور تنکے اکٹھے کر رہا تھا۔

"ویکھا! (دیکھا) یوں ہونجے (اکٹھے کر کے پھینکے) جاتے ہیں بنیادوں اکھڑے لوگ۔" اس کو خیال آیا۔ "یا فیر ساری زندگی ہوا دے نال کبھی ایدھر' کبھی اودھر (ادھر ادھر) اڈدے (اڑتے) پھرتے ہیں۔ مولی جی کی طرح اور کدی کوئی اللہ دا پیارا بندہ چھتر (چھاؤں) ڈال دیندا ہے ان پر... جیسے میں... پر ہوندا تو بنیادوں اکھڑا ہی نا۔"

"اور اس نوں ویکھو۔" اس نے گھاس کے صاف ستھرے قطعے کو دیکھا۔ "اینج لگدا جیسے شہر دا کوئی باؤ حمام سے نویں نویں شیو کرا کے آیا ہو۔"

شاید اس نے لاشعوری طور پر خود کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی وقت ایک خاتون نے گھر کے باہر سے گیٹ کے اندر سر گھسا کر جھانکا۔ سگریٹ کے کش لگاتا چوکیدار ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"ماہ نور گھر پر ہے؟" سفید بالوں اور گوری رنگت والی اس خاتون نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بیگم صاحب! ماہ نور بی بی آج شیخوپورہ گئی ہیں اپنے کام سے۔" چوکیدار نے مودب انداز میں کہا۔

"اور فائزہ؟" خاتون نے کہا۔

"وہ ابھی کالج سے واپس نہیں آئیں۔"

"اچھا!" خاتون نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

"آپ آؤ بیگم صاحب! گاؤں والے مہمان ادھر ہی ہیں۔" چوکیدار نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔ کھاری نے دلچسپی سے خاتون کی طرف دیکھا۔ سفید شلوار پر سرمئی پھولوں والی سفید قمیص پہنے' دوپٹا گلے میں ڈالے' سفید سفید پیروں میں دوپٹی کی چپل پہنے' سفید و گلابی نرم ہاتھوں والی وہ خاتون کھاری کو ایک دم سے بہت بھا گئیں۔

"نہیں بھئی! میں چلتی ہوں۔ ماہ نور آئے تو اس سے کہنا! خدیجہ خالہ پیار دے رہی تھیں۔" انہوں نے کہا اور واپس مڑ کر خود سے کچھ فاصلے پر کھڑی اپنی جیسی خود سے عمر میں تھوڑی کم دوسری خاتون سے کچھ کہنے لگیں۔

"واہ بھئی! شہر کی تو مائیاں بھی انگریزی بولتی ہیں۔" کھاری نے سوچا اور اس خاتون سے مرعوب ہوا۔

"آج شام کی ڈیوٹی پوری کر کے چلیں گے لبرٹی۔ انڈا برگر کھائیں گے۔" چوکیدار نے کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھا لیا انڈا برگر میں نے... یار! تسی لوگ کیسے کھانے کھاتے ہو؟" کھاری نے جواب دیا۔ "روٹیوں پر سبزیاں تے پنیر سجا کر دکان والے' ہوٹل والے شہر کے لوگوں کے سامنے رکھیں تو دو' دو ہزار کی وہ روٹیاں راضی خوشی لیتے ہیں اور انگریزی بولتے ایک ایک برکی (لقمے) گاجروں' کھیروں' ٹماٹروں کے سلاد میں مسالے ملا کر بیچنے والوں سے پنج پنج سو روپے کے ڈبے خریدتے ہو اور کہتے ہو سلاد کھا کے پیٹ بھر گیا۔ بلے بھئی بلے! تہاڈیاں

خوراکاں مجھے اور کوئی چیز نہ کھلانے لے کر جانا' میرا تو منہ دا ذائقہ بھی خراب ہو گیا' جب سے ادھر آیا ہوں۔"

چوکیدار نے زور سے قہقہہ لگایا اور تمسخر اڑانے والے انداز میں بولا۔

"پر اسے کہتے ہیں اس کو کھاری صاحب اور شہر میں جو سلاد والے ہوٹل ہوتے ہیں وہ پتا نہیں کتنی مہنگی چیزیں ڈالتے ہیں سلاد میں' جب جا کر اتنا مہنگا بکتا ہے۔"

"مجھے کیا بتا رہے ہو' پرا تے سلاد۔" کھاری نے ہاتھ ہلایا۔ "ہمارے چوہدری صاحب کے مہمانوں کے لیے ایسی ساری چیزیں شہر سے جاتی ہیں۔ ادھر خانسامے بشیر کو بھی آتا ہے سارا کچھ بنانا۔ ادھر کیا کچن ہے جو کچن ہمارے فارم ہاؤس کا ہے۔ میں ہر شے کا نام جانتا ہوں' پر ذائقہ نہیں چکھا کبھی۔ ایس واسطے کہ ادھر چکھوں تو چوری ہوتی ہے۔ پر ادھر تو چوہدرائن نے دھکے نال ساریاں ایسیاں چیزاں کھلائی' جو بچ جاتا ہے پلیٹ کے لے آتی ہیں' کھاری کھا لے گا' رضیہ کھا لے گی' نا بھائی!" اس نے ہاتھ ہلایا۔ "بڑی ہو گئی ہمارے ساتھ اب تو ہم گھر میں جو ہانڈی پکتی ہے' وہ ہی کھائیں گے۔"

"زیتون کے تیل میں پکواتی ہیں بیگم صاحب!" چوکیدار نے اسے ڈرایا۔

"کھاری نے منہ بناتے ہوئے چوکیدار کو دیکھا۔ "کوئی بات نہیں۔"

"چھان میں آٹا ملا کر روٹی پکواتی ہیں۔ چھان زیادہ آٹا کم ہوتا ہے۔"

"اوئے ہوئے! ان کو تو پھر شوکر (شوگر) ہو گی۔" کھاری نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے نہیں پتا۔" چوکیدار نے کہا۔ "پر اپنا مجھے پتا ہے' میں ادھر کی روٹی' سالن نہیں کھا سکتا۔"

"تہانوں بھنڈیاں' کریلے' پالک' کدو' ٹینڈے اچھے لگتے ہیں' دیسی گھیو (دیسی گھی) میں پکے ہوئے؟" کھاری نے پوچھا۔ چوکیدار نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بس پھر تو میرے پاس فارم ہاؤس ضرور آنا' میں تہانوں سب کچھ کھلاؤں گا۔" کھاری نے ان مانوس ذائقوں کو تصور میں زبان پر محسوس کر کے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ چوکیدار کھاری کے بھولپن اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے کی عادت پر اکثر ہنسا کرتا تھا۔

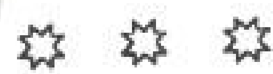
"چل پھر تجھے جھولوں پر لے کر جاتا ہوں جلو پارک کے۔" اس نے ہنستے ہوئے کھاری کو چھیڑا۔

"نہ بابا!" کھاری نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "دیکھ لے سارے جھولے' سارے پارک' سارے ہوٹل' ساری دکانیں' اب تو بھائی ہم نے واپس جانا ہے' دل اودھر (اداس) گیا ہے۔ اب واپس چلیے۔"

"ابھی تو نہیں جانا بڑی بی بی نے۔" چوکیدار نے اسے ڈرایا۔ "ابھی تو چوہدری صاحب کے ماموں کے بیٹے کی بیٹی کی شادی اٹینڈ کرنی ہے انہوں نے' پھر جائیں گی واپس۔"

"میں تے فیر چلے جانا۔" کھاری نے سر جھٹک کر کہا۔ "میرے سبق بھی پیچھے پے گئے ہیں۔ اب میں نے اور نہیں رہنا۔ ڈرائیور پرسوں آیا تھا نا۔ کہہ رہا تھا تین بھینسیں بیمار ہو گئی ہیں۔ پٹھوں (چارے) کو منہ نہیں لگاتیں میرے بغیر۔ میں' ہن چوہدری صاب کو کہہ دینا مجھے لے جائیں ساتھ' جب وہ آئیں گے ادھر۔"

چوکیدار کھاری کی ناراضی اور گھبراہٹ دیکھ کر پھر سے ہنسنے لگا۔



اس نے صاف نیلے آسمان پر اڑتے پرندوں کی طرف دیکھا۔ شام ہونے پر پرندے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ پرندوں کی اس اڑان میں بھی ایک خاص ترتیب تھی۔ ایک پرندہ سب سے آگے' پھر تین تین کی دو قطاریں اور آخر میں پھر ایک پرندہ۔ اسے یہ ترتیب دلچسپ محسوس ہوئی۔

"اللہ میاں نے پرندوں کو بھی یہ سمجھ دی ہوئی ہے کہ شام ہوجائے تو گھروں کو واپس جانا ہے۔" اس نے سوچا۔
"دن بھر یہ کہاں رہتے ہیں اور اگر یہ اپنے بچوں کے لیے خوراک اکٹھی کرکے لوٹتے ہیں تو وہ خوراک کہاں چھپاتے ہیں۔ واپسی پر ان کے پر کھلے ہوتے ہیں اور دوسری تو کوئی جگہ نظر نہیں آتی جہاں خوراک رکھی جاسکے۔"
اس نے ایک ایسی بات سوچی جس کا جواب اس کے ذہن نے اسے نہیں دیا۔ "پتا نہیں۔" اس نے خود کو بتایا اور چھت کی منڈیر سے ذرا سر نکال کر نیچے دیکھا۔ دور، دور تک کھیتوں میں تیار گندم کی سنہری بالیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ غروب ہوتے سورج کی آخری کمزور شعاعیں ان تک پہنچ کر انہیں نمایاں کر رہی تھیں اور واقعی یوں لگ رہا تھا جیسے ہر سو سونا بکھرا ہوا ہے۔"

اس نے کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں کو دیکھا، جو تیار فصلوں کو دیکھ دیکھ کر یقیناً "خوش" تھے۔ پچھلے کئی مہینوں کی محنت رنگ لائے کھڑی تھی، لیکن ابھی اس فصل کو روپوں میں بدلنے تک کئی مرحلے باقی تھے۔ فصل کی کٹائی، گندم کی صفائی، باردانے کا حصول اور پھر منڈی تک اس کی ترسیل، آڑھتیوں سے سر کھپائی، پھر کہیں جاکر جنس کو نقد میں بدلنا تھا اور اس نقد کو آرزوؤں اور ضرورتوں کی خریداری میں صرف ہونا تھا۔
"ہر بندہ اپنا اپنا کام کرتا ہی سجتا ہے۔" اس نے نیچے کھڑے کسی شخص کا دھیان خود پر پڑتے محسوس کرکے سر نیچے کرلیا۔

"اب جو کام اباجی کرتے ہیں، وہ بھی کوئی اور نہیں کرسکتا۔" اسے نہ جانے کیوں اپنے باپ کا خیال آیا۔ جسے ہمیشہ اس نے تازہ وضو کرتے، پاک صاف لباس پہن کر مسجد کی خدمت میں مصروف دیکھا تھا۔ وہ مسجد کی صفائی بھی خود کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ صفیں سیدھی کرکے بچھاتے تھے، لوگوں کو نماز کی طرف بلانے کے لیے پانچ وقت اذان دیتے تھے۔ اور پھر اپنے پیچھے کھڑے نمازیوں کی تعداد کی پروا کیے بغیر امامت پر کھڑے ہوجاتے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد صبح، شام لوگوں کے بچوں کو قرآن پاک پڑھنا سکھاتے۔ برسوں سے ایک سا معمول، ایک سے دن رات۔
اباجی بیمار پڑتے تو بھی اپنا فرض پورا کرتے، چاہے اسے پورا کرنے کے بعد اگلی اذان تک چارپائی پر پڑے بے چینی سے کروٹیں بدلتے وقت گزارنا پڑتا، لیکن اگلی نماز کے وقت پھر سے کھڑے ہوجاتے۔ اباجی کو اس معمول کے علاوہ اس نے کبھی کسی دوسرے کام میں مشغول نہیں دیکھا تھا۔
"کیا یہ کام ہے؟" اس نے سوچا۔ "کیا یہ ذریعہ روزگار ہے؟" ایک اور سوال۔ "اس میں ہاتھوں کی محنت تو شامل نہیں اور شاید جسم کی مشقت بھی نہیں ہے، پھر یہ کیسا کام ہے، جس کی تنخواہ بھی ملتی ہے اور جب سے اس گاؤں میں آئے تھے اس کے عوض کئی دوسری سہولتیں بھی ملی تھیں۔"
سعدیہ کلثوم کا ذہن اب کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا تھا جن سے اسے خود بھی پتا چلتا تھا کہ وہ اب ایک لاپروا، بے نیاز اور کھلنڈری بچی نہیں رہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے ذہن میں آئے یہ سوال کسی سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔ گھر میں اسے سوالوں کے جواب لینے کے لیے اماں میسر تھیں اور گھر سے باہر مس۔ مگر اس نے محسوس کیا تھا کہ اماں اس کے سوالوں سے تنگ بھی ہوتی تھیں اور جھڑکیاں بھی دیتی تھیں۔ ان کے خیال میں سعدیہ کو اپنی پڑھائی کے سوا کسی بات سے غرض نہیں ہونی چاہیے تھی اور مس سے وہ سلیبس میں شامل کتابوں کے متعلق سوال تو کرسکتی تھی، مگر یہ سوال کرنے میں جھجک آڑے آجاتی۔ اسے مس سے ڈر لگتا تھا اور اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے اپنی ہنسی اڑانے کا بھی خیال رہتا تھا۔
رہے اباجی تو ایک تو وہ کم گو تھے، دوسرا گھر میں اباجی اور گھر سے باہر مولوی صاحب تھے۔ دونوں درجے بہت بلند تھے۔ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے اور سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اوپر سے وہ ذرا، ذرا سی بات پر سخت پکڑ

ہوجانے کی سنائونیاں گھر کے اندر بھی دیتے تھے اور مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر خطبے کے دوران ہوا کی لہروں کے دوش پر بکھرتی ان کی آواز بھی یہی کام کر رہی ہوتی تھی۔ ایک انجان طاقت کی پکڑ کا خوف سعدیہ کے لاشعور میں سختی سے جاگزیں ہوچکا تھا۔ جب ہی تو وہ اپنی حدود سے باہر نکلنے کا تصور نہیں کرسکتی تھی اور ذہن میں اٹھتے سوالوں کو وہ حدود سے نکل جانے کے خیال سے ذہن و دل میں ہی چھپائے رکھتی تھی، مگر نہ جانے کیوں ایسا کرنے سے اس کے ذہن و دل ہر روز ایک نئے بوجھل پن کا شکار ہوتے چلے جارہے تھے۔ اپنی محدود زندگی سے پار کی چیزیں اسے متاثر کرتیں۔ دعوت نظارہ دیتیں اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کو سماعت بے چین محسوس ہوتیں، مگر اس کا سر نفی میں ہل جاتا اور زبان "ہائے گناہ ہوگا" کا راگ الاپتی رہتی۔
"مگر یہ گناہ اور ثواب کا چکر کیا ہے۔" وہ یہ سوال بھی پوچھنا چاہتی تھی۔ "انسان کی حدود کیا ہیں، گناہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور ثواب کا منبع کیا ہے۔" مگر اسے ان سوالوں کا جواب نہ اس کا اپنا ذہن دے پاتا تھا، نہ اس کی کتابیں اور تیسرا کوئی ذریعہ نہ تھا۔

"ہم نے کل اجے دیوگن کی فلم دیکھی۔ ہائے کیا غضب کی اداکاری کرتا ہے۔"
"اجے دیوگن تو کچھ بھی نہیں، شاہ رخ کے آگے کوئی اور ہیرو مجھے نہیں اچھا لگتا۔"
"عامر خان سے شاہ رخ کا کیا مقابلہ۔ اس کی فلموں کا تو میری امی بھی انتظار کرتی ہیں۔ ہمارا کیبل والا بھی بڑا اچھا ہے، امی اسے فون کرکے کہیں کہ عامر خان کی فلم لگادو تو اسی دن لگا دیتا ہے۔"
"انڈیا کے اداکاروں سے اچھا تو ہمایوں سعید ہے، ہائے کتنا اسمارٹ اور ہینڈسم ہے۔ میرا جو کزن ہے نا مجتبیٰ اس کی شکل ہمایوں سعید سے ملتی ہے۔"
"تمہارے ہمسایوں کا بیٹا شان سے ملا تھا، اس کے ساتھ تصویر کھنچوا کر آیا تھا۔"
"ہمسایوں کا بیٹا، وہی والا نا، جس کی بہن تمہاری سہیلی ہے اور تمہیں رقعے بھی لکھتی ہے۔"
"چلو بکواس نہ کرو۔ وہ کیوں مجھے رقعے لکھے گی؟"
"چلو وہ نہ سہی، اس کا بھائی لکھتا ہوگا۔"
قہقہے، مسکراہٹیں، ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی آوازیں۔
سارا دن وہ اسکول میں اسی قسم کی باتیں اور سرگوشیاں اپنے اردگرد سنتی۔ جن لوگوں کا اس گفتگو میں ذکر ہوتا تھا وہ ان کے چہروں سے واقف نہیں تھی، مگر ان کے ناموں سے اس کے کان اس لیے مانوس ہوچکے تھے، کیونکہ وہ کثرت سے اس کے اردگرد لیے جاتے تھے۔ اسکول سے چھٹی کے بعد تانگے میں بیٹھ کر تانگے کی باقی لڑکیوں کے انتظار کے دوران اس کی آنکھیں کئی نظارے کرتیں۔ گول گپوں، چاٹ، قلفی، چورن، مکئی کے دانوں، نان، ٹکی، آلو کے چپس والوں کی ریڑھیوں کے قریب کھڑے لڑکوں اور اسکول سے نکلنے والی لڑکیوں کے درمیان نظروں، مسکراہٹوں اور سرگوشیوں کے تبادلے۔ ایک مٹھی سے دوسری مٹھی میں منتقل ہونے والے رقعوں کے تبادلے۔ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر گھر جاتی لڑکیوں کے بارے میں دوسری لڑکیوں کے قیافے۔
"یہ اس کا بھائی تو نہیں، کزن ہے۔"
"یہ اس کا کچھ نہیں لگتا، بے شرم اس کے ساتھ کہیں گھومنے گئی ہے۔"
"اس کے ماما، پاپا کو پتا نہیں چلتا۔"
"گھر میں کہتی ہے پریکٹیکل ہو رہے ہیں، مس دیر سے چھٹی دیتی ہیں۔"
"وہ جو ویڈیو والے کی دکان کے آگے کھڑی ہے، اس کا ویڈیو والے لڑکے سے چکر ہے۔"
"اس کے گھر میں کمپیوٹر بھی ہے اور اس کے پاس موبائل فون بھی ہے۔"

"یہ ساری بہنیں ہی ایسی ہیں' اس کی بہن رکشے والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی دو سال پہلے۔"

اس کے اردگرد گفتگو جاری رہتی اور سعدیہ دنیا کے رنگ ڈھنگ سے واقفیت حاصل کرتی جاتی۔ اس کے سامنے دو راہیں ہوتیں یا تو اس گفتگو سے متعلق اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کا حصہ بن جائے یا اپنے گناہ' ثواب کے سبق دل میں دہراتی رہے۔ مگر وہ ان دونوں راستوں کے درمیان کھڑی خود کو تنہا پاتی۔ اس کے قدم دونوں طرف باری باری اٹھتے اور پھر انکار میں ہلتے سر کے اشارے پر واپس اپنی جگہ پر آجاتے۔

چوہدری سردار نے جو فارم ب سعدیہ کو اپنے اثر و رسوخ سے بنوا کر دیا تھا' اس میں اس کے نویں جماعت کی طالبہ ہونے کے حساب سے اندازاً" اس کی عمر چودہ سال لکھوائی تھی۔ چوہدری صاحب نہیں جانتے تھے کہ آپا رابعہ نے سعدیہ کو ساڑھے آٹھ سال کی عمر میں پہلی بار اسکول میں داخل کروایا تھا اور قصبے سے گاؤں تبادلے اور یہاں آکر دوبارہ اسکول میں داخلے کے دوران اس کا ایک سال مارا بھی گیا تھا۔

سعدیہ کی سوچیں اس کی اصلی عمر کے مطابق پروان چڑھ رہی تھیں۔ اس کے مخمصے اور الجھنیں عمر کا تقاضا تھیں' مگر آپا رابعہ بھی اسے نویں جماعت کی چودہ سالہ بچی ہی سمجھ کر اس سے ویسا ہی برتاؤ رکھتی تھیں جیسا ان کے خیال میں اس عمر کی بچیوں سے رکھنا چاہیے تھا۔

"میرے ساتھ کی لڑکیوں نے چاہے کچھ بھی دیکھ رکھا ہو' فارم ہاؤس تو صرف میں نے ہی دیکھا ہے نا!" اپنے ذہن میں اٹھتے سوالوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے سعدیہ کو تصور کی ایک ہی پناہ گاہ میسر تھی' سو وہ اس میں پناہ لے لیتی اور اس فارم ہاؤس کا کمرہ کمرہ دوبارہ سے گھومتی۔

"ہائے ہائے۔ شام پڑگئی اور فزکس کا سبق ابھی یاد کرنا ہے۔"

اس شام بھی وہ پڑھتے پڑھتے پہلے اپنے سوالوں میں کھوئی اور پھر ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے فارم ہاؤس کی یادوں میں۔ جب فضا میں ابھرتی مغرب کی نماز کے لیے ابا جی کی اذان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اس نے چونک کر اپنے اردگرد بکھری کتابیں سمیٹنا شروع کردیں۔

☼ ☼ ☼

"میں کئی دن سے تم سے کہہ رہی ہوں نور کی شادی میں پہننے کے لیے اپنے ڈریس فائنل کرلو' جو کوئی کمی بیشی ہے اس کو چیک کرو' جیولری دیکھو اپنی۔ میچنگ شوز ہیں یا نہیں' وہ بھی دیکھ لو۔" فائزہ نے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی ماہ نور سے کہا۔

"آخر یہ فیملی کا ایک بڑا ایونٹ ہے اور شہر کی کریم اس میں شرکت کرے گی۔ ماہ نور! ابھی تو اپنی لاپروائیوں اور بچکانہ پن سے نکل کر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرلیا کرو۔" اپنی بات کے جواب میں ماہ نور کی خاموشی فائزہ کو تاؤ دلا گئی۔

"آپ کو پتا بھی ہے کہ میں کتنی مصروف ہوں آج کل! مجھے چار کمپینز تیار کرنی ہیں اور ان کے لیے روزانہ اتنی خواری ہو رہی ہے کہ مجھے دن کا پتا ہے' نہ رات کا ہوش ہے۔" ماہ نور نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم شادی کا کوئی فنکشن مس نہیں کرسکتیں۔" فائزہ نے تنبیہہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "نور تمہاری اچھی فرینڈ ہے۔ افتخار بھائی اور سائرہ بھابھی تم سے اتنا پیار کرتے ہیں' اس لیے اس سلسلے میں کوئی بہانا نہیں چلے گا۔"

"وہ تو میں کرلوں گی۔" ماہ نور نے الجھتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ اتنی اچھی ڈیزائنر ہیں پلیز ممی! یہ کپڑے' جوتے میچنگ وچنگ آپ دیکھ لیں' میرے پاس واقعی ٹائم نہیں ہے۔"

شکل دیکھی ہے اپنی۔" فائزہ کی نظریں اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔ "کتنے دن ہوگئے تمہیں آئی برو' شیپ کرائے' کب سے کلینزنگ نہیں کی تم نے' مینی اور پیڈی کیورنگ کے لیے کب گئی تھیں آخری بار' اپنے بال دیکھو' کیسے رف ہو رہے ہیں ماہ نور! کیا تمہارے ساتھ کی لڑکیاں پڑھائی نہیں کررہیں' انہیں کمپینز اور اسائنمنٹس کے لیے خوار نہیں ہونا پڑتا۔ میں نے کسی اور کو اتنا حلیے سے بے حلیہ ہوتے نہیں دیکھا جیسے تم ہو رہی ہو۔" فائزہ کو اب پر غصہ آنے لگا تھا۔

"سب ہی آج کل ایسے ہو رہے ہیں ممی! آپ کو کیا پتا کتنا کام ہے۔" ماہ نور نے بکھرے بال لپیٹ کر ان میں کیچر اٹکاتے ہوئے کہا اور اپنے ہاتھوں کو نظروں کے سامنے پھیلا کر دیکھنے لگی۔ ناخنوں کے گرد کیوٹیکلز جمع ہو رہے تھے اور ناخن بھی تراشنے والے ہو رہے تھے۔ اس نے کن اکھیوں سے فائزہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ سمیٹ کر گود میں رکھ لیے۔

"کوئی اور اس طرح نہیں ہو رہا۔" فائزہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس روز شاہ بانو آئی تھی نا تمہیں لینے کے لیے' وہ تو پوری طرح ٹپ ٹاپ میں تھی۔ مصباح بھی ملی تھی مجھے لبرٹی میں۔ ایک دم فریش تھی۔ صوفیہ سے کل میری بات ہوئی' بتا رہی تھی ماریہ سیلون گئی ہوئی تھی۔" انہوں نے ماہ نور کی چند قریبی دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "ایک تم پر ہی اسائنمنٹس اور کام کی کوئی قیامت آگئی ہے' جو چمگادڑوں جیسی شکل بنائے پھرتی ہو۔ صبح صابرہ بھابھی بھی کہہ رہی تھیں کہ ماہ نور کا خیال رکھا کرو' وہ نہ ڈھنگ سے کھاتی ہے' نہ پوری نیند سوتی ہے۔"

"انہیں کیا پتا' سوتی ہوں یا نہیں۔" ماہ نور نے جھنجلا کر کہا۔

"یہ ساتھ والے کمرے میں رہ رہی ہیں وہ۔" فائزہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ساری رات تمہارے کمرے کی لائٹ جلتی رہتی ہے اور جب تمہیں وہ دیکھنے آئیں تو کانوں میں یہ لعنت ٹھونسے تم جاگتی ملتی ہو یا نہیں۔" فائزہ نے ماہ نور کے قریب دھرے ہیڈ فونز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یا تمہارا ٹیپ روشن ہوتا ہے یا لیپ ٹاپ کی اسکرین۔ وہ کہہ رہی تھیں کان' آنکھیں سب رہ جاتی ہیں اس لڑکی کی۔"

ماہ نور نے جھنجلا کر سر جھٹکا اور اپنا دھیان دوسری طرف کرلیا۔

"بس آپ سے میں نے کہا نا' میں نور کی شادی ضرور اٹینڈ کروں گی' صرف کپڑے وغیرہ آپ دیکھ لیں۔" کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر فائزہ کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس ویک اینڈ پر تم ماہین کی طرف چلوگی میرے ساتھ۔" فائزہ نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی ضرور چلوں گی۔" ماہ نور نے کپڑوں' جوتوں کے جنجال سے بچ جانے کا اشارہ پاکر شکر ادا کرتے ہوئے فوراً" رضامندی ظاہر کی۔

فائزہ کچھ دیر کمرے میں کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہیں اور پھر باہر چلی گئیں۔ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کبھی کبھار وہ ایسا سخت رویہ رکھا کرتی تھیں جو ان کے خیال میں ضروری تھا۔

"شکر ہے۔" فائزہ کے چلے جانے کے بعد ماہ نور نے دل میں کہا اور ہاتھ میں پکڑے ٹیپ کی اسکرین روشن کی' سید پور میوزک فیسٹول میں سعد سلطان رائی حانہ کا گانا گا رہا تھا۔

" We found love in a hopeless place "

اس نے گانے کے الفاظ سنے اور لاشعوری طور پر اپنے فون کی اسکرین پر انگلی پھیرتے ہوئے سعد کا نمبر نہ جانے کتنویں بار ملایا' اس کا دل مایوس تھا اور کان اس آواز کے منتظر تھے۔

"ہم معذرت خواہ ہیں' آپ کا ملایا ہوا نمبر فی الحال بند ہے۔ برائے مہربانی کچھ دیر بعد دوبارہ کوشش کیجیے۔"

اس نے گزشتہ کئی دنوں میں یہ آواز دن میں اور رات بھر کے دوران نہ جانے کتنی بار سنی تھی۔ مگر اس وقت

اس کے کانوں کو اچانک اس آواز کے بجائے کچھ اور سننے کو مل رہا تھا۔ اس کے ملائے ہوئے نمبر پر بیل جا رہی تھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور پورے جسم کا خون جیسے ہڑبڑا کر اتنا تیز اوپر سے نیچے پمپ ہوا کہ اس کے دوڑنے کا احساس اس کے دماغ نے شدت سے محسوس کیا۔ ایک' دو' تین' چوتھی بیل پر دوسری جانب سے فون ریسیو کرلیا گیا۔

"السلام علیکم ماہ نور! کیا حال ہے؟" وہ مانوس آواز' وہ نرم لہجہ' ماہ نور کو اپنے اردگرد جیسے ستارے اترتے اور پھیلتے محسوس ہونے لگے۔ اسے اپنی سماعت اور حسیات پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"میں نے انتہائی مایوسی کی کیفیت میں تمہارا نمبر ملایا تھا۔"

اس کی زبان یہ بات کہتے کہتے کیسے رکی' یہ اسے خود بھی سمجھ نہیں آیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں' تم کیسے ہو؟" اس نے خود کو ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھتے ہوئے سنا۔

"میں ایک دم فٹ ہوں۔" دوسری جانب سے جواب آیا۔

"تمہارا نمبر آف مل رہا تھا؟" ماہ نور نے کہا۔

"اوہ ہاں!" دوسری جانب سے ہنس کر کہا گیا۔ "میں پاکستان میں نہیں تھا۔ کیوں کیا تم نے کال کیا تھا؟"

ماہ نور نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ "ہاں ایک آدھ بار کال کی تھی' سوچا تمہیں یاد دلا دوں' تم نے ایک وعدہ کیا تھا۔"

"وعدہ!" دوسری جانب سے کچھ سوچتے ہوئے کہا گیا۔

"تم نے مجھے سونگ کا لنک بھیجنا تھا۔" ماہ نور کا دل چاہ رہا تھا اپنا سر پیٹ لے' مگر اس نے پھر ایک ایسی بات کردی تھی جس پر بعد میں اسے خود پر شدید غصہ آیا تھا۔ دوسری جانب سے اتنی بے نیازی کا مظاہرہ ہو رہا تھا اور وہ پچھلے کتنے عرصے سے پاگلوں کی سی زندگی گزار رہی تھی۔

"تمہیں ملا نہیں؟" سعد کی آواز آئی۔ "آئی مین' لنک تو بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔"

"ڈھونڈنے سے سب کچھ مل جاتا ہے' مگر تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے وہ لنک بھیجو گے۔" ماہ نور کا دل چاہا سعد کا سر پھاڑ دے۔ "وعدہ تو وعدہ ہوتا ہے۔"

"اوہ! میں سخت معذرت خواہ ہوں۔ ابھی بھیجتا ہوں۔"

ماہ نور کا دل چاہ منع کردے' مگر اس کی زبان نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

"تم یہ بتاؤ کیسی ہو' آج کل کیا ہو رہا ہے؟" دوسری جانب سے بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

"میں آج کل اتنی مصروف ہوں کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں۔" ماہ نور نے پہلی بار رکھائی کا مظاہرہ کیا۔

"ارے پھر تو تمہارے سر کی جوئیں بھی مزے میں ہوں گی۔" سعد نے برجستگی کا مظاہرہ کیا۔

"سارہ خان کا کیا حال ہے۔" ماہ نور نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ اسے محسوس ہوا' اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

"ابھی میں اس کے پاس جا نہیں سکا' نہ ہی فون کرسکا ہوں' ٹھیک ہی ہوگی۔" ماہ نور کے دل میں خوشی کی ایک جوت نے ہلکی سی روشنی دی۔

"ماہ نور! میں چاہتا تھا کہ میں تمہیں بتا کر جاؤں کہ میں کہیں جا رہا ہوں' لیکن نہ جانے مجھے یہ خیال کیوں آیا کہ یہاں سے جانے کے بعد تم مجھے بھول نہ گئی ہو' میں نے سوچا' مجھ سے متعلق یہ بات تمہارے لیے کتنی عام سی ہوگی۔" ماہ نور کے دل میں جلنے والی جوت کی پہلی لو کو کچھ اور منور کیا۔

"میں کہیں جا رہا ہوں یا کہیں سے آرہا ہوں' تمہاری زندگی میں اس بات کی کیا اہمیت ہوگی' میں نے اس لیے تمہیں نہیں بتایا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"لیکن اب میں سوچ رہا ہوں میں نے غلط کیا۔" "تم نے مجھے کال کیا' تم لنک ملنے کے انتظار میں تھیں۔ شاید میں تمہیں جتا نہ سکوں' یہ دو خبریں میرے لیے کتنی اہم ہیں۔"

ماہ نور نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

"میرا نمبر بند ملنے پر تمہیں مایوسی ہوئی ہوگی اور تم نے سوچا ہوگا کہ اسلام آباد میں جو وقت ہم نے گزارا' وہ بھی میرا ایک اور بہروپ تھا۔"

ماہ نور نے سر جھکا لیا۔

"مجھے ان باتوں کا ابھی شدت سے احساس ہو رہا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"مگر میں نے تمہیں بتایا تھا نا شاید مجھے اپنے احساسات کو بیان کرنا نہیں آتا' میں نے تمہیں مایوس کیا نا؟"

"نن..... نہیں۔" ماہ نور نے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔"

"میں اس ٹرپ کے بارے میں کلفت کا شکار تھا' جو چیزیں مجھ پر ٹھونس دی جائیں' اکثر میں ان پر رد عمل ظاہر نہیں کررہا ہوتا' مگر میرا رد عمل کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہو رہا ہوتا ہے۔ جب ہی میں نے کسی کو نہیں بتایا اور خاموشی سے چلا گیا۔"

"ابراہیم کو تو پتا تھا۔" ماہ نور کے منہ سے ایک اور ایسی بات نکلی جو وہ بالکل بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"ابراہیم!" وہ چونکا۔ "ابراہیم تمہیں ملا تھا؟"

"نہیں۔" اب ماہ نور کو اس سوال کا جواب دینا ہی تھا۔ "میں نے اس کو کال کرکے تمہارا پوچھا تھا؟"

"ارے تمہارے پاس ابراہیم کا نمبر موجود تھا؟" وہ حیران ہوا۔

"نہیں۔" ماہ نور نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں نے اس کے ریستوران کے پیج سے اس کا نمبر لیا تھا۔"

"تمہیں اس سے کچھ کام تھا؟"

"مجھے اس سے کیا کام ہونا تھا۔ میں نے اس سے تمہارا ہی پوچھا تھا' کیونکہ تمہاری کال نہیں مل رہی تھی۔"

"اوہ!" سعد کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا' وہ مسکرا رہا تھا۔

"میں نے تمہیں الجھن میں ڈال دیا' میں واقعی معذرت خواہ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" ماہ نور نے نیچی آواز میں کہا۔

"ایک بات کہوں ماہ نور؟" وہ کچھ توقف سے اس نے پوچھا۔

"ہاں کہو۔"

"میں نے بہت بار تمہیں مس کیا۔" ماہ نور کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور روشنی کی پہلی جوت نے اڑ کر گل ہوچکی قندیلوں کو یکے بعد دیگرے ایک پل میں روشن کردیا۔

"بہت سی جگہوں اور بہت سے موقعوں پر۔"

"کچھ چیزیں اور جگہیں دیکھ کر' کچھ لوگوں سے ملتے ہوئے جو خیال ہمارے ذہن میں آتے ہیں' وہ ہم ہر کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرسکتے۔ ایسے ہی کچھ موقعوں پر مجھے تم یاد آئیں اور میں نے سوچا' جو خیال میرے ذہن میں آرہا ہے' وہ تم ہوتیں تو ضرور سمجھ جاتیں۔"

ماہ نور کچھ کہنا چاہ رہی تھی' مگر اس سے بولا نہیں گیا۔

"کیا ہوا' سو تو نہیں گئیں؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

"ہیلو! کیا تم دوسری جانب موجود ہو؟" ماہ نور کی مسلسل خاموشی پر اس نے دوبارہ پوچھا۔

"ہوں!" ماہ نور چونکی۔ "میں ہوں، تم بولو پلیز۔"

"او اچھا۔" وہ ہنسا۔ "میں نے سوچا شاید میری باتیں اتنی غیر دلچسپ ہیں کہ تم سو گئیں۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں انجوائے کر رہی ہوں۔" ماہ نور نے سچائی کا مظاہرہ کیا۔

"تم بہت اچھی ہو۔ بے ریا اور بے ساختہ۔" وہ بولا۔ "لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

ماہ نور کا دل بلیوں کی طرح چھلانگیں مارنے لگا تھا۔

"ایک آدھ ہفتے میں میرا لاہور آنے کا پروگرام ہے۔ تم سے ملاقات ہو سکے گی؟" ایک اور خبر ماہ نور کو بیڈ سے اٹھ کر رقص کرانے کے لیے کافی تھی۔

"ارے ہاں پلیز' ضرور ملنا۔" دنوں کے بعد ماہ نور اپنی جون میں واپس آئی تھی۔ "میں تمہیں اپنے گھر والوں سے ملاؤں گی اور خدیجہ خالہ سے بھی اور فاطمہ خالہ سے بھی۔" وہ پُر مسرت انداز میں بولتی چلی جا رہی تھی۔ "اور اگر تم ایک ہفتے کے اندر آسکتے ہو تو کھاری سے بھی' پتا ہے کھاری آج کل ادھر آیا ہوا ہے ہمارے گھر' کھاری!"

اس نے سعد کے پوچھے بغیر ہی اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"وہی کھاری جو تمہیں بلا کر لایا تھا کہ مجھے بندر کا تماشا دکھاؤ' جس کے خیال میں تمہارے بندر کی ایک آنکھ چھوٹی تھی اور بندریا لنگڑی تھی۔" وہ جوش میں آکر نہ جانے کیا کیا بولے چلی جا رہی تھی۔

"ہاں' ہاں ضرور۔" سعد اس کی باتوں پر مسکرا رہا تھا۔ "تم مجھے اپنی آئی ڈی بھیجو' میں تمہیں لنک بھجواتا ہوں اور کچھ اور چیزیں بھی۔"

"رہنے دو۔" ماہ نور نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "وہ وعدہ ہی کیا جو یاد دلانا پڑے۔"

"میں نے کہا نا میں معذرت خواہ ہوں' پلیز یہ غلطی درگزر کر دو' میں تمہیں ایک کے بجائے اچھے گانوں کے دس لنکس بھجواتا ہوں جرمانے کے طور پر۔"

ماہ نور دل سے مسکرائی۔ "میں ابھی بھیجتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"جلدی پلیز' بھول نہ جانا۔"

"ہاں ہاں ابھی۔"

"اوکے' پھر اللہ حافظ' اپنا خیال رکھنا۔"

"ٹھیک ہے۔" ماہ نور نے جواب دیا اور دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔ ماہ نور فون ہاتھ میں لیے ہونٹ دانتوں تلے دبائے اپنی جگہ پر بیٹھی تھی' اس کے کمرے میں نیم اندھیرا چھا رہا تھا مگر اسے لگ رہا تھا ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ کمرے میں موجود قالین' فرنیچر' پردے' اپنی کتابیں اور ضرورت کی دوسری چیزیں' جنہیں دیکھ کر کچھ دیر پہلے اسے الجھن ہو رہی تھی' ایک دم بہت اچھی لگنے لگی تھیں۔ ہر چیز روشن اور واضح تھی۔ اس نے بازو شانوں سے پیچھے لے جاتے ہوئے انگڑائی لی۔

"چلو' ممی سے نور کی شادی کے ڈریسز ڈسکس کر لوں' کتنے کم دن رہ گئے ہیں۔" اسے خیال آیا۔ "سلمان سے کہتی ہوں' آج ڈنر باہر کرائے کھاری کو بھی لے کر چلتے ہیں۔" کھاری بے چارہ کتنے دنوں سے آیا ہوا ہے۔ اس سے آرام سے بیٹھ کر باتیں بھی نہیں کیں۔" اسے افسوس ہونے لگا۔ "تائی صابرہ کو بھی محسوس ہو رہا ہو گا' میں کتنی بری میزبان ہوں جبکہ وہ میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔" اس نے اپنے اردگرد بکھری چیزیں سمیٹتے ہوئے سوچا۔

"ہائے میرے اللہ" اٹھ کر چیزیں میز پر رکھتے ہوئے اس کی نظر اپنے کپڑوں پر پڑی۔ "میری جینز کتنی میلی ہو رہی ہے' کتنے دنوں سے یہ ہی جو چڑھائے پھر رہی ہوں۔"

اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر نصب لائٹ جلاتے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ "صحیح کہہ رہی تھیں ممی'

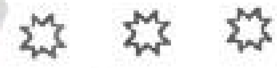
چمگادڑوں جیسی شکل ہو رہی ہے میری۔" اس نے اپنے گال پر انگلی رکھتے ہوئے سوچا اور بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں سیدھا کرنے لگی۔

"ماسی سے کہتی ہوں ذرا میری بیڈ شیٹ تو بدل دے اور کمرے کی صفائی کر دے۔" پاؤں میں چپل پہن کر وہ باہر جانے لگی تو جاتے جاتے اس کی نظر بیڈ پر رکھے فون پر پڑی۔

"اوہ! آئی ڈی تو بھیجی ہی نہیں۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور فون اٹھا کر اس کی اسکرین روشن کی' اس کے نام ایک پیغام آیا ہوا تھا۔

"تم سے بات کر کے میں بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں' شکریہ ماہ نور۔"

وہ مزید کھل اٹھی اور اس کی انگلیاں تیزی سے اسکرین پر حرکت کرنے لگیں۔



ہیلسنکی میں موسم گرما رخصت ہو رہا تھا اور فضا پر خنکی کی چادر چھانے لگی تھی' پھر وہی منجمد کر دینے والا موسم' ہر چہار سو برف کی چادر اور اندھیرے کا راج۔ نادیہ نے ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے اور اس رہائشی عمارت کی طرف چلنے لگی جس میں وہ رہتی تھی۔ شام کے سائے آسمان پر چھا رہے تھے اور دور و نزدیک عمارتوں میں روشنیاں جلائی جا رہی تھیں۔ وہ سر کو ذرا سا اوپر اٹھائے دھیان سامنے رکھے فٹ پاتھ پر اکیلی چل رہی تھی۔ دن کا یہ وہ حصہ تھا جس میں کچھ عرصہ پہلے تک وہ بھی اپنے اردگرد بھاگتے دوڑتے طالب علموں میں شامل رہتی تھی۔ وہ طالب علم جن کی شامیں کسی نہ کسی ذریعہ سے پیسے کمانے کی تگ و دو میں گزرتی تھیں۔

نادیہ کو وہ مشقت بھری شامیں کبھی نہیں بھول سکتی تھیں۔ پڑھائی کے بوجھ' لائبریریوں کے چکر' کمپیوٹر اسکرین سے نظریں چپکائے اپنا کام کر کے سر درد لیے اٹھنا اور پھر افراتفری میں کچھ کھانے کو میسر آجانے پر پیٹ میں اتار کر اگلے کام کی فکر' کوئی اخبار تقسیم کر رہا ہے' کوئی ڈاک کی تقسیم میں مصروف ہے' کوئی یونیورسٹی میں ریسرچ کا کام کر رہا ہے' کتنی بھاگ دوڑ ہے' کتنا کام' کتنی مشقت' گرما میں کئی لوگ اپنی نوکریوں سے چھٹی لے کر موسم کا مزہ لینے کے لیے گھومنے پھرنے چلے جاتے تھے' ایسے لوگوں کی عارضی طور پر خالی سیٹوں پر بھی یہ ہی طالب علم جو جاب ہنٹرز تھے' براجمان ہو جاتے تھے' گرما کمائی کے لیے بہترین سیزن ثابت ہوتا اور سرما کے آغاز پر پھر وہی خواری' پھر وہی کام' پڑھائی اور موسم کی شدت کا مقابلہ' وہ جنہیں فینش یا نارویجین زبان سے شناسائی نہیں ہوتی تھی ان کی مشکلات سوا ہوتی تھیں۔

"اف!" نادیہ نے چلتے چلتے جھرجھری لی اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک نادیدہ طاقت کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے ایک لمبا عرصہ اسی طرح کی مشقت میں گزارا تھا' لیکن اب وہ روزگار کی مشقت سے آزاد تھی۔ جیکٹ کی جیب میں گھسے اس کے ہاتھ نے دائیں جیب میں رکھے کریڈٹ کارڈ کو چھو کر محسوس کیا۔ اب اس کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ وہ ایک اچھی رہائش افورڈ کر سکتی تھی اور بغیر کام کے اور وظیفوں کی درخواستیں بھر کے بھجوانے کے اپنی پڑھائی آسانی سے چلا سکتی تھی۔

اس نے کچھ ہفتے قبل لندن میں دو دن اپنے بھائی کے ساتھ گزارے تھے اور وہاں سے واپسی کے بعد اس کے بینک کریڈٹ میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا' آنے والے شدید موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے پاس مکمل سامان موجود تھا' اسے سڑکوں پر سائیکل کے پیڈلز گھماتے ادھر سے ادھر پڑھائی اور کام کے درمیان گھن چکر بننا نہیں پڑ رہا تھا۔ یہ جادو تھا' معجزہ تھا یا خواب' جو بھی تھا اس روز سے ایک سال قبل وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زندگی میں کبھی کوئی آسانی بھی آسکتی ہے۔

"زندگی کی سب سے زیادہ قابل فخر بات یہ ہے کہ تم میری بہن ہو مشکل اور ناموافق ترین حالات میں سربلند رکھ کر جینے والی میری پیاری بہن مجھے تم پر فخر ہے۔"

اس نے ان الفاظ کو یاد کیا اور بے اختیار مسکرا دی۔ لندن سے واپسی پر اس کے ہاتھوں کی بند مٹھیوں میں خوبصورت لمحوں کی تتلیاں موجود تھیں' رنگ برنگ پروں والی خوشنما تتلیاں۔ اس نے چلتے چلتے بے اختیار جیکٹ کی جیب سے اپنے ہاتھ باہر نکالے اور اپنے بند ہاتھ کھول کر اپنی نظروں کے سامنے کیے۔ لمحوں کی تتلیاں سرک کر اڑ چکی تھیں مگر اپنے پیچھے یادوں کے اتنے خوشنما رنگ چھوڑ گئی تھیں کہ جن کے سہارے آنے والا بہت سا وقت آسانی سے کٹ سکتا تھا۔

"آئی لو یو سعد۔ زندگی کی سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ تم میرے بھائی ہو۔"

اس کی اپنی آواز نے اس کے کان کو یہ بات سنائی۔ وہ چلتے چلتے رک کر مسکرائی' اس کا رہائشی کمرہ اس کے سامنے موجود تھا اس نے ایک لمحے کے لیے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا' روشنیوں سے جھلملاتی' بلندوبست عمارتیں فضا میں پھیلتی دھند کے پیچھے چھپنے لگی تھیں۔ اس نے گردن سیدھی کرتے ہوئے اپنے سامنے موجود عمارت کو دیکھا اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ چابی گھمانے پر کلک کی آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

یہ کمرہ کشادہ تھا۔ اس میں اور اس سے ملحقہ کچن اور لانڈری میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس کے جسم کو کمرے میں داخل ہو کر سکون کا احساس ہوا اور وہ جیکٹ اتار کر صوفے پر پھینکنے کے بعد کچن کی طرف چل دی۔ کمرے میں موجود ڈریسر پر اس کے بھائی کی تازہ تصویر فریم میں جڑی رکھی تھی۔



"تمہیں پتا ہے کھاری! تم بہت قسمت والے ہو۔" ماہ نور نے مینگو ملک شیک میں اسٹرا گھماتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی مینوں پتہ اے۔" کھاری ماہ نور کے سامنے بیٹھا انار کا جوس پی رہا تھا۔ اس نے جوس کے گلاس میں رکھا اسٹرا نکال کر پلیٹ میں رکھ دیا تھا اور گلاس سے براہ راست ہلکے ہلکے گھونٹ لیتا جوس پی رہا تھا۔

"کیسے اور کیا پتا ہے؟" ماہ نور محظوظ ہوئی۔

"لو جی اج تو مہ نور بی بی موج میں آئی ہوئی ہے۔" کھاری نے ماہ نور کو کوئی جواب دینے سے پہلے دل میں سوچا۔ "اینے (اتنے) دن میں رہ چلا ادھر اس کو ویل (فرصت) نہ ملی اور اب جو میں چوہدری صیب کو پیغام بھیج بیٹھا ہوں کہ خدا بخش سے کہیں مجھے واپس لے جائے تو اس کو اتنی ذیل (فرصت) مل گئی ہے کہ یہ میرے ساتھ باتیں بھی کرنے لگی ہے اور اب مجھے لے کر گھمانے پھرانے آ گئی' بھئی بڑی سائیں لوک بی بی ہے مہ نور بی بی بھی۔ من موجی تے' درویش۔"

"بتاؤ نا' کیسے پتا ہے کہ تم خوش قسمت ہو۔" ماہ نور نے اپنا سوال دہرایا۔

"جس بندے نوں عقل نہ ہو نا مہ نور بی بی! وہ ایک طرح کا خوش قسمت ہی ہوتا ہے نا۔" کھاری نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"وہ ایسے" کھاری نے جوس کا گلاس میز پر رکھا اور دانش مندانہ انداز میں بولا "جو بندہ عقلوں پیدل ہو اور علموں بھی پیدل ہو' وہ نہ کسی کی بات بوتی (زیادہ) سمجھ سکتا ہے نہ کر سکتا ہے' نکی (چھوٹی) سی بات کرتا ہے اور مطلب موافق بات سمجھ لیتا ہے بس اللہ اللہ خیر صلا ہے' اس کے مغز پہ نہ زیادہ بھار (بوجھ) پڑتا ہے نہ کوئی ڈالنے کی

کوشش کرتا ہے' پھر خوش قسمت ہی ہویا نا وہ۔"

"ہاں۔" یہ تو بڑی پتے کی بات بتائی تم نے۔" اس نے کھاری کی بات سمجھتے ہوئے ہولے ہولے سرہلایا۔ "لیکن میں کسی اور وجہ سے تمہیں خوش قسمت کہہ رہی تھی۔"

"وہ کیا۔" کھاری نے آنکھیں جھپکتے ہوئے پوچھا۔

"میں تمہیں اس لیے خوش قسمت کہہ رہی تھی کہ یہاں بھی اور تب گاؤں میں بھی میں نے دیکھا تھا کہ سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں' کوئی تم سے خار نہیں کھاتا' کسی کو تم برے نہیں لگتے' تم سب کے لیے بس کھاری ہو' نہ غصے سے تمہارا نام کوئی برے طریقے سے لیتا ہے نہ پیار سے تمہارا نام بگاڑا جاتا ہے۔ جدھر جاتے ہو مسکراہٹیں بکھیر دیتے ہو' منٹوں پلوں میں دوست بنا لیتے ہو' یہ بہت بڑی خوش قسمتی ہے کھاری۔" ماہ نور نے صاف دلی سے کہا۔

"اوئے ہوئے۔" کھاری نے گھٹنے پر ہاتھ مار کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "تسی بڑے بھولے ہو مہ نور بی بی۔"

ماہ نور نے پر تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"ادھر پنڈ میں نا اپنے فارم ہاؤس میں۔" کھاری نے ہوا میں کسی سمت ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ..." اس نے آنکھیں سکیڑ کر یاد کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں تین" بچے (بلکہ) تین لوگ میرے نال بڑی خار کھاتے ہیں' کبھی چپ نہیں رہتے' جو کوئی کام غلط ہو جائے فٹ میرا نام لگا دیتے ہیں۔"

"اوہ!" ماہ نور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"تے ادھر مسجد میں جو لڑکے ہیں نا!" اب کھاری نے ہاتھ سے اپنے عقب میں کسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ لڑکے میرا بڑا مخول اڑاتے تھے نام ڈالتے تھے' مجھے سیپارے کا سبق نہیں لینے دیتے تھے' میں تو جی بس دل پکا کر بیٹھا تھا۔" اس نے سرہلایا۔

"کس بات کا دل پکا کر بیٹھے تھے۔" ماہ نور نے کہا۔

"میں نے کہا لے وئی افتخار احمد تو کبھی کلام پاک نئیں پڑھ سکتا' تو نے کلام دے علم توں بے علم ہی رہ جانا۔"

"افتخار احمد کون ہے جسے تم نے یہ سب کہا۔" ماہ نور نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میں جی اور کون۔" کھاری نے سینہ پھلا کر اس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھ۔ چھا۔" ماہ نور کو بے اختیار ہنسی آ گئی "تم افتخار احمد ہو۔" اس نے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کھاری کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"تے ہور کیا۔" کھاری ہنوز سینہ پھلائے بولا "چوہدری صاحب نے بقلم خود میرا نام افتخار احمد رکھا تھا۔"

"اچھا اچھا!" ماہ نور بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ "گڈ بھئی اچھا نام ہے۔ بہت اچھا نام ہے۔" اس نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی!" کھاری کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ اتر آئی "یہ تو میرا پیار دا نام اے کھاری' افتخار احمد عرف کھاری۔"

"اچھا بھئی!" ماہ نور نے سرہلایا "مجھے واقعی نہیں پتا تھا کہ تمہارا اصل نام افتخار ہے۔"

"کسی کو بھی نہیں پتا جی!" کھاری نے ہاتھ ہلا کر کہا "مجھے پتا ہے یا پھر چوہدری صاحب کو' بی بی ہوراں کو بھی شاید نہیں پتا۔"

"اچھا پھر کیا ہوا جو لڑکے تمہیں سبق نہیں لینے دیتے تھے' وہ جو بات سنا رہے تھے' وہ سناؤ۔" ماہ نور نے کھاری کی پچھلی بات کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔ "تو بس پھر جی میں نے میت والے پڑے راستے تے جانا ہی چھوڑ دیا' پھر مجھے بھین جی مل گئیں' اللہ کے کرم سے۔" اس کے لہجے میں عقیدت اتر آئی۔

"بہن جی کون؟" ماہ نور نے سلش کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"بھین جی پنڈ کی مسجد والے مولی صیب کی بی بی ہیں جی۔" کھاری نے بتایا "سعدیہ کلثوم نہیں۔" اس نے سرہلا کر ماہ نور سے یوں پوچھا جیسے وہ جانتی ہو۔

"کون سعدیہ کلثوم؟"

"اوہ آہو۔" وہ گردن کو ناخنوں سے کھجاتے ہوئے بولا۔ "جدھوں تسی آئے تھے' میں بھین جی کے گھر نہیں جاتا تھا ابھی' ہمارے پنڈ آئے تو انہیں کتنے ہی سال ہو گئے پر نہ پہلے کبھی چوہدری صاب نے بھیجا تھا نہ میں گیا۔ پھر جب میری ڈیوٹی ڈیری پر لگی تو میں جانے لگا مولی جی کے گھر اور بھین جی نال ملاقات ہو گئی۔ بھین جی نے میرا حوصلہ بڑھایا بس پھر انہوں نے مجھ کو بسم اللہ کرائی۔ اور اب میں خیر نال پندرھویں سیپارے چڑھ (پہنچ) گیا ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔

"تو پھر سوچ لو مہ نور بی بی! ایسی گل نہیں کہ کھاری توں کوئی خار نہیں کھاتا' میرے کتنے سال ضائع ہو گئے لڑکوں کے مخول کے ہاتھوں۔ اب تو میں وڈا ہو گیا ہوں' ماسی جنت کہتی ہے مجھے اکیسواں سال لگ گیا ہے' اب میں نئیں ڈرتا مخول سے' غصے سے لڑائی سے' یہ جو میرے نام لگاتے ہیں نا' ان سے بھی نہیں ڈرتا' جھوٹے نام لگانا بڑا گناہ ہے مہ نور بی بی۔ ہے نا۔"

"ہاں بالکل!" ماہ نور مسکرائی "تم بہت پیور (خالص) ہو کھاری! اندر باہر سے ایک جیسے' تم میں کوئی بل ہے نہ فریب۔"

"آپ بھی بڑے پیو ہو جی۔" کھاری نے تیزی سے کہا۔

"پیو نہیں۔" ماہ نور ایک بار پھر بے ساختہ ہنسی "پیور یعنی خالص۔"

"اچھا!" کھاری نے سرہلاتے ہوئے زیر لب دہرایا "پیور۔"

"اچھا کھاری یہ بتاؤ۔" ماہ نور کو یاد آیا۔

"ہاں جی بولو۔" کھاری نے کہا۔

"تمہیں وہ بندر والا یاد ہے نا' جو پہلی بار تماشا دکھانے آیا تھا' جسے میں نے کہا تھا کہ مجھے تماشا کرنا سکھا دے۔"

"وہ۔" کھاری نے خلا میں دیکھتے ہوئے یاد کیا۔ "پہلے دن میں تھوڑا سا تماشا دکھا کر چلا گیا تھا جنوروں کو پٹھے ڈالنے۔"

"اوہ اچھا۔" ماہ نور کو مایوسی ہوئی۔

"تو پھر منگو کے میلے والا سائیں تو یاد ہی ہو گا۔"

"تو وہ کس طرح بھول سکتا ہے جی!" کھاری نے کہا "بڑا سوز تھا جی اس کی آواز میں۔"

"اوکھے پینڈے لمیاں نی راہواں عشق دیاں۔" کھاری نے ایک ہاتھ کان پر رکھ کر دوسرا بازو سیدھا کرتے ہوئے گنگنانے کی کوشش کی۔

"اُفوہ کھاری! یہ مارکیٹ ہے۔" ماہ نور نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اسے ڈپٹا۔

"اوہ آہو جی!" وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا "سائیں جی بڑے یاد آتے ہیں مجھ کو مہ نور بی بی! اللہ کرکے زندگی میں ایک بار پھر ان سے دوبارہ کچھ سننے کو مل جائے نا... واہ واہ۔" اس نے سردھنا۔ کھاری کی اس بات سے ماہ نور کے دل کو ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی تھی۔

"پھر تو نہیں دکھے کہیں سائیں جی؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"نہیں جی۔" کھاری نے سرہلایا "ایس دفعہ نہ منگو دے میلے گئے نہ کوئی رونقاں ویکھیں۔" پر اگلی دفعہ ضرور جانا ہے۔ وہ جو چینی خرگوش تھا نا ادھر ہوٹل میں۔ اس سے میں نے وعدہ کیا ہے میلہ دکھانے کا۔"

"چینی تھا وہ کہ جاپانی تھا۔" ماہ نور نے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"پتا نہیں جی۔ یاد نہیں رہا' چینی تھا کہ جپانی... ان دیاں شکلاں ایک جیسی ہوتی ہیں نا نہ پتا چلتا ہے جپانی ہیں نہ پتا چلتا ہے چینی ہیں۔" کھاری نے ماہ نور کے شاپنگ بیگز اٹھا کر اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا پھر اسے ایک اور بات یاد آئی۔

"چائنا دیاں چیزاں ویسے ہوتی تو بے اعتباری ہیں' ہیں نا بی بی جی!"

"ہاں سنا ہے۔" ماہ نور نے کہا۔

"ماسٹر کمال نے مجھے موبیل (موبائل) دے دیا' مطلب میرے سے پیسے لے لیے موبیل (موبائل) کے بدلے' وہ چینا (چائنا) دا موبیل (موبائل) تھا دو دن چلا پھر بند' میں شہر گیا لے کے تو دکان والا بولا یہ نہیں صحیح ہوتا' یہ چائنا کا ہے' اس کی کوئی گرنٹی نہیں ہوندی۔" میں نے کہا "لے بھئی پیسے گئے۔"

کھاری مسلسل بولتا ہوا ماہ نور کے پیچھے چل رہا تھا۔ ماہ نور کا دل ہلکا تھا اور خوش بھی' کھاری خوش تھا کہ لاہور آنا اکارت نہیں گیا۔ اسے ماہ نور بی بی کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

اور اس رات سرونٹ کوارٹر میں اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے کھاری نے سوچا تھا۔

"کتنی اچھی ہے مہ نور بی بی! کون نوکروں کو ساتھ بٹھا کر جوس پلاتا ہے۔ انہوں نے مجھے جوس بھی پلایا اور میرے ساتھ باتیں بھی کیں۔ میں بھی پاگل ہوں' ایسے ہی دل برا کر بیٹھا کہ مہ نور بی بی کو میں یاد ہی نہیں۔ وہ بے چاری پتا نہیں کتنی مصروف تھی اپنے کام میں۔ اب مدت ملا ہے تو کتنے پیار سے ملی ہے۔"

"پر کتنی چیزیں خریدیں اس نے۔" اسے یاد آیا "کپڑے' جوتے تو میک اپ کا سامان' بندے ہار۔" اس کی نظروں کے سامنے ان بڑی بڑی دکانوں کی روشنیوں کی چکا چوند گھوم گئی جہاں سے ماہ نور نے شاپنگ کی تھی۔

"سنا ہے بڑا وڈا ویاہ ہونا ہے چوہدری صاحب کے خاندان میں' جب ہی تو سارے چیزیں کپڑے بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ سب کے پاس پہلے ہی کتنے کپڑے ہیں۔ کتنی چیزیں ہیں۔ میں نے تو کبھی کسی ویاہ میں نیا جوڑا نہیں بنایا' وہ جو سلیم کی شادی پر بوسکی کا کرتا اور چٹی (سفید) شلوار سلا کر دی تھی چوہدری صاحب نے پچھلے سے پچھلے سال' وہی پہن لیتا ہوں ویاہ شادیوں' عید شبرات پر۔ کوئی مسئلہ نہیں لگتا۔ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ یہ تو بس پیسوں کا کھیل ہے۔" وہ اسی قسم کی باتیں سوچتا گہری نیند سو گیا تھا۔



"شکر اللہ کا بھین جی! جس نے اپنا گھر دکھا دیا' بلاوا دے کے بلا لیا ورنہ ہم گناہ گار کس قابل تھے جی!" آمنہ بی بی نے آپا رابعہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لیکن بھین جی! حج جوانی کا ہی اچھا ہوتا ہے' ہماری عمر کے لوگ ذرا مشکل میں پڑ جاتے ہیں' خاص کر کے آخری چھ دن' آخری چھ دن مشقت کے ہوتے ہیں۔"

"مشقت کے کیسے؟" آپا رابعہ سامنے خلا میں کہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔

"بڑا چلنا پڑتا ہے بھین جی' ٹانگیں اور جوڑ جواب دینے لگتے ہیں۔" آمنہ نے کہا "کاکا فرید مجھے کہنے لگا۔ بے بے پہیوں والی کرسی لے لیتے ہیں کرائے پر' پر میں نے کہا۔" آمنہ نے دونوں کانوں کو باری باری ہاتھ لگائے

"نہیں کاکا فرید' میں گناہ گار بڑے ترلوں' واسطوں کے بعد اللہ کے در پر پہنچی ہوں' مجھے اس در پر پہنچنے کے سارے فرض پورے کرنے دے' میں ہر جگہ خود اپنے پاؤں پر اپنی ٹانگوں سے چل کر گئی' شکر ہے اس مولا کا جس نے ہمت اور توفیق دی ورنہ میں کملی کس قابل تھی۔" آمنہ دونوں ہاتھوں پر اپنی چادر اٹھائے شکر ادا کر رہی تھی۔

"یہ لیں جی۔ میں آپ کے لیے خاص تبرک لائی ہوں۔" اس نے شاپر کھول کر تسبیح اور جائے نماز نکالی۔

"یہ جو کھجوریں ہیں' خاص ہیں جی' پنڈ کے لوگوں اور اپنی برادری میں ہم نے دوسری کھجوریں بانٹی ہیں پر آپ کے لیے خاص ہیں۔ چار ہی ہیں گنتی میں' بھورا بھورا سارے جی روز کھالیا کرنا۔" آمنہ کے لہجے میں عاجزی تھی

"یہ چادر' یہ ٹوپی' یہ عطر مولوی جی کے لیے اور یہ بندے اور ہار کاکی سعدیہ کے لیے۔"

آمنہ اپنی دھن میں بولے چلی جارہی تھی۔ لیکن آپا رابعہ شاید آمنہ کی بات سن نہیں پا رہی تھیں' ان کا دھیان کسی اور طرف لگ گیا تھا' ان کی نظروں کے سامنے چند پرانے منظر گھوم رہے تھے۔

"عجوہ کھجوریں۔" کسی نے پلیٹ بھر کھجوریں ان کی نظروں کے سامنے کی تھیں۔ "شکل' جنس' افادیت اور اہمیت میں سب سے اوپر' ذائقہ سب سے الگ۔ جا نمازیں۔ کسی کو توفیق ہے تو ہدیہ دے جائے نہیں تو ویسے ہی لے جائے۔"

سفید چادر کے ہالے میں نظر آتا وہ چاند چہرہ' تسبیح پھیرتی وہ موی انگلیاں' مصلے پر بیٹھ کر بلک بلک کر گناہوں کی بخشش طلب کرتی' فریاد کرتی' بلک بلک کر روتی وہ شخصیت۔

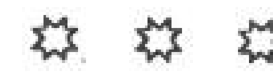
"آخرت میں سرخروئی کی تمنا بھی ہے اور کشش دنیا کی کھینچ بھی۔ میرے مولا تو اپنا رزق حلال مجھ پر وا کردے اور میرے گناہ معاف فرما' رزق کی طلب میں مجھے پھر سے آزمائش میں پڑنے سے بچالے۔ ارے یہ عجوہ کھجوریں' جنس میں' شکل میں' اہمیت و افادیت میں سب پر بھاری۔ کسی کو توفیق ہے تو ہدیہ دے جائے نہیں تو ویسے ہی لے جائے۔"

"یہ ماڑے غریبوں کا تحفہ ہے' بھین جی قبول کرلیں!" آمنہ بی بی نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ جھر جھری لیتی حال میں واپس آگئیں۔

"میری قسمت کیسی اچھی ہے آمنہ بہن! کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا اور میرے لیے یہ تحفہ خاص لے کر آئیں۔" انہوں نے روتے ہوئے آمنہ بی بی کو گلے سے لگالیا۔ "آؤ۔ میں تمہارے ہاتھ چوم لوں' تمہاری آنکھوں کو بوسہ دوں' جو ان سب جگہوں کو چھو کر ان کا نظارہ کرکے آئی ہیں۔" انہوں نے آمنہ بی بی کے ہاتھوں کو عقیدت سے بوسہ دیتے ہوئے کہا "دربار مصطفیٰ کی ہوائیں تمہیں چھو کر گزریں' خانہ خدا کو تمہاری نگاہوں نے اپنے سامنے پایا۔ میرا اسلام کہا تھا نا۔ بتاؤ یاد سے کہا تھا نا' میری عرضی پیش کی تھی کہ نہیں؟" وہ کانپتی آواز میں بول رہی تھیں۔

"سب یاد تھا بھین جی اور سب عرض کر دیا تھا۔ عرض کیا تھا کہ مولا پاک آپ کی ایک عاجز بندی رابعہ زوجہ سراج سرفراز ملک پاکستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھی اپنے جملہ گناہوں کی معافی کی خواست گار اور آپ کے اپنے در پر بلاوے کی منتظر ہے۔ اسے ایک بار پھر موقع عطا فرمائیے' ایک بار پھر بلا لیجیے۔"

آمنہ بی بی بلاکم و کاست ان کی عرضداشت دہرا رہی تھی اور آپا رابعہ ہاتھ سامنے پھیلائے ہل ہل کر آمین کہے جارہی تھیں۔



وہ گھر بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ گھر کے مکین شاید ایک سال کے دوران خود بھی اس کے تمام حصوں کو دیکھ نہیں پاتے تھے۔ اس گھر میں معاشرے کے طبقہ اول کی ضرورت کی ہر سہولت میسر تھی۔ سوئمنگ پول' بلیرڈ روم' چھوٹا ٹینس کورٹ' باسکٹ بال کورٹ اور بیڈمنٹن کورٹ اس بات کا مظہر تھے کہ گھر کے مکینوں کو جسمانی فٹنس میں خاصی دلچسپی تھی۔ گھر میں کئی بیڈ رومز تھے' ہر بیڈ روم کی اندرونی سجاوٹ کسی ماہر انٹیریر ڈیزائنر اور پیسے کے بے دریغ استعمال کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ڈرائنگ روم' مہمان خانہ' ڈائننگ روم' کچن' راہداریاں سیڑھیاں' لانڈری' کچن سے ملحق پینٹری' لان' پودے' گھاس سب کے سب کسی باذوق مکین کے ذہنی میلان کی خبر دیتے تھے۔ مگر اس گھر کے ساتھ ایک بدقسمتی ہمیشہ سے رہی تھی۔

کئی کنال پر پھیلے اس گھر کے اصل مالک اور مکین تعداد میں صرف دو تھے اور وہ دو بھی ایسے مکین تھے جن کے لیے یہ گھر اکثر صرف رات گزارنے کا ٹھکانا ثابت ہوتا تھا یا پھر کسی ذاتی دلچسپی کے مہمان کے لیے لنچ یا ڈنر کا طعام خانہ' باقی اوقات میں گھر کے مختلف حصوں میں ملازمین کی فوج ظفر موج پریڈ کرتی پھرتی تھی۔ گھر کی دیکھ بھال پر مامور عملے کے افسر خاص رازی اور ضوفی تھے' جن کے اصل اور مکمل نام افراز اور ضوفشاں تھے۔ دونوں میاں بیوی خاصے ہنس مکھ' پڑھے لکھے اور سمجھ دار انسان تھے۔ دونوں کے اندر اچھے منتظمین ہونے کی تمام خوبیاں موجود تھیں' اسی لیے پچھلے کئی سالوں سے اس گھر کے دیکھ بھال کی تمام ذمہ داریاں بہ حسن و خوبی پوری کر رہے تھے۔

سعد نے اس روز رازی اور ضوفی کے ساتھ دو گھنٹے تک میٹنگ بھگتائی تھی۔ اس میٹنگ میں گھر کا سالانہ بجٹ' گھر کی انٹیریر ڈیکوریشن کی سیزنل تبدیلی پر اٹھنے والے اخراجات' مہمان داری اور کچن بجٹ' ملازمین کی تنخواہیں زیر بحث رہیں' کب کون سا ملازم ملازمت پر رکھا گیا اور کس کو کب کس وجہ سے ملازمت سے فارغ کیا گیا۔ سعد کو شاید اس میٹنگ کے کسی بھی نقطے میں دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ پورے تحمل کے ساتھ وہاں نہ صرف بیٹھا رہا بلکہ بظاہر تمام باتیں سنتا بھی رہا اور اپنی ڈائری پر دکھاوے کے نوٹس بھی لیتا رہا۔

وہ سر جھکائے گود میں رکھی ڈائری پر کچھ لکھ رہا تھا جب اسے احساس ہوا رازی اور ضوفی کی آوازیں اس کے کان میں پڑنا بند ہوگئی تھیں۔ اس نے نظریں اٹھا کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں منتظر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مودب بیٹھے تھے۔

"وہ اس کا مطلب ہے' میٹنگ ختم ہوئی۔" سعد نے دل میں سوچا اور خوش ہوگیا۔

"او کے مسٹر اینڈ مسز رازی۔ یہ ایک بھرپور اور معلومات افزا بریفنگ تھی۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہم خوش ہیں مسٹر سعد! کہ پہلی بار اس سال آپ نے بریفنگ لی۔" ضوفی نے لائٹ لپ گلوس سے چمکتے ہونٹ مسکرانے کے لیے پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اور آپ نے کسی معاملے پر جرح کی نہ بحث۔" رازی نے بھی باچھیں کھلاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر بلال کے سامنے بریفنگ دینے کے لیے آنے سے پہلے ہماری ٹانگیں کانپ رہی ہوتی تھیں۔"

"آج بھی کانپ رہی تھیں۔" ضوفی نے اضافہ کیا "مگر یہ ان تمام سالوں میں ہونے والی سب سے خوشگوار اور آسان بریفنگ ثابت ہوئی۔"

"آپ فکر نہیں کریں۔" سعد نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے بہت سے پوائنٹس نوٹ کرلیے ہیں' ہم اگلے ہفتے پھر ملیں گے کیونکہ یہ میرے لیے اس قسم کی پہلی بریفنگ تھی' سو مجھے ان پوائنٹس کو ڈسکس کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم اگلے ہفتے آج ہی کے دن اسی وقت دوبارہ مل سکیں گے۔"

سعد نے ان کی سماعتوں پر بجلی گرا کر ان کی خوش فہمی کا خاتمہ کرتے ہوئے کہا۔

"well this boss is even more tricky"

(خوب تو یہ باس زیادہ چالاک ہے۔)"

رازی نے نظروں ہی نظروں میں ضوفی سے کہا اور سعد نے حسب عادت اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا' وہ ان دونوں پر اپنی مسکراہٹ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس بریفنگ میں ضوفی اور رازی کے کامیاب ہوجانے کا مطلب ایک مکمل سال کا مزید معاہدہ ہو سکتا تھا' مگر ان دونوں کو اس کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں جاننے کے لیے مزید ایک ہفتہ انتظار کرنا تھا۔

"رائٹ سر۔" رازی نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ چہرے پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے کمرے سے جانے کے بعد سعد نے وہاں تنہا بیٹھے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس نے ان دونوں کی شاید ہی کوئی بات دھیان سے سنی تھی اور اس کا ان کی کسی بھی بات پر اعتراض کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا' مگر بریفنگ کے آخر میں ان دونوں نے اسے جیسے چیلنج کردیا تھا' وہ دونوں اسے اتنا آسان سمجھ رہے تھے' صرف اسی احساس نے اسے ان کے نئے کانٹریکٹ کو اگلے ہفتے پر ملتوی کرادیا تھا۔

"باس ہونا اور کوئی اختیار اپنے پاس ہونا بھی کتنی عجیب سی کیفیت ہے۔" وہ وہاں بیٹھا سوچ رہا تھا "باس کے چہرے پر پھیلے ہر نئے احساس کے ساتھ ساتھ ماتحتوں کی سانسیں چڑھتی اور ڈوبتی ہیں۔ جی سر' یس سر' رائٹ سر' بجا فرمایا جیسے الفاظ منہ سے بے اختیار اور تواتر کے ساتھ نکلتے ہیں کیونکہ کامیاب ملازمت کا راز "باس ہمیشہ درست ہوتا ہے" جیسے مقولے میں مضمر ہوتا ہے" وہ سوچ رہا تھا۔

"اور باس کو دیکھو۔" اس نے ریوالونگ چیئر گھماتے ہوئے سوچا "کیسا الو کا پٹھا ہے' سب جانتے ہوئے بھی اس چاپلوسی پر خوش ہوتا ہے' اپنے باس ہونے پر اتراتا ہے اور ماتحت کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

کیا نظام ہے یار۔ صدیوں میں بھی نہیں بدل سکتا۔" کھڑکی کے قریب جاکر بلائنڈز کھینچتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشے کے پار لان میں نصب لائٹس جلائی جاچکی تھیں۔ لان کے دائیں جانب نصب کسی یونانی دیوی سے مشابہ مجسمہ پانی اگل رہا تھا اور پانی کی دھار چاروں کنول کے پھول جیسے کٹورے میں گر رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ ہٹا کر پانی کے گرنے کی آواز سنی اور باؤنڈری وال کے اندر لان کی باؤنڈری بناتے سر اٹھا کر کھڑے سیدھے اونچے درختوں کی قطار کو دیکھا۔

وشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہے
تیری آواز کے سائے
تیرے ہونٹوں کے سراب

اس کے فون پر کسی خاص کالر کے لیے مخصوص ٹون بجنے لگی۔ اس نے تیزی سے میز کی طرف واپس آتے ہوئے موبائل فون اٹھالیا۔ مخصوص رنگ ٹون کے ساتھ فون پر کال کرنے والے کی تصویر بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے فون آن کیا اور اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

"سعد ہیر! کیا حال ہے؟"

✡ ✡ ✡

"سارہ کے سر میں خشکی سی ہو رہی ہے' کیوں نہ اس بار اینٹی ڈینڈرف شیمپو لے جایا جائے۔" سیمی آنٹی نے اس علاقے میں موجود اس چھوٹے سے اسٹور کے ریکس پر رکھے مختلف شیمپوؤں کی بوتلوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ شیمپو کی بوتل اٹھا کر اس کی خوبیاں پڑھنے میں مشغول تھیں جب اسٹور کے شیشے کے دروازے سے باہر سعد کی گاڑی پر نظر پڑی۔

"وہ۔ اس بار یہ بہت دن کے بعد آیا۔" انہوں نے سوچا اور شیمپو واپس ریک پر رکھ کر تیزی سے اسٹور کے دروازے کی طرف لپکیں۔ اس سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت کم تھی' البتہ پیدل آنے جانے والوں کی تعداد کافی تھی۔ انہوں نے سعد کی گاڑی کے سامنے آتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ وہ اس کو وہیں روک لینا چاہتی تھیں۔ سعد نے انہیں دیکھ کر گاڑی کی رفتار کم کردی اور ان کے قریب آکر گاڑی روک دی۔ گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ نیچے ہوا اور سیمی آنٹی نے جھک کر گاڑی کے اندر جھانکا۔

"السلام علیکم سیمی آنٹی!" سعد انہیں دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"تم یہیں رکو' میں ابھی آتی ہوں۔" سیمی آنٹی نے کہا۔

وہ تیزی سے واپس اسٹور کی طرف مڑیں اور جو چیزیں منتخب کرکے انہوں نے ہینڈ باسکٹ میں رکھی تھیں ان کا بل ادا کرکے شاپر اٹھائے چند منٹ میں باہر آگئیں۔ سعد نے ان کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا اور وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

"خیریت! آپ آج یہاں کیسے' کیا انجم نہیں آیا تھا۔" سعد نے کہا۔

"وہ آیا تھا' گھر میں کچھ چیزیں مرمت طلب تھیں' میں نے اسے وہ سامان لانے بھیج دیا اور خود ادھر آگئی۔"

"اور سارہ؟" سعد نے ان کا متوقع سوال پوچھا۔ "آپ اس کو اکیلی چھوڑ آئی ہیں۔"

"نہیں' میں انجم کی بہن فاریہ کو اس کے پاس بٹھا کر آئی ہوں۔"

"لیکن وہ سارہ کو کیسے سنبھال سکے گی؟" سعد کے لہجے میں تشویش تھی۔ "میرا مطلب ہے اسے تو معلوم نہیں کہ سارہ کو کیسے سنبھالنا ہے۔"

"وہ سنبھال لے گی۔" سیمی آنٹی کے لہجے میں اطمینان تھا۔ سعد نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر خاموش ہوگیا۔

"سعد! میری تم سے ایک درخواست ہے۔" سیمی آنٹی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی پلیز۔ کہیں۔"

"تم سارہ کو بچوں کی طرح ٹریٹ کرنا چھوڑ دو۔" سیمی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" سعد نے ان کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ اگر تم چاہتے ہو' سارہ ایک ایکٹو زندگی کی جانب لوٹنے کی کوشش کرے تو تمہیں اس کے ساتھ اپنا رویہ بدلنے کی ضرورت ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" سعد نے ایک بار پھر ان کی طرف دیکھا۔

"کیا ہم تھوڑی دیر یہاں کہیں رک کر بات کرسکتے ہیں۔" سیمی آنٹی نے کہا۔ "میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں' لیکن وہاں گھر میں یہ ناممکن ہوگا کیونکہ اس چھوٹے سے گھر میں جہاں سوئی گرنے کی آواز بھی دوسرے کمرے میں باآسانی سنی جاسکتی ہے وہاں ایسی بات کرنا ناممکن ہے۔"

"ضرور۔" سعد نے ایک چھوٹی سی کافی شاپ کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

"میں معذرت خواہ ہوں سیمی آنٹی! میں واقعی آپ کی بات سمجھ نہیں پایا۔" سعد نے تقریباً" خالی کافی شاپ کی ایک ٹیبل کا انتخاب کرنے کے بعد سیمی آنٹی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتی سعد! کہ تم سارہ کا اتنا خیال کیوں رکھتے ہو' یقیناً" تمہارے اندر ایک محبت بھرا پرخلوص دل ہے' تمہیں انسانیت سے پیار ہے۔" سیمی آنٹی نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

سعد نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنے اردگرد دیکھا' اسے سیمی آنٹی کے اتنی لمبی تمہید باندھنے سے چڑ ہو رہی تھی۔

"لیکن سارہ کی صحت کے متعلق مجھے بھی اتنا ہی کنسرن ہے جتنا تمہیں۔" سیمی آنٹی نے اس کی کوفت بھانپتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" سعد نے کہا۔

"لیکن یقین جانو کہ اگر تم سارہ کو یونہی بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے رہو گے' اس کے رونے دھونے اور شوروغل مچانے پر اسے بہلاوے دیتے رہو گے تو وہ ہمیشہ تم میں سہارا اور پناہ پا جانے کی وجہ سے خود اپنے لیے کوئی کوشش نہیں کرپائے گی۔"

"لیکن میں تو ہمیشہ اس کا حوصلہ بڑھاتا ہوں اس کی ذرا سی کوشش پر اسے بک اپ کرکے اس کو مزید ہمت باندھنے کا پیغام دینے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔" سعد نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" سیمی آنٹی نے کہا "مگر جب وہ ذرا سی کوشش کرتے ہوئے گرنے کے ڈر سے چیخنے لگتی ہے تو تم فوراً" اس کی انگلی پکڑ لیتے ہو۔" سیمی آنٹی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

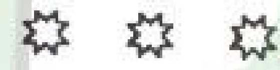
"تو آپ کیا چاہتی ہیں' اسے گرنے دوں۔" سعد نے عجیب سی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں!" میں یہی چاہتی ہوں' اسے گرنے کے خوف میں مبتلا رہتے ہوئے کوشش کرنے دو' اسے اس خوش فہمی سے نکال دو کہ جیسے ہی وہ گرنے لگی' ایک شانہ فوراً" اس کو سہارا دینے کے لیے جھک جائے گا۔" سعد بے یقینی سے سیمی آنٹی کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں!" سیمی آنٹی نے یقین سے کہا۔ "میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ جب تک وہ خوف اور خوش فہمی کے اس حصار سے باہر نہیں نکلے گی۔ مکمل اور دل سے کوشش نہیں کرپائے گی' یقین جانو' یہ اس کی صحت یابی کے لیے بہت ضروری ہے۔"

"ہوں..." تو آپ کیا سمجھتی ہیں سارہ کے ساتھ میرا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔" سعد نے ان کی بات پر غور کرکے سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔" سیمی آنٹی نے کہا اور نیچی آواز میں کہنے لگیں۔



وہ سعد کی گاڑی کا ہارن تھا جسے سارہ کے کانوں نے سنا۔

"فاریہ! دروازہ کھول کر دیکھو' سعد آیا ہے۔" اس نے اپنے کمرے سے آواز لگائی۔ کچن میں برتن دھوتی فاریہ نے بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔ چند منٹوں بعد کچھ گفٹ پیکس اٹھائے سعد گھر میں داخل ہوا۔

"اوہ میرے خدا... میں۔ میری نظریں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہیں' اس نے وہیل چیئر چلا کر اپنے کمرے سے اس کمرے میں آتی سارہ کو دیکھ کر کہا۔ جواب میں سارہ نے سر کو ذرا سا بلند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر یوں ہلایا جیسے کہنا چاہتی ہو دیکھ لو' میں نے یہ مرحلہ سر کرلیا۔

"میں بہت خوش ہوں۔" سعد نے اس کے سامنے آکر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "تم نے دیکھا یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا' صرف سوچ بدل لینے کی دیر ہوتی ہے۔"

سارہ نے ہونٹ بھینچ کر مسکراتے ہوئے سرہلایا۔ اسے ڈر تھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں گے۔

"میں تمہاری کال کو دیکھتے ہی چلا آیا۔" وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم ناراض تو نہیں کہ میں اتنے دن رابطہ نہیں کرپایا۔" اس نے سارہ کی طرف دیکھا "بالکل ٹھیک فگر بتاؤ میں کتنے دن' کتنے گھنٹے' کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈز کے بعد آیا ہوں' یقیناً" تم نے حساب رکھا ہوگا۔"

"نہیں۔" سارہ نے سرہلایا۔

"واقعی!" سعد ٹانگ سے ٹانگ اتارتے ہوئے سیدھا ہوا۔ "کیا یہ حقیقت ہے؟"

"ہاں یہ سچ ہے۔" سارہ نے کہا "اس بار میں نے وقت کی گنتی نہیں کی کیونکہ..." اس نے سعد کی طرف دیکھا۔

"کیونکہ اب مجھے علم ہے کہ تم ہر وقت' کہیں بھی میرے لیے موجود ہو۔"

"اوہ" سعد نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی "ہاں۔ یہ تو تم نے صحیح کہا اور تمہیں اس کا یقین بھی ہونا چاہیے۔"

"ہاں۔ مجھے اس کا یقین ہے۔" سارہ نے کہا۔

"تم میرے لیے کیا لائے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اس کی نظریں خوشنما کاغذوں میں پیک ان تحفوں پر جمی تھیں' جو سعد اپنے ساتھ لایا تھا۔

"ہاں!" سعد نے وہ پیکٹ اٹھا کر سارہ کی گود میں رکھے۔ "کھول کر دیکھو گی یا میں مدد کروں۔"

"مجھے کوشش کرنے دو۔" سارہ نے گفٹس پر لپٹے فیتے کو ہاتھ سے اکھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ دو چار مرتبہ کی کوشش میں بار بار اس کی انگلیاں پھسلیں اور وہ اس فیتے کو اکھاڑنے میں ناکام رہی۔

"فاریہ بچے! قینچی لاؤ' بھاگ کر شاباش۔" سعد نے دلچسپی سے یہ منظر دیکھتی قریب کھڑی فاریہ سے کہا۔ فاریہ قینچی لے کر آئی اور اس نے سارہ کی مدد کرتے ہوئے وہ فیتہ کاٹ دیا۔

"اوہ یہ چاکلیٹس۔" خوبصورت پیکنگ میں بند چاکلیٹ دیکھ کر سارہ نے مسرت سے بلند آواز میں کہا۔ دوسرے پیکٹ کا فیتہ کھلا۔ یہ ایک خوبصورت کارڈیگن اپنے اندر بند کیے ہوئے تھا۔ تیسرے پیکٹ میں ایک چھوٹی میک اپ کٹ موجود تھی' ہر چیز کو دیکھتے ہوئے سارہ کے چہرے کی مسرت اور شوق بڑھتا جارہا تھا۔ آخری پیکٹ کے متعلق اس کے دل میں کئی خیالات آرہے تھے' مگر اس کے کھلنے پر اسے اپنی تمام توقعات بر عکس جو چیز دیکھنے کو ملی تھی' اسے دیکھ کر اس نے حیرت سے سعد کی طرف دیکھا تھا۔

"یہ... یہ" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"ہاں یہ۔" سعد مسکرایا "اب تک جو بھی کچھ میں تمہارے لیے لایا' ان میں سے سب سے زیادہ دلچسپ گفٹ"

"یہ ڈو (لچکیلا ربڑ نما آٹا) ہے اور یہ کچھ ڈرائنگ بکس اور کلر پنسلز' پیسٹلز (Pastals) وغیرہ۔" سعد نے رسان سے کہا۔

"ان کو میں کیا کروں گی۔" سارہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے اندر کتنی آرٹسٹک صلاحیتیں ہیں' مطلب کتنی تخلیقی صلاحیتیں تمہیں اللہ کی طرف سے ملی ہیں۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آیا' اور پیکٹ میں موجود ڈبوں سے ڈو نکال کر سارہ کے ہاتھ میں پکڑایا۔

"شیپ اٹ اپ ناؤ (اس سے کچھ بناؤ)" اس نے کہا۔ سارہ نے بے یقینی سے سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا۔ سعد نے یوں سرہلایا جیسے کہہ رہا ہو جو میں نے کہا۔ تم نے وہی سنا۔ مرے مرے ہاتھوں سے سارا اس ڈو کو دبانے اور پھیلانے میں مصروف ہوئی۔

"ان فگرز میں' جو ان ڈرائنگ بکس میں موجود ہیں۔ کلرز کیا کرو' لیکن احتیاط کرنا کلرز لائن سے باہر نہیں جانے چاہئیں اور کلرنگ بھی ہموار ہونی چاہیے' چلو دیکھتے ہیں ہم میری آئندہ آمد تک کتنی بکس مکمل کرتی ہو۔"

اس رات اپنے بستر میں بیٹھ کر سارہ کو خیال آیا۔

"سعد نے آج پیکٹ کھولنے میں میری ذرا سی بھی مدد نہیں کی' اگر فاریہ کی کوشش کے دوران میرا ہاتھ قینچی سے کٹ جاتا۔" اس نے فاریہ سے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ وہ احتیاط سے فیتہ کاٹے۔"

اس کی چھٹی حس نے اچانک اسے شدت سے اس چیز کا احساس دلایا تھا جس کی طرف اب تک اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہارے لیے محبت کے ساتھ۔"

ماہ نور نے اپنے ان باکس میں آئی اس میل کا عنوان پڑھا جن کے بھیجنے والے نے پہلی بار اسے میل بھیجی تھی اور مسکرا دی۔ اس میل کی تمام اٹیچ منٹس سعد کی تصویریں تھیں جو اس کے حالیہ بیرونی سفر میں کھینچی گئی تھیں۔

اس نے ایک ایک تصویر دس دس بار دیکھی اس کا دل ہر تصویر کو دیکھتے ہوئے بلیوں اچھل رہا تھا۔

"صرف میرے لیے یہ تصویریں اس نے بھجوائیں اور میں ناحق اس سے اتنے دن بدگمان رہی۔" وہ سوچ رہی تھی "اب اتنی پرسنل تصویریں کوئی ہر کسی کو تو نہیں بھیجتا نا۔"

اپنے اہم ہونے کے احساس نے اس کے اندر ایک عجیب سی برقی طاقت بھر دی تھی۔ وہ سعد کے بھیجے ہوئے لنکس پر کلک کر کے وہ گانے سننے لگی جو سعد کے بقول اسے بے حد پسند تھے۔ ان ہی گانوں میں سے ایک گانا انتخاب کر کے اسے سنتے ہوئے وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ کل شام ہی وہ ممی کے ساتھ ماہین کے پاس ہو کر آئی تھی۔ اس کی بھویں ٹھیک شیپ میں تھیں اور ماہین کے ہاتھوں نے اس کے چہرے کی جلد کو صاف کر دیا تھا اور اب اس میں چمک بھی آ گئی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو ایک جدید اور نئے اسٹائل میں کٹوایا تھا' جس سے اس کے چہرے کی بناوٹ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔

"زندگی کتنی حسین اور مزے کی ہے۔"

اس نے نئی خریدی جیولری میں سے ایک آویزہ کان میں پہن کر دیکھا۔ اسی وقت ایک گانا ختم ہونے پر وہ اس سے اگلا گانا چیک کرنے کے لیے دوبارہ اپنے لیپ ٹاپ کے قریب آئی۔ اس کی میل کا صفحہ اس کے سامنے کھلا تھا' ایک بار پھر سعد کی تصویریں دیکھ کر سائن آؤٹ کرنے سے پہلے یونہی اس کی نظریں میل کے شروع میں اپنے ایڈریس پر پڑی اور اس کی نظریں جیسے وہیں جم سی گئیں "اس یاد آوری پر جی بھر کے خوش ہوتے ہوئے وہ یہ دیکھنا بھول گئی تھی کہ "صرف تمہارے لیے محبت کے ساتھ" نامی میل اس کے علاوہ فلزا ظہور کے ایڈریس پر بھی بھیجی گئی تھی۔

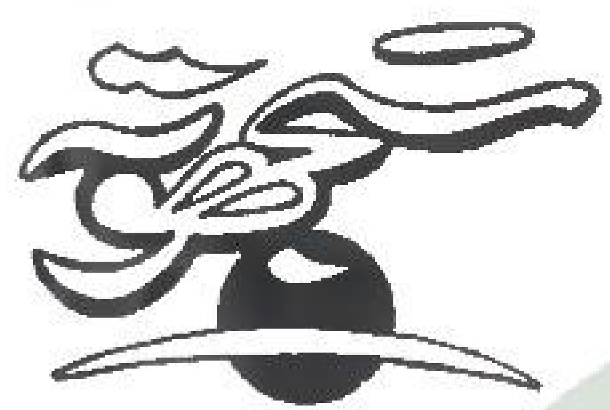
(باقی آئندہ ان شاءاللہ)

مبارک باد

سلویٰ علی بٹ کے قدموں تلے جنت تعمیر ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ اپنے گلشن کی اس ننھی کلی کا نام انہوں نے سلویٰ نور رکھا ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے دلی مبارک باد اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ سلویٰ نور کو دو جہاں کی کامیابیاں عطا فرمائے آمین۔

نعیمہ ناز سلطان



جب تک انہوں نے معمول کے مطابق ہاتھ منہ دھوئے' کپڑے بدلے اور صحن میں بچھے تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگایا' ساجدہ بیگم بے چینی سے انہیں دیکھتی رہیں کہ وہ کب فارغ ہوں گے۔ جیسے ہی انہوں نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگایا' وہ فوراً" آگے بڑھیں۔

"کھانا لے آؤں؟"

"نہیں نیک بخت! پہلے تم مجھے وہ خبر سنا دو' جسے سنانے کو تم بے چین ہو۔" شوہر صاحب مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

چالیس برس کا ساتھ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے مزاج کے سارے موسم اچھی طرح پہچانتے تھے۔ آج بھی بیگم کا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ کوئی بات ہے' جسے لبوں پہ لانے کو وہ بے قرار ہیں۔

اور یہی ہوا۔ وہ جھٹ سے پان دان گھسیٹ کر ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔ یہ بھی ان کی ایک خاص ادا تھی۔ اب وہ کھٹ کھٹ سروتا چلا کر چھالیہ کترتی جاتیں اور محلے بھر کی خبریں سناتی جاتیں۔ ایک ہاتھ میں سروتا' دوسرے میں چھالیہ لے کر وہ شروع ہو گئیں۔

"کونے والے بچل صاحب ہیں نا' ان کے گھر بہو آئی ہے۔"

"کس کی؟"

"ارے! ان کی اپنی بہو... سب سے چھوٹے بیٹے کی بیوی... نکاح کرکے کسی لڑکی کو لے آیا گھر میں۔" اب کے انہوں نے واضح اور صاف لفظوں میں "بریکنگ نیوز" سنائی۔

"اچھا پھر؟" اظہار صاحب نے ایک ہی لفظ کو خوب کھینچ کر کہا۔ "پھر ولیمہ کب ہے؟" انہوں نے فوراً" ہی سوال داغ دیا۔

"اے لو' تمہیں ولیمہ کی پڑ گئی۔" ساجدہ بیگم نے انہیں گھورا۔

"ذرا دیکھو تو' یہ نئی تانتی' کچھ زیادہ ہی بگڑ گئی ہے۔ پیار' محبت' شادی بیاہ ایک کھیل' مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ ماں' باپ کی' خاندان کی عزت' کسی بات کی کوئی شرم' کوئی لحاظ نہیں۔ اب جو بھی سن رہا ہے' تھو تھو کر رہا ہے۔" ساجدہ بیگم کے ہاتھ اور زبان دونوں ایک ساتھ چل رہے تھے... "ہمارے محلے میں یہ تیسرا کیس ہے۔ کوئی وبا پھیلی ہوئی ہے کیا؟" شوہر مسکرائے۔

"ارے! یہ سب ان ہی چیزوں کا کمال ہے۔ موبائل' کمپیوٹر' کیبل' نئی پود کا بیڑا غرق کرکے رکھ دیا۔ ہر کوئی پیار کے بخار میں مبتلا ہو کر والدین کا نام روشن کر رہا ہے۔" وہ کھٹا کھٹ یوں سروتا چلا رہی تھیں جیسے اس سے چھالیہ نہیں بلکہ نئی نسل کا گلا کاٹ رہی ہوں۔

"اللہ رحم کرے سب پر' ویسے پکایا کیا ہے؟"

"ماش کی دال پکائی ہے۔"

"اری نیک بخت!" ہفتہ دال" منا رہی ہو کیا۔ پہلے چنے کی دال' پھر مسور کی پھر پنج میل اب ماش۔" اظہار صاحب بلبلا اٹھے۔

"اے تو میں کیا کروں؟ پتا تو ہے تمہیں گھٹنوں سے لاچار ہوں۔ مجھ سے نہیں جایا جاتا بازار وازار۔ گوشت قیمہ کہاں سے لاتی اور چلو! کسی سے منگوا بھی لو تو اتنا روکڑا کہاں سے لاؤں؟ تمہاری وہ ذرا سی پنشن' اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ جو نوکری کر رہے ہو' اس کی تنخواہ میں یہ دال روٹی بھی عزت سے مل رہی ہے' غنیمت ہے۔" وہ کھٹا کھٹ سروتا چلاتے ہوئے بلاتوقف شروع ہو گئیں۔

"اچھا نیک بخت! اللہ تمہارے سہاگ کو سلامت رکھے۔ جو دال دلیہ ہے' وہی لے آؤ۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے گاؤ تکیے سے پھر ٹیک لگالی۔ بیگم صاحبہ کو کھانا گرم کرنے اور لانے میں دس' پندرہ منٹ تو ضرور لگتے۔ گھٹنوں کی گھٹتی بڑھتی تکلیف سے عاجز تھیں۔ ہمت کرکے گھر کے کام جیسے تیسے نمٹا ہی لیتیں۔

اب بھی وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوئی تھیں جب تک کھانا گرم کرکے لائیں اور تخت پر رکھی وہ تکیے سے ٹیک لگائے لگائے ایک جھپکی لے چکے



تھے۔

"اے سنو! سو گئے کیا؟"

"ہاں! کیا ہوا؟" وہ اک دم ہڑبڑا کر اٹھے۔

"کھانا کھالو۔"

"ہاں! ذرا ہاتھ منہ دھو آؤں۔" وہ آنکھیں ملتے ہوئے تخت سے نیچے اترے۔

"آپ کیا اپنے صاحبزادے کے ساتھ کھائیں گی؟" انہوں نے پہلا لقمہ منہ میں رکھا۔

"اب اتنی دیر انتظار نہیں ہوتا مجھ سے۔ دوائی کھانی ہوتی ہے۔ میں تو کھانا اور دوائی دونوں کھا کر فارغ ہوگئی۔" وہ بے نیازی سے بولیں اور ہاتھ کا پنکھا جھلتی رہیں' خود کو بھی اور شوہر کو بھی۔

"یاد ہے' شادی کے شروع شروع دنوں میں رات بارہ بجے تک میرا انتظار کرتی تھیں۔ جب میں آتا تھا تو دونوں مل کر کھاتے تھے۔" اظہار صاحب کھانا کھاتے ہوئے پرانی سنہری یادوں میں کھونے لگے۔

"ہاں وہ بھی ایک دور تھا' قناعت اور بے فکری کا۔ جب یہ نگوڑ ماری الٹی سیدھی بیماریاں تھیں' نہ نت نئے مسائل۔ اب تو بس....." وہ منہ ہی منہ میں بدبدا کر رہ گئیں۔

"ہوں۔" اظہار صاحب نے فقط ایک "ہوں" کے ذریعے ان سے اتفاق کیا۔

"اچھا! کل میں ذرا اجمل صاحب کے ہاں ہو آؤں؟"

"نئی دلہن کی رونمائی کے لیے؟"

"ہاں! ذرا دیکھ کر تو آؤں' کیسی لڑکی ہے۔ سامنے والی رشیدہ آپا دیکھ آئی ہیں۔ بتا رہی تھیں' بڑی خوب صورت ہے' بالکل انگریزن' نیلی آنکھیں' سنہرے بال' خوب گوری چٹی' دبلی پتلی۔" ساجدہ بیگم ان دیکھا سراپا بڑی مشتاقی سے بیان کر رہی تھیں۔

"بھلی لوکاں! نیلی کیا' ہر رنگ کی آنکھیں اب بازار میں عام دستیاب ہیں۔ جس رنگ کے' چاہو لینس لے لو..... اور سنہرے بال' ہیر ڈائی کا کمال بھی ہو سکتے ہیں' مگر خیر! ممکن ہے کہ قدرتی حسن ہی ہو۔ کچھ تو ہوگا' یوں ہی تو کوئی دیوانہ نہیں ہو جاتا نا۔" وہ کھانا کھا چکے تھے۔

ہاتھ دھونے اٹھے تو ٹرے بھی اٹھا کر کچن میں رکھ آئے۔

"اللہ جانے یہ لوگ بیٹے بہو کو رکھیں گے بھی یا نکال دیں گے۔ صفدر صاحب نے تو اپنے بیٹے کو گھر سے ہی نکال دیا تھا۔" ساجدہ بیگم نے خود کلامی کی۔

"سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے۔" قریب آتے اظہار صاحب نے ان کی خود کلامی سن لی تھی۔

"مگر وہ تو چھ مہینے بعد واپس بھی آگیا تھا' ایک بیٹا بھی ہوگیا۔ اب تو جیسے کوئی بات ہی نہیں۔" وہ خود سے ہی سوال و جواب کرنے میں مگن تھیں۔

"تمہاری بیگم بھی بس۔ نہ کوئی جواب ہے ان کا' نہ ثانی۔" اظہار صاحب بڑے اطمینان سے دوبارہ اپنی نشست پر براجمان ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

صبح ناشتے میں انہوں نے دونوں باپ بیٹے کو چائے پاپے پر ہی ٹرخا دیا' پھر ناشتے کے تھوڑے بہت برتن دھو کر باورچی خانہ صاف کر کے ہر شے ٹھکانے پر رکھ دی۔ دونوں کمروں' صحن اور برآمدے کی جھاڑو بیٹے نے لگا دی تھی۔ اب وہ بڑے آرام پر تخت پر براجمان تھیں۔

"پان لگاؤں؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" اظہار صاحب نے اخبار پر سے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"توبہ ہے' ذرا ذرا سے کاموں سے ایسی تھک جاتی ہوں جیسے پہاڑ کے پتھر توڑے ہیں۔" ذرا سانس قابو میں آئی تو وہ شروع ہوگئیں۔

"اسی لیے کہتا ہوں' بہو لے آؤ گھر میں..... آرام مل جائے گا تمہیں۔" شوہر صاحب نے کئی بار کا دیا ہوا مشورہ ایک بار پھر دیا۔

"درختوں پر ٹنگ رہی ہیں کہ اتار کر لے آؤں؟" وہ بھنا گئیں۔

"ارے! کہاں سے لے آؤں بہو؟ نکمے' نکھٹو کو کون دے گا اپنی لڑکی؟ ایک مہینہ کام کرتا ہے تو ایک مہینہ آرام۔ ڈھنگ سے لگ کر کچھ پیسے کمائے تو کچھ جوڑ جاڑ کر اس کی شادی کروں۔ ایک انڈا وہ بھی گندا..... اچھا بھلا ویلڈنگ کا کام آتا ہے۔ لگ کے کرے تو ٹھیک ٹھاک نوٹ کما لے' مگر کرے کون..... خدا دے کھانے کو' کون جائے کمانے کو۔"

ساجدہ بیگم تو بھری بیٹھی تھیں۔ بس چھیڑنے کی دیر تھی۔ ساز اتنی دیر تک' اتنی زور سے بجا کر باپ اور بیٹے دونوں کے کان جھنجھنا اٹھے۔ بیٹا من موجی تھا اور بہت گھنا بھی۔ باپ کے پند و نصائح اور ماں کی ڈانٹ پھٹکار بڑی شرافت اور آرام سے سر جھکائے سن لیتا' مگر کرتا وہی تھا جو اپنی مرضی ہوتی۔

"کہیں بات بھی لگاؤں تو کہاں' محلے میں' رشتے داروں میں' سب جگہ تو صاحبزادے نے اپنی شہرت کا ڈنکا بجا رکھا ہے۔ چیونٹیوں بھرا کباب کون اپنے دستر خوان پہ سجائے گا؟"

ساجدہ بیگم تو مانو' بھری بیٹھی تھیں' شروع ہوئیں تو ایسی کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔

وہ بولتی رہیں اور شوہر صاحب بے نیازی سے اخبار میں منہ دیے رہے۔ بیٹا اندر کمرے میں تھا' جہاں ان کی آواز صاف جا رہی تھی' مگر وہ بھی بلا کا ڈھیٹ۔ کان لپیٹے اپنے موبائل میں ہی مگن رہا۔ تھک ہار کر آخر وہ خود ہی خاموش ہو گئیں۔

اجمل صاحب کے گھرانے سے ان کی واقفیت اور سلام دعا اچھی تھی۔ اگلے دن ان کے گھر جا پہنچیں' مگر نئی دلہن گھر پر موجود نہیں تھی۔

"بہت افسوس ہوا سن کر یہ آج کل کے بچے بھی بس۔" ساجدہ بیگم نے رضیہ بیگم سے اظہار ہمدردی کیا۔

"کیا کریں بہن! ہوا ہی ایسی چل پڑی ہے۔ جوان اولاد کے آگے ہم بڈھے کیا چیز ہیں۔" رضیہ بیگم نے ایک آہ بھری۔

"ویسے دلہن ہے کہاں؟"

"ولیمہ کا جوڑا لینے گئی ہے میاں کے ساتھ۔"

"ولیمہ کا؟" ساجدہ بیگم حیرت سے اچھل پڑیں۔

بجائے بیٹے بہو کو گھر سے نکالنے کے' وہ ولیمہ کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

"ہاں! اب نکاح کر کے تو لے ہی آیا۔ تھوڑے سے لوگوں کو بلا کر خود ہی کر رہا ہے ولیمہ۔ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا' واویلا مچا کر کیا حاصل۔"

رضیہ بیگم کی باتیں' ساجدہ بیگم کو انوکھی لگ رہی تھیں' مگر وہ چپ ہو گئیں۔ بھلا کیا کہتیں بہن کا بیٹا بہو' ان کی مرضی' گھر سے نکالیں یا ولیمہ کریں۔ وہ کچھ کہنے والی کون۔ تھوڑی دیر دلہن کا انتظار کر کے گھر چلی آئیں۔ "اگلے ہفتے ولیمہ میں دیکھ لیں گے۔" انہوں نے سوچا۔

☼ ☼ ☼

وہ کوئی بہت زیادہ ہوشیار باش اور باریک بین قسم کی خاتون تو نہیں تھیں' مگر پھر بھی کچھ دنوں سے وقوع پذیر ہونے والے کچھ معاملات پر ٹھٹک ضرور گئی تھیں۔

پانچ منٹ میں شیو اور دس منٹ میں غسل کرنے والا سست الوجود بیٹا اب آدھا گھنٹہ محض شیو کرنے میں ہی لگا دیتا' خوب کھرچ کھرچ کر روزانہ شیو بنائی جا رہی تھی۔ غسل کے لیے اب خوشبودار صابن اور امپورٹڈ شیمپو' غسل خانے کی زینت بن گئے تھے۔ کہاں تو پہلے سیدھے منہ دھو کر ناشتا کر کے کام پہ نکل جاتا۔ اب بننے سنورنے میں ہی کتنی دیر لگا دیتا۔ شیو کے بعد آفٹر شیو' گھر سے نکلنے سے پہلے خوشبودار کریم' بالوں میں جیل لگا کر بڑے طریقے سے سیٹ کر کے آئینے میں ہر طرح سے اپنا جائزہ لیتا۔ باڈی اسپرے کر کے پھر گھر سے نکلتا۔ دو چار نئی پینٹیں اور شرٹس بھی لایا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ پہلی بار وہ لگاتار چار مہینے سے کام پر جا رہا تھا' وہ بھی ایک بھی چھٹی کیے بغیر۔ ساجدہ بیگم غش نہ کھاتیں تو اور کیا کرتیں۔

شوہر سے اپنے شکوک کا اظہار کیا تو وہ ہنس پڑے۔

"پہلے جب وہ یہ سب نہیں کرتا تھا' تب بھی تمہیں شکایت تھی۔ اب وہ خود کو بدل رہا ہے تو کیا پریشانی ہے تمہیں؟"

"میں تو کہتی ہوں کہ ضرور کوئی چکر ہے۔" انہوں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

"کیسا چکر؟"

"کسی لڑکی کے چکر میں تو نہیں ہے یہ؟" انہوں نے رازدارانہ انداز میں جھک کر شوہر نامدار کو مخاطب کیا۔

"ارے! بلاوجہ کے وہم پال رہی ہو تم۔ اس عمر میں سب ہی لڑکے شوقین ہوتے ہیں۔" اظہار صاحب نے ہنس کر مکھی اڑائی۔

"اور مسلسل چار مہینے سے نوکری پہ جا رہا ہے' ایک بھی چھٹی کیے بغیر... وہ؟"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو رہا ہے۔ تمہیں تو اس بات پہ خوش ہونا چاہیے۔ بے کار میں الٹا سیدھا سوچ کر پریشان ہو رہی ہو۔" اظہار صاحب نے ان کے شکوک و شبہات کو اہمیت دیے بغیر بات ہی ختم کر دی

"اللہ جانے۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

آتی سردیوں کی ایک گوارا ٹھنڈی میٹھی سی سرمئی شام تھی۔ رات میں پکانے کے لیے قیمہ بھگویا ہوا تھا۔ اسے چھلنی میں ڈال کر نچڑنے کو رکھا اور خود پیاز' پلیٹ اور چھری لے کر تخت پر آن بیٹھیں۔ دروازے پر کھٹکا ہوا اور بیٹے کی آواز آئی۔

"آج جلدی آگیا۔" انہیں فوراً "یہی خیال آیا۔

عمران اندر آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ کالے برقعے میں ملفوف ایک اور وجود اس کے ہمراہ تھا۔

"یہ میری اماں ہیں۔ سلام کرا نہیں۔" عمران نے اپنے ساتھ کھڑے وجود کو بڑی بے تکلفی سے مخاطب کیا۔

"یہ کون ہے؟" ساجدہ بیگم نے اس کا منمناتا سلام سننے سے پہلے ہی حیرت سے دونوں کو دیکھتے ہوئے سوال داغا۔

"اماں! یہ تمہاری بہو ہے... میری بیوی۔" عمران نے دریا کو کوزے میں بند کیا اور وہیں تخت پر بیٹھ کر جھک کر اپنے جوتے اتارنے لگا۔

"بہو؟ بیوی؟" ساجدہ بیگم اک دم ہونق ہو گئیں۔

"ایک منٹ ٹھہرو اماں! ابھی بتاتا ہوں ساری کہانی۔ ویسے کیا پکا رہی ہو؟" وہ جوتے اتارتے ہوئے بڑے اطمینان سے بول رہا تھا۔

"آلو قیمہ۔" وہ اتنی حق دق تھیں کہ بے دھیانی میں اس کے سوال کا جواب بھی دے گئیں۔

"تم ایسا کرو' اپنا یہ تام جھام اتار کر ہاتھ منہ دھو لو اور یہ سامنے کچن ہے۔ آلو قیمہ پکانا ہے۔ چیزیں وہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے نکال لینا۔" عمران نے لڑکی کے لیے ہدایت نامہ جاری کیا اور پھر ماں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اماں! یہ منیرہ ہے۔ جہاں میں کام کرتا ہوں' وہاں قریب ہی یہ ایک بیوٹی پارلر میں کام کرتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو پسند آگئے۔ ہم نے شادی کر لی۔" عمران نے بے حد مختصر لفظوں میں پوری کہانی سنا دی۔

"اچھا! اگر تجھے کوئی لڑکی پسند آگئی تھی تو تو نے ماں' باپ سے ذکر تک کرنا گوارا نہ کیا؟ خود ہی چپ چپاتے نکاح کر کے لے آیا۔ غیروں سے بھی بدتر ہو گئے ہم؟" ساجدہ بیگم جذباتی ہو گئیں۔

"یہ بات نہیں ہے اماں! بھلا ماں' باپ سے بڑھ کر دنیا میں اور کون ہوتا ہے؟ میں نے پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ تم راضی نہیں ہوتیں۔" عمران نے انہیں تسلی دیتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

"اے! وہ کیوں بھلا؟ کیوں نہ راضی ہوتی میں؟" انہوں نے ناک کی پھننگ پر انگلی جمائی۔

"اس کی پہلے شادی ہوئی تھی' طلاق ہو گئی۔" آہستہ سے بولا۔

"ہائے ہائے! طلاقن سے بیاہ کر لیا تو نے۔ کوئی ڈھنگ کی لڑکی نہ ملی تجھے شادی کے لیے؟" غصے اور رنج کے مارے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

"تو اماں! میں کون سا کنوارا ہوں۔ میری بھی تو دوسری شادی ہے۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"تیری حرکتوں کی وجہ سے تجھے چھوڑ کر گئی تھی وہ۔ تیرے جیسے نکھٹو کو کب تک برداشت کرتی' ورنہ کتنی اچھی تھی بے چاری۔ ایسی اچھی روٹیاں پکاتی تھی' گول گول' سنہری' نرم۔" ماں نے بیٹے کو آئینہ دکھاتے ہوئے اپنی پچھلی بہو کو یاد کیا۔

"اب یہ کیا فالتو باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو؟ بغیر نوٹ خرچ کیے بہو گھر میں آگئی۔ قدر کرو اور عیش کرو۔" بیٹے نے کھڑے ہوتے ہوئے انہیں مشورہ دیا اور فریش ہونے چلا گیا۔

"یہ پیاز' قیمے کے لیے ہے؟" وہ گم صم سی اس نئی افتاد سے ٹھیک طرح نمٹ بھی نہیں پائیں تھیں کہ ایک اجنبی آواز کانوں میں پڑی۔ وہ اچھل گئیں۔

"قیمے کے لیے ہے نا؟" "بہو" نے پلیٹ اور چھری اٹھاتے ہوئے تصدیق چاہی۔

"ہاں! مگر..." ساجدہ بیگم نے بے بسی سے اسے دیکھا' جواب چھپاک سے پھر کچن میں گھس گئی تھی۔

"کوئی سنے گا تو کیا کہے گا؟ تھو تھو کرے گا۔ اے ہائے بیٹے! یہ کیا کیا تو نے۔" ان کے خیالات کی رو دوسری طرف مڑ گئی۔ محلے والے' رشتے دار' جاننے والے کیسی ہنسی اڑائیں گے۔ لوگ لعنت ملامت کریں گے۔ سوچ سوچ کر ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

پورے گھر میں مسالا بھننے کی لذیذ اور اشتہا انگیز خوشبو پھیل رہی تھی' جب اظہار صاحب گھر میں داخل ہوئے۔

"بھئی واہ! آج تو بڑی لذیذ خوشبو آرہی ہے گھر میں۔" ادھر ادھر دھیان دیے بغیر وہ اپنی بیگم کو دیکھ کر چہکے۔

"ہاں! تمہاری نئی نویلی بہو جو کھانا پکا رہی ہے۔" انہوں نے تڑخ کر شوہر کے سر پر بم پھوڑا۔

"ہائیں؟" وہ حیران پریشان وہیں کھڑے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

"اس سے کہہ دو' ایک ہفتے کے اندر اندر کہیں اور

ٹھکانا کرلے اپنا۔ ان دونوں کو اس گھر میں رکھ کر میں لوگوں کے مذاق اور طنز کا نشانہ نہیں بن سکتی۔" اگلے روز وہ روہانسی ہو کر اپنے شوہر سے بات کر رہی تھیں۔

"اچھا! ٹھیک ہے۔ جیسے تم کہو گی ویسا ہی ہو گا۔ میں کہہ دوں گا عمران سے۔" اظہار صاحب کل سے لے کر اب تک مسلسل ان کی ہر ممکن دل جوئی میں لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ساتھ سمجھانے کی کوشش بھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے' اسے قبول کرلیں اور غصہ تھوک دیں مگر ساجدہ بیگم کسی طور کوئی بات سننے کو تیار تھیں نہ ماننے کو۔

"ٹھیک ہے اماں! دیکھ لیتا ہوں کوئی گھر کرائے کا۔ اب جو یہ ایک ہفتہ ہے' اسے تو سکون سے گزارو' پھر جیسا تم کہو گی' ویسا ہو گا بس۔" بیٹا سامنے بیٹھا تھا' بول پڑا۔

"ہاں' ہاں! ٹھیک ہے۔ نہیں کروں گی لڑائی جھگڑا تیری بیوی سے۔" وہ بہت چڑچڑی ہو رہی تھیں۔ تین چار دن میں ہی ان کی دنیا جیسے یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔

صبح ناشتے میں خوب ساری پرتوں والے نرم گرم پراٹھے' کبھی سالن' کبھی اچار' کبھی دہی تو کبھی انڈے کے ساتھ' تخت پر بیٹھے بیٹھے مل جاتے۔ دوپہر کا کھانا' سہ پہر کی چائے' رات کا دستر خوان' انہیں اب کسی شے کے لیے تردد نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ لپک جھپک پورے گھر کی صفائی بھی ہو جاتی۔ غسل خانہ' باورچی خانہ سب دھل دھلا کے صاف ستھرے چمکتے رہتے۔

آج پانچواں دن تھا۔ وہ مشین لگائے ہوئے تھی۔ گھر کے ہر کونے کھدرے سے میلے کپڑے اکٹھے کر کے صحن میں پہاڑ بنایا ہوا تھا۔

"اے بی بی! ایک بات تو بتاؤ۔" پان دان کھول کر گلوری بناتے ہوئے انہوں نے پہلی بار "اسے" مخاطب کیا۔

"جی!"

"پہلے میاں سے طلاق کیوں لی تم نے؟" ان کا لب لہجہ سراسر تفتیش والا تھا۔

"نکھٹو تھا۔ نہ کام نہ دھندا۔ ہر وقت گھر میں پڑا رہتا تھا۔ روز روز کی کل کل سے تنگ آ کر چھوڑ ہی دیا۔" وہ بڑے اطمینان اور اعتماد سے ان کے سوال کا جواب دے رہی تھی۔

"ارے! تو یہ کون سا ذمہ دار شخص ڈھونڈا ہے تو نے؟ یہ بھی ایک نمبر کا نکما' نکھٹو ہے۔ چار دن لگ کر کہیں کام نہیں کرتا۔ دوسری بار بھی دھوکا کھالیا نا۔" وہ بلبلا کے بولیں۔

"نہیں! اب ایسی بات نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ چار دن ہی سہی مگر آپ کا بیٹا کام کے لیے گھر سے نکلتا تو ہے نا۔ وہ کم بخت تو چار دن کی زحمت بھی نہیں کرتا تھا۔ عمران پر ذمہ داریاں پڑیں گی تو چار کی جگہ چھ دن بھی آٹھ دن بھی کام پر جائے گا۔ اتنا تو بھروسا ہے مجھے۔"

"اور جو یہ تیرے بھروسے پہ پورا نہ اترا تو؟" انہوں نے جانچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا' جو مشین سے کپڑے نکال کر نچوڑ رہی تھی۔

"اللہ مالک ہے۔ میں نے بیوٹیشن کا کورس کیا ہے' ہاتھ بھی رواں ہے۔ سلائی بھی اچھی آتی ہے۔ گھر بیٹھے کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گی۔" وہ کپڑے کھنگالنے بیٹھ گئی۔

"جب اتنا ہنر ہے ہاتھ میں تو پہلے میاں کا ساتھ ہی دے دیتی۔ خوامخواہ طلاق کا ٹیکہ لگوایا ماتھے پہ۔" ساجدہ بیگم بے دھڑک ہو کر بول رہی تھیں۔

"اس وقت کہاں تھے یہ ہنر ہاتھ میں۔۔۔ طلاق کے بعد ہی تو عقل آئی کہ کچھ نہ کچھ ہنر اپنے ہاتھ میں ہونا چاہیے کہ کسی کی محتاجی نہ ہو۔" وہ ماتھے پہ بل لائے بغیر ان کے دل شکن سوالات کے جوابات دے رہی تھی۔

"میکے میں کون کون ہے؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے اگلا سوال کیا۔

"چار بھائی ہیں' دو بہنیں۔ سب شادی شدہ ہیں۔ ماں' باپ فوت ہو گئے۔"

"جب ماشاء اللہ اتنے سارے لوگ ہیں پیچھے تو اپنے گھر سے ہی عزت کے ساتھ رخصت ہو جاتی۔ یہ کیسے شادی کر کے بھاگ کے [illegible] سنے تو کیا کہے"

ساجدہ بیگم بھی بس اپنے نام کی ایک ہی تھیں۔ دل میں آئی بات کو زبان پر لانے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتیں' چاہے وہ بات کڑوی ہو یا میٹھی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ بھلا کون لڑکی چاہتی ہے کہ وہ گھر والوں کی مرضی اور دعاؤں کے بغیر گھر کی دہلیز پھلانگے؟ میں نے گھر میں بات کی تھی عمران کے بارے میں۔ اپنے بھائیوں سے ملوایا تھا۔ بھائی' بھابھیوں کے نہ ہاتھ کشادہ ہیں نہ دل۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ جو کرنا ہے' اپنے بل بوتے پہ کرلو' ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ نہ خرچ کرنے کے لیے نہ دینے کے لیے۔"

وہ چند لمحے خاموش رہی۔

"بڑی بہن بہنوئی نے سر پہ ہاتھ رکھا۔ نکاح ان کے گھر ہوا تھا۔ وہیں سے رخصت ہوئی ہوں۔" دوبارہ وہ دھیرے سے بولی تھی۔ آواز میں ہلکی سی نمی گھلی ہوئی تھی۔

"اچھا!" ساجدہ بیگم نے کچھ بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"ارے! میں نے کہا' سنتے ہو۔" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں شوہر کو پکارا' جو چھٹی والے دن کرکٹ میچ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پاکستان غیر متوقع طور پر فتح کے قریب تھا۔ اسی لیے ان کا انہماک اپنے عروج پر تھا۔

"ہاں!" بیگم کی زوردار آواز پہ وہ ہڑبڑا اٹھے۔

"کب ختم ہو گا یہ موا میچ؟"

"بس ہونے ہی والا ہے۔ کہو! کیا بات ہے؟" اظہار صاحب کی نظریں اور توجہ ٹی وی پر ہی تھیں۔

"پہلے اس کھیل کود سے فارغ ہو لو' پھر کہوں گی۔"

"ارے! بس کھیل ختم۔۔۔ یہ لو بھئی! پاکستان جیت گیا۔ یہ لوگ بھی کمال کرتے ہیں۔ کبھی تو ایسے پٹ جائیں گے جیسے بچے ہوں اور کبھی ایسے پیٹ دیں گے کہ سامنے کوئی ٹھہر ہی نہ سکے۔" اظہار صاحب بیگم کی طرف متوجہ ہو کر میچ پر تبصرہ کرنے لگے۔ خوشی کے مارے [illegible]

"بھئی بہو! پاکستان میچ جیت گیا۔ اسی خوشی میں ایک کپ چائے تو پلا دو۔" انہوں نے کمرے سے ہانک لگائی۔

"ابھی لاتی ہوں ابو! بس پانچ منٹ۔"

"دو' تین روز بعد تو بہو بیگم اور بیٹا چلے ہی جائیں گے۔" اظہار صاحب نے بیگم صاحبہ کے سامنے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

"ایک بات کہنا تھی تم سے۔" ساجدہ بیگم کچھ سوچتے ہوئے شوہر سے مخاطب ہوئیں۔

"ہاں! کہو۔"

"میں سوچ رہی تھی' کیوں ناں' ہم عمران کا ولیمہ کردیں۔ تھوڑے سے افراد بلا کر ایک چھوٹی سی تقریب کر دیتے ہیں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بول رہی تھیں۔

"مگر۔۔۔ تم تو۔۔۔ تم نے تو ایک ہفتے کا الٹی میٹم دیا ہوا تھا گھر خالی کرنے کا؟" اظہار صاحب اس اچانک کایا پلٹ پر حیران تھے۔

"بس! کیا کریں' اکلوتی اولاد ہے۔ چلو! غلطی ہو گئی۔ اب خود سے کیسے الگ کردیں؟ دونوں اکیلے کہاں رہیں گے' کیسے رہیں گے؟ اور پھر ہم اپنے بیٹے کے بغیر کیسے رہیں گے۔۔۔ اور پھر سچی بات یہ ہے کہ گھر داری اب میرے بس کی بھی بات نہیں۔" وہ دھیرے دھیرے سے بول کر چپ ہو گئیں۔

"سوچ لو بیگم! لوگ کیا کہیں گے؟ دنیا والوں کا سامنا کر لو گی؟" اظہار صاحب نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

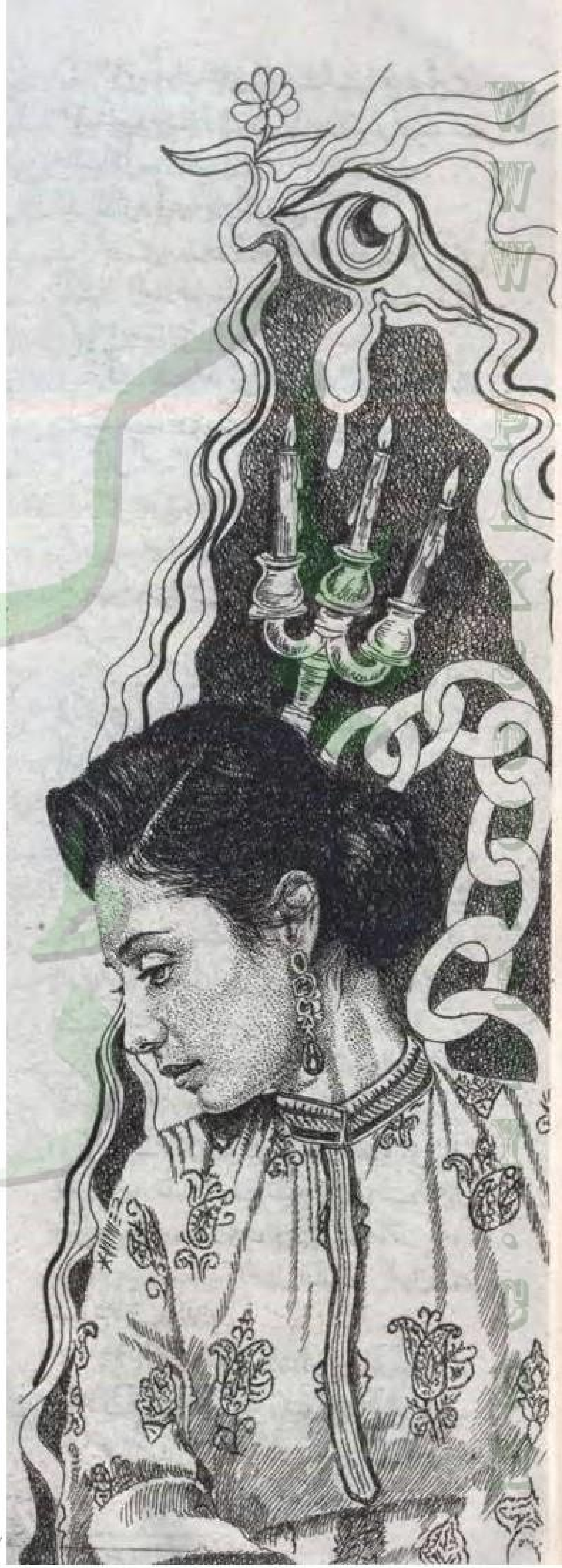
"ارے! بھاڑ میں جائیں لوگ۔ مجھے کیا کسی سے؟ یہاں کون پارسا ہے؟ سب کے گھروں کی سب کہانیاں جانتی ہوں میں۔۔۔ اور پھر جوان اولاد کے ساتھ سمجھوتا تو کرنا ہی پڑتا ہے نا۔" انہوں نے تائید نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔

"بالکل! ٹھیک کہا تم نے۔ جوان اولاد کے ساتھ سمجھوتا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔" اب کی بار اظہار صاحب کھل کر مسکرا دیے۔

☼

رشکِ حبیبہ





"بیٹے کی شادی کے بعد بہو کہیں میرے کماؤ فرماں بردار بیٹے کو ورغلا کر مجھ سے دور نہ کردے۔ میرا بیٹا اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی اور میں گھر کے کاٹھ کباڑ کی حیثیت نہ اختیار کرجاؤں..... جسے بہو رانی جیسے مرضی چاہے رکھے 'برتے اور جب جی چاہے اٹھا کر باہر پھینک دے۔"

یہ خدشات ہر ماں کے دل میں اس وقت جنم لیتے ہیں 'جب بیٹے کے سر پہ سہرے کے پھول کھلنے کا وقت آتا ہے..... اور پھر جس لڑکی کے لیے بیٹا ماں سے خود خواہش ظاہر کرے۔ بیٹے کے دل و نظر میں اس لڑکی کی اہمیت کا اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔

مجھے دھچکا ہی تو لگا تھا..... اپنے شریف و فرماں بردار بیٹے کے منہ سے اس مہ جبین کا ذکر سن کر' جس نے اسے میرے سامنے زبان کھولنے کی جرات نواز دی۔ بھلا وہ میرا ممتا کی خوشبو سے مہکتا آنچل چھوڑ کر کسی مہ جبین' دل نشیں کے رنگین آنچل کی طرف متوجہ ہوا ہی کیسے؟

"ہوگی کوئی آوارہ مزاج..... ادائیں دکھانے والی لڑکی۔ ہونہہ! میرے معصوم بچے کو پھانس لیا۔"

میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا۔ یوں بھی ہر ماں کے لیے اس کا بچہ دنیا کا واحد "شریف النفس شخص" ہوتا ہے اور باقی سارے "ابلیس" جو بہکا کر ہی دم لیں۔

اب میں کوئی خرانٹ' سخت دل' ظالم جابر قسم کی ماں تو تھی نہیں کہ اپنے اکلوتے بیٹے کی خواہش رد کردیتی۔ یوں بھی مجھے اپنے بیٹے کی فرماں برداری بہت بھاتی تھی۔ جب وہ اپنی خواہش بیان کرنے کے بعد میرے چہرے کے تاثرات ناگوار محسوس کرکے میرے گھٹنے پکڑ کے بیٹھ گیا۔

"اماں! آپ بس ایک بار دیکھ لیں اسے۔ اگر آپ کو پسند نہ آئی تو میں دوبارہ نام تک نہیں لوں گا۔ سوچوں گا بھی نہیں اس کے بارے میں۔ لیکن آپ صرف ایک بار اس کے گھر چلیں۔ مل کر دیکھیں..... آپ اسے رد نہیں کرسکیں گی..... وہ بہت اچھی ہے۔ آپ میری خوشی سمجھ کر صرف دیکھ آئیں۔ اگر آپ کی رضامندی نہ ہوئی تو میں آپ کی خوشی سمجھ کر بھول جاؤں گا اسے..... میرا وعدہ ہے آپ سے۔"

میرا لمبا چوڑا' خوب صورت' گبھرو جوان بیٹا..... بچوں کی طرح مجھے منا رہا تھا۔

میں نے کہا نا..... میں سخت دل' ظالم' جابر ماں تو تھی نہیں..... مجھے اپنے بیٹے سے بہت محبت ہے۔

میں نے ترچھی نظروں سے اس کا حسرت آمیز چہرہ دیکھا' پھر ہولے سے مسکرا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ جیسے جی اٹھا تھا میرا دل بھی آسودہ ہوگیا۔

انصر نے خدیجہ کو کہیں رستے میں دیکھا تھا اور پہلی ہی نظر میں اس کا اسیر ہوگیا۔ گھر تک پہنچنا بہت کٹھن مرحلہ نہ تھا۔

میں خدیجہ کے گھر میں قدم رکھنے سے پہلے یہ فیصلہ کرچکی تھی کہ کسی بھی صورت یہ لڑکی میری منظور نظر نہیں ٹھہرے گی۔ اسے رد کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ ہی لوں گی میں۔

مگر اسے دیکھنے کے بعد اس کی معصومیت اور بے وقوفی کی حد تک بھولپن نے میرے خیال بدل دیے۔ وہ انیس برس کی ہوگی۔ ایک غریب اور یتیم لڑکی۔ باپ کے انتقال کے بعد چچا چچی کے گھر میں اپنی ماں کے ہمراہ سکونت پذیر تھی۔

وہ گھر ان کے چچا چچی کا نہیں' بلکہ خدیجہ کے باپ کا تھا۔ یہ بات مجھے انصر نے بعد میں بتائی۔ یعنی اس کے چچا چچی ایک غریب بے سہارا اور یتیم لڑکی کا مال غصب کیے بیٹھے تھے۔ خیر یہ تو ان کا آپس کا معاملہ تھا۔

میں نے سوچا تھا' خدیجہ کوئی تیز طرار' طرح دار سی لڑکی ہوگی اور یقیناً "بہت خوب صورت بھی ہوگی" مگر میرا خیال غلط نکلا۔ وہ خاصی بے ضرر دکھائی دے رہی تھی۔

خوب صورت بھی بہت نہیں۔ بس واجبی سی خوب صورتی جو لڑکیوں میں کم سنی کا نکھار ہوتی ہے اور اس کم عمری پہ سادگی و بھولپن کا تڑکا۔

اس کی صورت میں میرا تو نہیں' مگر کسی مرد کا دل موہنے کی قابلیت ضرور تھی اس کی ماں بھی شریف عورت لگ رہی تھی۔ کوئی بناوٹ کوئی خوشامد نظر نہ آئی اس عورت کے برتاؤ میں۔ وہ بالکل عام سے مہمان کی طرح خوش دلی سے ملی۔ مگر میرے سرد رویے پر وہ بھی محتاط سی ہوگئی۔ شاید وہ میری گردن میں لگا کلف دیکھ چکی تھی۔ سمجھ گئی ہوگی کہ دال تو ادھر گلنے کی نہیں۔ خواہ مخواہ خاطر توجہ دینے کی کیا ضرورت.....

"خود دار و وضع دار بھی ہوسکتی ہے۔" دل نے فوراً "خوش فہمی غرق کی۔

"دفع کرو..... میں نے کون سی ادھر رشتہ داری کرنی ہے۔" میں نے بے نیازی سے کندھے جھٹکے۔ مگر جب ایک بار پھر انصر میرے سامنے بیٹھا آنکھوں میں ڈھیروں امید کی کرنیں سجائے مجھ سے میری رائے جاننے کا خواہاں ہوا تو نجانے کیسے بے اختیار ..... میں نے اس کی خوشی کو اپنی رضامندی کی رسید دے دی۔

"میری خوشی تمہاری خوشی سے الگ تھوڑی ہے۔ مجھے بھی ڈھونڈ کر سولانی ہی تھی۔ تم نے ڈھونڈ لی تو اچھا

ہی کیا نا۔ اب بیٹا! میں تو ارمانوں سے بہو رخصت کرالاؤں گی۔ مگر آنے والی بری بھلی جیسی بھی نکلے تمہاری قسمت۔۔۔ میرا کیا ہے' وقت تمام ہوا۔ اب سانسیں پوری کرنے کو پڑ رہوں گی کسی کونے میں۔۔۔"

میں نے اس کے اعصاب پر اچھی طرح جذباتی دباؤ ڈالا اور وہ دباؤ میں آبھی گیا۔

"اماں! میں آپ کو اپنے انتخاب سے کبھی مایوس ہونے نہیں دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

وہ جگ مگ کرتی آنکھوں اور خوشی سے تمتماتے چہرے سمیت مجھے بے اختیار "ماشاءاللہ" کہنے پر مجبور کرگیا۔

ویسے بھی خدیجہ میں وہ ساری خصوصیات تھیں جو مجھے اپنی بہو میں درکار تھیں۔

سب سے پہلے تو اس کی کم صورتی اس کے حق میں کام آگئی۔ کوئی حور پری' چاند کا ٹکڑا بھولا کر مجھے اپنے بیٹے کو ہاتھ سے گنوانا تھوڑی تھا۔

بے شک ابھی انصر اس کم شکل سی لڑکی کا اسیر تھا۔ اور شاید ساری زندگی رہے۔ مگر میرے خوبرو بیٹے کو ساری عمر اس لڑکی پر برتری حاصل رہے گی۔ پھر ساری زندگی وہ لڑکی بھی سہم سہم کر گزارے گی کہ نجانے کب اس وجیہہ و شکیل مرد کا دل اس کی کم صورتی سے پھر کر کسی مہ جبین میں جا اٹکے۔

یہ نا نفسیاتی تجزیہ۔۔۔ مانتے ہیں نا میری سمجھ داری کو۔۔۔ کہیں آپ مجھے شاطر عورت تو نہیں سمجھ رہے؟ چلیں! آپ کی مرضی۔ آپ اپنی سمجھ کے مطابق سمجھیں۔ میں اپنی سمجھ کے مطابق سمجھاتی ہوں۔ تو بات یہاں یہ تھی کہ خدیجہ کی کم عمری' خدیجہ کی غریبی' کم اعتمادی اور اس کا غریب بیک گراؤنڈ ہر چیز مجھے اس کے حق میں راضی کر رہی تھی۔ وہ لڑکی ہر طرح سے میرے زیر دست آرہی تھی تو اب مجھے کیا پڑی تھی کہ میں اسی جیسی کسی دوسری کی تلاش میں جوتیاں چٹخاؤں۔ پھر اگر میں انصر کی خواہش رد کر بھی دیتی تو بے شک وہ زبان سے کچھ نہ کہتا' مگر اس کے دل میں ایک خلش میرے خلاف ضرور پیدا ہو جاتی۔ میں نے اس کی پسند پر رضا مندی دی تو سمجھیں ایک گول اور کرلیا۔

کیسے۔۔۔؟ ارے بھئی! اب وہ اپنی بیوی کو میرا خیال رکھنے اور میرا دل جیتنے کی کوشش کرتے رہنے کی تاکید کرے گا نا؟ پھر آگے کی زندگی میں میرے پاس اس کی شکایت انصر سے کرنے کا مضبوط جواز بھی ہوگا۔ بہ وقت ضرورت۔۔۔

"تمہیں ہی پسند تھی' اب بھگتو۔" بیٹے کو دینے کے لیے تگڑا سا طعنہ ابھی سے دماغ میں کلبلایا۔

ارے! آپ کہیں یہ تو نہیں سوچ رہے کہ میں اپنے بیٹے کا گھر بسانا ہی نہیں چاہتی۔۔۔ یا پھر یہ کہ بہو لانے کے بعد میں دونوں میاں بیوی میں زبردست قسم کی نااتفاقی اور نفرت پروان چڑھا کر دونوں کو علیحدہ کر دینا چاہتی ہوں؟

میں نے کہا نا کہ میں کوئی کٹھور' خرانٹ عورت نہیں ہوں۔ میں اپنے شہزادے کو ہنستا بستا دیکھنا چاہتی ہوں میرے ذہن کے کسی گوشے میں اپنے بیٹے بہو کی زندگی اجیرن کرنے کا خیال موجود نہیں۔ میں تو خدیجہ کو پورے دل' سچی خوشی اور ڈھیروں ارمان سے بیاہ کرلانے والی ہوں۔۔۔ آخر کو میری واحد بہو ہے۔

لیکن پھر بھی پہلو میں ایک چبھن سی رہ رہ کر اٹھ رہی ہے۔ بار بار پر وہ خیال پر یہ سوچ ابھر آتی ہے کہ کہیں اس کے دماغ میں یہ غرور نہ سما جائے کہ وہ پیا من بھائی ہے تو اب اس گھر کی راجدھانی میں اس کا راج قائم ہو جائے گا۔ اتنی وہمی تو میں ہوں۔ ہر عورت ہوتی ہے۔

گو کہ اس سے ملنے کے بعد اس دبو شخصیت کی مالک خدیجہ سے مجھے کسی طرح کا خوف ہونا نہیں چاہیے۔ مگر کیا کیجئے صاحب۔۔۔ عقل کا خناس کسی کل قرار نہیں لینے دے رہا ہے۔

بڑی سوچ بچار کے بعد دماغ نے ایک ترکیب سجھا ہی دی مجھے۔ کیوں نہ خدیجہ پر اپنی اہمیت واضح کی جائے؟ ارے! کیا کہا۔۔۔ میں ماں ہوں۔ مجھے اہمیت واضح کرنے کی کیا ضرورت؟ جی جی!۔۔۔ مجھے اپنی اہمیت سے زیادہ خدیجہ کی سسرال میں اس کی بے وقعتی واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلے ہی مرحلے پر اسے باور کرانا ضروری ہے کہ یہاں سب کچھ اس کی من مرضی سے نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہاں فی الوقت میری حکومت ہے۔

اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں کوئی لمبے چوڑے جہیز کا مطالبہ کرنے والی ہوں یا پھر جائیداد وغیرہ کی کوئی کڑی شرط رکھنے والی ہوں تو اس کے علاوہ کیا کہا جائے کہ آپ واقعی بڑی منفی سوچ رکھتے ہیں۔

آپ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میں ظالم' کٹھور دل' جابر عورت نہیں ہوں نا۔

میں تو خدیجہ کو پورے دل' سچی خوشی اور ڈھیروں ارمان سے بہو بنا کرلانے والی ہوں۔ جی ہاں! ڈھیروں ارمان سے۔۔۔

☼ ☼ ☼

اور یہ ہے میرے ڈھیروں ارمانوں کی پرانی پیٹی۔۔۔

ارے! آپ رک کیوں گئے۔ اسٹور روم میں گرد و غبار تو ہوتا ہے ہی ہے۔

کوئی سستے والے کپڑے نہیں۔ سب اپنے دور کے بہترین اور مہنگے کپڑے ہیں۔ تھوڑے سے اولڈ فیشن ہیں تو کیا ہوا۔

یہ جو سرخ چبھتے رنگ کا کپڑا ہے نا۔۔۔ ارے! یہ ہی جو ساٹن کے چکنے چمکیلے کپڑے پر۔۔۔ سنہری پلاسٹک جیسے تاروں سے بنارسی کی طرح ڈیزائننگ کی گئی ہے۔ ارے! کیا بھلا سا نام ہے اس کا۔۔۔ اب تو ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ شاید بروکیڈ۔۔۔ ہاں بروکیڈ کپڑا ہے۔۔۔ آج کل شیفون بنارسی بہت مقبول ہے نا تو یہ بھی بنارسی جیسا ہے۔۔۔ اچھا ہے نا!۔۔۔ اور بھی دیکھیں! یہ چیرمین' شامہ' شیشہ بیلیں۔۔۔ یہ سارے ڈھیر کپڑے۔۔۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے ہیں۔ سب کو دھوپ دکھانی پڑے گی۔۔۔ کافور کی مہک سی بسی ہے ساروں میں۔

میں تو سچ مچ بڑی محبت کرتی ہوں اپنے لعل سے۔۔۔ تب ہی تو جس طرح مائیں اپنی بیٹیوں کا جہیز ان کے بچپن سے جوڑنا شروع کر دیتی ہیں' اسی طرح میں نے بھی اپنی بہو کی بری کافی پہلے سے تیار کر رکھی تھی۔۔۔ مانتے ہیں نا میری دور اندیشی کو۔۔۔؟

کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ یہ سارے میری بری کے وہ کپڑے ہیں' جو میں نے اپنے سسرالی رشتہ داروں سے ازلی بیر کے باعث بعد میں سلوا کر پہننا بھی گوارا نہیں کیے۔ تو اب میں کیا کہوں؟ آپ کا جو دل چاہے سمجھیں۔۔۔ اب میں آپ کو کیا صفائیاں دیتی پھروں؟ مجھے تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ہے۔ مہینہ بھر بعد بیٹے کی بارات جانی ہے اور تیاری بس' ان کپڑوں کی ہی ہے۔۔۔ وہ بھی میری سمجھ داری کی وجہ سے' ورنہ بھلا ابھی میں اکیلی جان کیا کیا خریداریاں کرتی پھرتی۔۔۔ لیکن ابھی بھی بہت کام ہیں۔ پرانے کپڑوں کی نئے ڈیزائننگ میں سلائی کروانی پڑے گی تاکہ بہو پہنے تو پیاری بھی لگے۔ درزی کی محنت بھی گزارے لائق ہی کام آسکے گی۔ میری بہو رانی خیر سے کم شکل جو ہیں۔۔۔ ہفتے' پندرہ دن کی محنت کچھ کام نبٹا سکے گی۔

اف! پاؤں میں ابھی سے ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ اتنی محنت سے خریداریاں ہوتی ہیں کہ مت پوچھیں۔۔۔ چلتے چلتے جوتیاں ٹوٹ جاتیں۔۔۔ آپ سوچ رہے ہوں گے' پتا نہیں کیا دنیا سے نرالی خریداری کروں گی میں۔۔۔

بھئی! آپ نہیں سمجھ سکتے نا!۔۔۔ ہفتے کے ساتوں دن کے بچت بازاروں کی خاک چھاننی پڑے گی۔

سستی سینڈلز' ہلکے نقلی زیورات' ریجیکٹڈ کاسمیٹکس آئٹمز۔۔۔

اف۔۔۔ ایک ایک چیز باقی ہے ابھی۔۔۔

ہائے۔۔۔ میں تو اپنی تیاری بھول گئی تھی۔۔۔ اب

الگ سے بڑی مارکیٹ کا چکر بھی لگے گا۔ اب خود تو الغتم پشتم ایک ہی جگہ سے سب لے لوں گی۔ مگر بہو کو تو چھان پھٹک کے چیزیں دوں گی نا۔۔۔ چھ سات بازار گھوم کر۔۔۔ اتنا تردد تو اپنی عزیز از جان بہو کے لیے کروں گی نا!

بہت شوق بہت ارمان جو ہے مجھے۔۔۔

ایک اکلوتا بیٹا ہے میرا۔۔۔ اسی کی شادی میں ارمان پورے نہ کروں تو پیچھے اور کون ہے بھلا؟

اب تک تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کیا کرنے والی ہوں۔ اتنے تو باشعور ہیں آپ؟



سامنے اسٹیج پر بیٹھی دلہن نے چیختے آتشی گلابی رنگ کا چمکیلا بنارسی غرارہ پہن رکھا ہے۔ عجیب سی بوسیدگی اس غرارے سے جھلک رہی ہے۔ کلائیوں میں آتشی گلابی رنگ کی سادہ چوڑیوں کے درمیان موٹے موٹے گولڈن افشاں جھڑتے کڑے بہت بدنما دکھائی دے رہے تھے۔ بھری ہوئی چوڑیوں والی کلائی کے عین بیچ میں چار چوڑیوں کو جوڑ کر ایک موٹا سا کڑا بنایا گیا تھا' جس میں آتشی گلابی بڑے بڑے نگوں سے ڈیزائننگ کی گئی تھی۔

دلہن کے مہندی لگے ہاتھوں کی انگلیوں میں عجیب عجیب سی آرٹیفشل انگوٹھیاں تھیں۔۔۔ جس نے دلہن کے ہاتھوں کو اچھا خاصا بدہیت بنا دیا تھا۔

اس کے گلے میں غرارہ کا ہم رنگ نقلی سیٹ الگ گنوارپن کا تاثر پیش کر رہا تھا۔ بھدا' بدرنگ' سستا زیور۔۔۔ سینڈل۔۔۔ سینڈل نہیں' پمپی کہیے۔۔۔

چمکیلے چکنے چمڑے سے بنی جوتی جس کی ہیل ذرا اونچی تھی۔ اس پمپی کے سامنے کے رخ پر لگا بڑا سا گولڈن نگ اس پمپی کی واحد سجاوٹ تھی۔

بنارسی کپڑے کے موٹے کھیس جیسے دوپٹے سے دلہن کے چہرے کا زیریں حصہ چھب دکھلا رہا تھا۔ سوجا' متورم اور بے رونق چہرہ۔۔۔ گو کہ اس نے ہار سنگھار مکمل کر رکھا تھا مگر دلہنوں والا مخصوص روپ مفقود تھا۔

میں نے دل میں اٹھتی درد کی ٹیسیں دبا کر گہری سانس بھری۔ نظریں موڑ کر پنڈال کا جائزہ لیا۔۔۔ ہر شخص دلہن پر ہی تبصرہ کرتا نظر آیا۔

نجانے کیوں میری آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔ میں جذباتی ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بعض رشتے جذباتیت کی آغوش میں ہی نمو پاتے ہیں۔ جیسے پھوپھی اور بھتیجی کا رشتہ۔۔۔ جی ہاں!۔۔۔ یہ جو سامنے دلہن بیٹھی ہے نا۔۔۔ بظاہر سجی بنی مگر اندر ہی اندر بری طرح زخم خوردہ۔۔۔ یہ میری بہو خدیجہ نہیں ہے۔۔۔ یہ تو میری بھتیجی اسما ہے۔۔۔ میری پیاری بھتیجی۔۔۔ فرماں بردار' تابعدار اور بے حد سمجھ دار۔۔۔

اس کی سمجھ داری کا انکشاف بھی مجھ پر دو روز قبل ہی ہوا' جب اس کی بری لے کر اس کے سسرال والے آئے تھے۔ تب سے اب تک وہ نجانے کتنے لوگوں کی تنقید برداشت کر چکی تھی۔ جو کوئی بری دیکھنے آتا۔۔۔

"ہائے اللہ! کیسے غریب غربا ہیں۔۔۔ اتنی پرانی اور سستی چیزیں لائے دلہن کے لیے۔۔۔"

یہ بے لاگ تبصرہ ان عورتوں کا تھا' جو گلی محلوں سے شریک محفل تھیں۔

"اللہ توبہ۔۔۔! اللہ معاف رکھے ایسے لوگوں سے۔۔۔ اتنے چھوٹے دل کے ہیں۔۔۔ تمہارے ساتھ تو بہت برا ہوا اسما۔۔۔ تمہاری سسرال تو بڑی کنجوس ہے۔" یہ رشتہ دار خواتین کا ہمدردی بھرا مگر استہزائیہ تبصرہ تھا۔

"تم پہنو گی کیسے یہ سب؟۔۔۔ میں ہوتی تو منہ پر مار دیتی ان کم ظرف لوگوں کے۔۔۔ اتنی گھٹیا چیزیں تو انہوں نے کبھی خود بھی نہ پہنی ہوں گی۔۔۔" یہ اسما کی ایک کزن تھی' جو ایسی بری دیکھ کر شدید اشتعال انگیز کیفیت سے دوچار تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے ضرور آرڈر پر تیار کروائی ہوں گی یہ سب چیزیں۔ ورنہ اب تو ایسی چیزیں مارکیٹ میں دستیاب بھی نہیں۔۔۔" یہ دوسری تھی۔

"جتنی کم ظرفی وہ لوگ بھرے مجمع میں ظاہر کر چکے ہیں نا تو کوئی بعید نہیں کہ یہ ساری اشیا پرانی اور استعمال شدہ ہوں۔۔۔"

"نجانے نئی نویلی دلہن سے کسی کو کیا پرخاش۔۔۔ ضرور یہ سب ساس نندوں کی ملی بھگت ہوگی۔۔۔ تمہیں نیچا دکھانے کی۔"

یہ تیسری' چوتھی۔۔۔ غرض سب کی اپنی اپنی بولی اپنی اپنی منطق۔۔۔

اور ان ساری باتوں کے دوران میری پیاری بھتیجی کس کیفیت سے گزری' یہ مجھے اس کے چہرے پہ بار بار لہراتا' رنگ بدلتا سایہ بتلا رہا تھا۔

"چلو! اب تم لوگ ذرا باہر جاؤ۔ آرام کرنے دو اسما کو۔" میری بھاوج نے لڑکیوں کو کمرے سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سب کو باہر نکال کر اور دروازے کی چٹخنی چڑھا کر واپس آئی تو اسما زرد کپڑوں میں ملبوس خود بھی زرد زرد سی ہو رہی تھی۔

مایوں بیٹھی اس دلہن کا چہرہ یکایک بے رونق سا ہو گیا تھا۔ حالانکہ ابھی کچھ دیر قبل اس کے سسرال والوں کی آمد سے پہلے کیسی کھنکتی' جھینپتی' شرمیلی سی ہنسی بات بے بات اس کے لبوں پہ کھل رہی تھی۔

"اسما! تم پریشان مت ہو بیٹا! ہم بات کرتے ہیں ان لوگوں سے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں۔۔۔ ایسی بھی کیا کم ظرفی۔۔۔ اب کون اس طرح کے ملبوسات استعمال کرتا ہے۔" میری بھاوج اسے تسلی دے رہی تھیں۔۔۔ جب اس نے پہلے سر اٹھایا' پھر ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنی ماں کو دیکھا۔

اس کے سامنے بیٹھی اس کی ماں بہت مجبور و بے بس لگی مجھے۔۔۔ میری چونکہ کوئی بیٹی نہیں تھی۔۔۔ اس لیے مجھے ادراک نہ ہوا کبھی کہ بیٹیوں کی مائیں اپنی بیٹیوں کی تقدیر کے معاملے میں ازل سے مجبور و بے بس ہی ہوتی ہیں۔

"امی!۔۔۔ کیا آپ کے بات کرنے سے یہ سب تبدیل ہو جائے گا؟" اس نے بہت مشکل سے آنسو ضبط کیے۔

میری بھاوج چند لمحے بے چارگی سے اسے دیکھتی رہی پھر چہرہ گھما کر مجھے مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

"بات تو کر کے دیکھیں۔۔۔ ہو سکتا ہے کوئی صورت نکل آئے۔۔۔ کوئی گنجائش تو ہو گی۔" میں نے اپنی بھاوج کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر اسما کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

"رہنے دیں پھپھو۔۔۔ جو میری قسمت میں لکھا تھا' ہو گیا۔ اب آپ کے یا کسی کے بات کرنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ جیسے نیم کا عرق گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔

"اگر ان لوگوں نے سامان تبدیل نہ کیا تو ہم تمہیں جہیز کا کوئی بھاری کامدار جوڑا پہنا دیں گے۔۔۔ ایسے کوئی گرے پڑے تو نہیں ہیں ہم لوگ کہ وہ جو بھی الٹا سیدھا پہناوا بھیجیں' ہم اسی میں اپنی بچی کو لپیٹ دیں۔" میری بھاوج نے بیٹی کا مایوسی بھرا انداز بھانپتے ہوئے ایک نئی تجویز رکھی۔۔۔ میں نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ مگر اسما ہم دونوں کے برعکس نفی میں سر ہلانے لگی۔

"ایک بات اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں امی! میرا یہ عمل سسرال میں میرا کیا امیج بنائے گا ضدی' مغرور' اکھڑ' سرکش نا؟۔۔۔ آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی بیٹی اپنی ازدواجی زندگی کے پہلے ہی قدم پہ لڑکھڑا جائے؟"

اسما کی بات نے جیسے میری بھاوج سمیت مجھے بھی لاجواب کر دیا۔

"اسما میری بچی!" میری بھاوج نے اسے سینے سے لگا لیا۔ میں نے انگلی آنکھوں کے کناروں پر پھیر کر ہلکی ہلکی نمی خشک کی۔ میری بھاوج رو رہی تھی اور اسما اس کی پشت سہلاتی کچھ کہتی جا رہی تھی۔۔۔ میں نے اس کی سرگوشیاں سننے کی کوشش کی۔

"آپ نے مجھے سمجھایا تھا نا امی! کہ سسرال میں بسنے کے لیے دل مارنا پڑتا ہے۔۔۔ میں نے وہ بات گرہ

میں باندھ رکھی ہے۔"

"کیا ہوا جو اس کام کی ابتدا پہلے ہی قدم سے ہو جائے۔۔۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ گرہستی کی بنیاد میں جب تک عورت کے دل کا لہو نہ ملے۔۔۔ گھر کی بنیاد مضبوط نہیں پڑتی۔۔۔ مجھے اپنے گھر کی بنیاد مضبوط چاہیے امی۔۔۔ چاہے میرا دل لہولہان ہو جائے۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتی جو میرے پہنچنے سے پہلے ہی میرے سسرال میں میرے ناز یبا رویے کی خبر پہنچا دے۔"

اس کی آواز بھیگنے لگی مگر وہ بولے چلی جا رہی تھی۔۔۔ جیسے اپنے اندر کی بھڑاس نکال رہی ہو۔ ضبط کے پیمانے اب بس چھلکنے کو تھے۔

"بہو بری کا جوڑا نہیں پہنے گی تو آپ اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں کہ لوگ کیا کیا نہ باتیں بنائیں گے۔۔۔ اور ان باتوں کے خنجر بھی صرف آپ کا ہی سینہ چھلنی کریں گے۔۔۔ کیونکہ آپ اس کم نصیب دلہن کی ماں ہیں۔۔۔ میری ماں ہیں۔۔۔ آپ واقعی میری پیاری ماں ہیں امی جان! اس لیے میں اپنی ذات سے آپ کو مزید کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی۔"

اسما کی باتیں مجھے رلائے دے رہی تھیں۔۔۔ بڑے حوصلے اور ضبط والی بچی تھی وہ۔ میری بھاوج نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی اور نم آنکھوں سے مسکرا کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں تفاخر تھا اور میری نظریں اسما کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ پتا نہیں کیوں، مگر اس کی اتری صورت میں مجھے رہ رہ کر خدیجہ کا گمان ہو رہا تھا۔

اس کے بین ڈالتے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی اس کی رندھی ہوئی آواز مجھے کسی اور کی سسکیاں بھی سنوا رہی تھی۔

کیا عنقریب میں بھی کسی کو اس اذیت سے دوچار کرنے کا باعث بنوں گی؟

اس سوال کا جواب میں چاہ کر بھی نہ دے پائی خود کو۔

پھر اسما ہر ایک کے منہ سے وہ ساری باتیں برداشت کرتی رہی، جس میں اس کا سرے سے کوئی دوش نہ تھا۔۔۔ اپنے سسرال والے جتنے بھی برے کیوں نہ ہوں، دوسروں کے منہ سے ان کی برائی سننا اور خود سے ہمدردی جتایا جانا یقیناً "ضبط کا امتحان" ہی ہے۔۔۔ وہ چپ تھی۔۔۔ ہر بات کے جواب میں چپ۔۔۔ نہ "ہاں" میں جواب دیتی نہ "ناں" میں۔۔۔ اس نے جیسے ایک لاتعلق سے حصار میں خود کو قید کر لیا تھا۔

اور یہ لاتعلقی اور سرد مہری کا خول اس کی شادی کے روز بھی نہ چٹخا وہ ان سارے اجڈ گنوار پن چھلکاتے لوازمات سے دلہن کا روپ دھارے میرے سامنے بیٹھی تھی آج اس کی ڈولی اٹھنے والی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کیسے، مگر میری آنکھیں اس کی ڈولی سے پہلے اس کے نوخیز کنوارے ارمانوں کی میت اٹھتا دیکھ رہی تھیں میں نے تیزی سے نظریں یہاں وہاں گھما کر آنکھوں میں امڈتی نمی واپس اندر دھکیلی۔

ایک ملال و بے کیفی سی دل کی دہلیز پہ سر پٹخنے لگی تھی۔

اور پھر اسما کی بارات سے واپس آتے آتے میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔۔۔ بلکہ نہیں۔۔۔ میں اپنے فیصلے میں ترمیم کر چکی تھی۔

"نصر! مجھے کل بڑی مارکیٹ لے چلنا۔۔۔ خدیجہ کی بری کے جوڑے اور ولیمہ، بارات کا شرارہ خریدنا ہے۔ وقت کم رہ گیا ہے۔" میں نے اپنے بیٹے کو حکم دے کر اپنے کمرے کی راہ لی۔۔۔

میں نے آپ سے غلط نہیں کہا تھا۔ میں کوئی ظالم، جابر، خرانٹ اور کٹھور دل عورت نہیں ہوں کہ اب بھی دل نرم نہ ہوتا۔

مجھے اپنی بہو بیاہ کر لانی تھی۔۔۔ میرے بیٹے کی سچی خوشی کے لیے۔۔۔ اس لیے کہ میرا گھر مسرتوں کا گلشن بنے۔

نہ کہ۔۔۔ میری معصوم، بے ضرر بہو کے ارمانوں کا قبرستان۔

✡

سلویٰ علی بٹ

کچھ پھول کچھ چراغ

وہ بہت تیزی سے پیڑا بناتی اور اسے بیل کے توے پہ ڈالتی جارہی تھی۔ دوسرے چولہے پہ سالن بھون کر آنچ دھیمی کردی گئی تھی۔ سلاد اور چٹنی وہ پہلے ہی بنا کر فریج میں رکھ چکی تھی۔ حالانکہ ابھی صرف سوا بارہ بجے تھے۔ اس کی اتنی جلدی کی وجہ ابا جی تھے۔ جنہیں شوگر کا مرض ہونے کی وجہ سے بھوک بہت جلدی لگ جاتی تھی۔ اتوار کے دن اور مہینے میں شاذو نادر ہی آفس سے چھٹی کے روز وہ کھانا بنانے کی ذمہ داری خود ہی نبھاتی تھی۔ دو روٹیاں چنگیر میں ابا جی کے لیے نکال کر باقی کو لپیٹ کر ہاٹ پاٹ میں ڈھانپ دیا۔ کٹوری آدھی سالن سے بھر کے، جگ سے گلاس میں پانی لیے اکرم دین کے کمرے میں چلی آئی۔

اکرم دین اپنی چارپائی کی ادوائن کستے ہانپ رہے تھے۔

"ابا جی! آپ کیوں اتنا زور لگا رہے ہیں۔" باپ کی کمزور صحت اس کے لیے فکرمندی کا باعث بنتی تھی۔ چنگیر دوسری چارپائی پہ رکھ کر اس نے ابا جی کا بازو تھام لیا۔

"بس دھی! چارپائی کافی ڈھیلی ہوگئی تھی۔ ڈھیلی چارپائی پہ روٹی کھا کے لیٹ جاؤ تو ہیضہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔"

انہوں نے مسکرا کر نرمی سے بازو چھڑایا اور موٹی ادوائن کے آخری سرے پہ گرہ لگا کے کام مکمل کرلیا۔

"آپ مجھے یا رابعہ کو کہہ دیتے۔"

مکمل ناول



WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے کونے میں پڑی میز چارپائی کے سامنے رکھ کر روٹی کی چنگیر اس پہ سجائی اور اکرم دین کے برابر آ بیٹھی، جواب گلاس کے پانی سے ہاتھ دھو رہے تھے۔

"پھر میں سارا دن کیا کروں؟ ابھی اتنا بیمار ہوں نہیں، جتنا تم لوگوں نے مجھے سمجھ لیا ہے۔ یہی چھوٹے موٹے کام دن کاٹنے کا آسرا ہیں۔"

انہوں نے مصنوعی خفگی خود پہ طاری کرلی تھی۔ اپنی بڑی بیٹی کو اپنے لیے اتنا سا بھی پریشان دیکھنا انہیں اپنی خوش بختی کا یقین دلاتا تھا۔ جب سے معاشی زندگی کا کاروبار سنبھالا تھا، وہ اسی طرح سب کا خیال رکھنے لگی تھی۔

"ساری عمر کام ہی کیا ہے ابا جی! اب اس عمر میں اولاد آرام کا کہے تو خوش نصیبی ہے آپ کی۔"

"سعدیہ دھی! میرے پتر اتنے چنگے نہیں ہیں کہ مجھ بڈھے کے آرام کا خیال کریں۔ تو پرایا دھن میری عادتیں نہ بگاڑ۔ تجھے ایک دن میرا ویڑہ چھوڑنا ہے۔" اکرم دین کے لہجے میں ہلکی سی نمی گھل گئی۔

وہ جو باپ کے کھانا ختم کرنے تک ان سے باتیں کرنا چاہتی تھی، جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب بھی بھلا... یہ ماں، باپ بھی نا۔" اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔

خدا پہ یقین ہونے کی بنا پر وہ خود کو کوئی بد نصیب نہیں گردانتی تھی مگر تینتیس کے سن میں اسے ایسی کوئی خوش فہمی بھی لاحق نہیں تھی۔ وہ برآمدے کے ستون کے ساتھ آ ٹھہری، تب ہی رابعہ ہاتھ میں شاپر لیے اندر داخل ہوئی۔

"السلام علیکم آپی!" اس نے آتے ہی ہانک لگائی۔

"وعلیکم السلام! تم جلدی آ گئیں۔" رابعہ قریب ہی سلائی سیکھنے جاتی تھی۔ وہ اپنی بھٹکی سوچوں کو زبردستی رابعہ کی جانب مرکوز کرنے لگی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اسی لیے جلدی اٹھ آئی۔" رابعہ نے وجہ بتائی۔

"یہ سر کا درد اب معمول بنتا جا رہا ہے۔ کبھی جلد آرام آجاتا ہے کبھی بدیر۔" وہ دونوں باتیں کرتی اندر کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

رابعہ نے بیڈ پر بیٹھتے ہی شاپر کی گرہ کھول کر اسے الٹ دیا۔ کاپر اور براؤن کلر کا نفیس سی کڑھائی والا سوٹ ادھ سلا تھا۔ سعدیہ نے بے اختیار قمیص کا کپڑا ہاتھ میں لے کر کڑھائی کو دیکھا۔ سوٹ آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔

"سلائی کرنے لگی ہو۔" انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے کپڑے کی کوالٹی کا اندازہ لگاتے اس نے پوچھا۔

"جی! نازیہ بھابھی کہہ رہی تھیں، انہیں کل صبح تک چاہیے۔ انہیں اپنی کزن کی منگنی میں پہننا ہے۔" رابعہ نے ہم رنگ لیس کو ناپتے جواب دیا۔

قمیص سعدیہ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ نازیہ کے شوہر کی کمائی ڈالروں میں تھی۔

صبح سے یہ دوسری سوئی تھی جو اسے چبھی تھی۔

رابعہ نے بازو کی کٹائی کرتے بہن کی یک دم خاموشی محسوس کی تھی۔

☼ ☼ ☼

اماں دو گھنٹے قبل وجولن کے گھر گئی تھیں۔ اب واپس لوٹیں تو بالکل خاموش تھیں۔ برآمدے میں چارپائی پہ پڑی سعدیہ کو لیٹے دیکھنے کے باوجود بھی اس کی طبیعت نہ پوچھی۔ اماں کے گھر سے جانے تک اس کے سر میں شدید درد تھا۔ اماں کو مروتاً ہی سہی حال احوال تو دریافت کرنا چاہیے تھا مگر وہ تو کن انکھیوں سے دیکھتی گزر گئی تھیں۔

رابعہ کو اماں کی واپسی کی خبر ہوئی تو اس نے دستر خوان لگا دیا۔ سعدیہ انہیں بلانے گئی تو انہوں نے سہولت سے ٹال کر اپنا کھانا کمرے میں ہی منگوالیا۔ کھانے کے بعد رابعہ کے ہاتھ کی چائے پی کر سعدیہ کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ شام میں سو کر اٹھی تو اماں تخت پہ براجمان لہسن، ادرک اور پیاز چھیل رہی تھیں۔ پاس ہی باسط آیا بیٹھا تھا۔

"السلام علیکم!" بغیر نام لیے باسط کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" سپاٹ سا جواب آیا۔

اس نے ذرا کی ذرا اسے دیکھا اور پھر سے اماں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"اماں! آخر کب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اتنے سالوں سے تو نتیجہ نکل نہیں رہا۔" اس کے لہجے میں حد سے زیادہ بےزاری تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھونے لگی تھی مگر باسط کے الفاظ نے اس کا ارادہ ملتوی کردیا۔

"سلسلہ" کے لفظ پہ سعدیہ کے حواس چوکنا ہوگئے۔ سالوں کا حساب صرف اسی کے لیے لگایا جاتا تھا۔

"چاہے مزید جتنے سال لگیں، تجھے اس سے کیا؟" حمیداں نے بری طرح بیٹے کو گھورا۔ اس بات پہ وہ بیٹے کے حواس ٹھکانے لگا دیتیں، مگر سعدیہ کی موجودگی آڑے آگئی۔ باسط کی زبان درازی سے حمیداں خوب واقف تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کسی قسم کی بکواس بیٹی کے لیے تکلیف کا باعث بنے۔

"اماں! تم تو ایسے ہی خوامخواہ میں..." باسط کی بےزاری بلاوجہ کے غصے میں بدلنے لگی۔ اسے قریب کھڑی بہن کا بھی لحاظ نہیں تھا حالانکہ ایک عرصے سے اس کا اس گھر اور اس کے مکینوں سے لین دین کا واسطہ ختم ہوچکا تھا۔ پھر بھی وہ ان کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا، اماں چاہے اس کی باتوں کو قابل غور نہ جانیں، وہ اپنی رائے اور مشوروں سے بہن، بھائیوں کا کلیجہ ضرور جلاتا تھا۔ وہ غصے کا تیز تھا۔ اس کی فطرت میں احساس اور مروت کا پیدائشی فقدان بھی تھا۔

اتنی سی دیر میں اس نے دوسری بےزاری نظریں ہی بلاوجہ ہلو کے پاس کھڑی سعدیہ پہ ڈالی۔ وہ بھائی کی چیرتی نظروں سے گھبرا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

کچن میں رابعہ بری طرح مصروف تھی۔ سموسوں کے لیے میدہ گوندھ لیا تھا۔ اب مسالا بنا رہی تھی۔ ساتھ ہی دوسرے چولہے پہ بیسن کا حلوہ چڑھا رکھا تھا۔

"کوئی آرہا ہے کیا؟" انجان بن کر استفسار کیا۔ باہر ہونے والی گفت و شنید سے شک سا پڑ چکا تھا۔ پھر بھی تصدیق ضروری سمجھی۔

"جی! کچھ مہمان آرہے ہیں، اللہ کرے آپ انہیں پسند آجائیں۔" رابعہ نے حلوے میں چمچہ چلاتے صدق دل سے دعا کی تھی۔

اس کی نظریں بہن کی پشت پہ ٹک گئیں۔ بہت کم عمری میں اس نے گھرداری سنبھال لی تھی۔ وہ خود آفس سے تھکی ہاری لوٹ کر کچن کے باقی ماندہ کاموں میں ہاتھ بٹانے کی اپنی سی کوشش کرتی تھی۔ کتنے ہی سالوں سے رابعہ بہن کے لیے آنے والوں "خاص

مہمانوں" کے لیے ڈھیروں لوازمات تیار کرنے کی ذمہ داری نبھاتی آرہی تھی۔ سعدیہ نے محسوس کیا تھا اس کے انداز میں باسط جیسی بیگانی و بے زاری مفقود تھی۔ ہلکا سا بھی طنز کا شائبہ نہ تھا کیونکہ وہ احسان فراموش نہیں تھی۔ بڑی بہن کی محنت اور قربانیوں کی بخوبی معترف تھی۔ اس کے دل میں سعدیہ کے لیے ذرا بھی گرد نہیں تھی، بلکہ وہ ہر دفعہ بڑی دلجمعی سے ہر ڈش تیار کرتی اور گھر کا کونا کونا رگڑ کر چمکاتی تھی۔

"آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔ جائیے شاور لے کر لباس بدل لیں۔" رابعہ فریج میں سے چکن نکالنے کے لیے مڑی تو اسے یوں ہی کھڑے دیکھ کر کہا۔

"وہ لوگ کھانے تک رکیں گے؟" چکن کے پیکٹ سے اس نے اندازہ لگایا۔

"اماں کہہ رہی تھیں شاید۔" اس کو صرف پکانے سے غرض تھی۔

وہ چپکے سے باہر نکل آئی۔ باسط جاچکا تھا۔ اماں اب پرات میں بھرے چاول صاف کررہی تھیں۔ وہ چپ چاپ اپنے اور رابعہ کے مشترکہ کمرے میں آگئی۔ اسے اب دوپہر سے اماں کی خاموشی کی وجہ سمجھ میں آئی تھی۔

سعدیہ کے سختی سے منع کرنے پر پچھلے چند مہینوں سے مہمانوں کی آمد رکی ہوئی تھی۔ مسلسل بلاجواز انکار اور ٹھکرائے جانا زندگی کے خاموش سمندر میں، ایک تلاطم موجزن کردیتا تھا۔ وہ سلیقہ مند تھی۔ شائستہ انداز و اطوار، تعلیم یافتہ اور قبول صورت تھی۔ ان تمام جملہ خوبیوں کے باوجود وہ اٹھارہ سے تینتیس کے سن میں داخل ہوگئی تھی۔ اتنے سالوں میں ہر آنے والا کسی نہ کسی کمی و بیشی کو پکڑ کر انکار کہلوانے میں حق بجانب ٹھہرتا۔

بوڑھا معذور باپ، دو چھوٹے بہن، بھائی، ایک جوان بے روزگار بھائی، خستہ حال گھر۔ زندگی کے ان تمام جھمیلوں کو سلجھاتے، دن سالوں میں بدلتے چلے گئے۔ وہ مایوس ابھی بھی نہیں تھی۔ اسے کامل یقین تھا کہ مایوسی گناہ ہے مگر وہ خود کو اب وقت کے دھارے پہ چھوڑ چکی تھی۔ اس نے سوچنا اور الجھنا چھوڑ دیا تھا مگر اماں... انہوں نے پھر سے تانے بانے بننا شروع کردیے تھے اور وہ ممتا کے ساتھ بحث گناہ کبیرہ میں گردانتی تھی۔

اور اماں کی اس "شاید" نے آج کی شام دو ڈھائی ہزار کا کباڑہ کرہی دینا تھا۔ حاصل حصول کچھ بھی نہیں۔

چند سال قبل حمیداں مہمانوں کو صرف چائے کے ساتھ چند ایک لوازمات کھلانے پہ اکتفا کرتی تھیں مگر یہ چند سال قبل کی بات تھی۔ اب جبکہ اس نے تیس کا ہندسہ عبور کرلیا تھا تو لوگوں کی کھانے تک کی خوشامدیں "خوامخواہ" ہی نہیں تھیں۔

☼ ☼ ☼

ٹرے اٹھاتے اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اب ہمیشہ ہی اس پہ ایسی متضاد کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ اماں کو لاکھ بار منع کرنے اور احتجاج کے باوجود رات کے کسی خاموش تنہا پہر یا روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کو نپٹاتے لمحہ بھر کو یہ خیال ضرور اٹکتا تھا۔

"کاش! میں بھی گرہستی کے اسرار و رموز میں ڈھلی ایک مکمل عورت ہوتی۔"

اس کی ہم عمر اور کئی کم عمر لڑکیاں بھی گھربار کی ہوئیں۔ کبھی کبھار آفس جاتے یا واپسی پہ کوئی گود میں بچہ لیے حال احوال کے لیے روک لیتی تو دن بھر اس پہ پژمردگی طاری رہتی۔

ڈرائنگ روم میں تین عورتیں تھیں۔ ایک کی عمر پچاس کے لگ بھگ، دوسری تیس کے قریب اور تیسری چوبیس سال کی لگ رہی تھی۔ اس نے بہت سلیقے سے سلام کرکے ٹرے درمیانی میز پہ رکھی اور چائے کی پیالیاں انہیں تھمادیں۔ بڑی عمر کی عورت نے صوفے پہ تھوڑا بائیں جانب کھسکتے ہوئے اس کے لیے اپنے برابر جگہ بنائی۔

"بھلا کیا عمر ہوگی اس کی؟" بڑی عورت نے تفتیش کا آغاز کیا۔ باریک سی سوئی بڑے زور سے چبھی تھی۔

اس سوال کے صحیح جواب کے بعد راہ و رسم کی کہاں گنجائش نکلنی تھی۔

"وہ... بس... یہی کوئی! انتیس، تیس سال..."

حمیداں کی آواز میں لرزش تھی۔ ماں کی اس مبالغہ آرائی کو وہ جھوٹ کے بجائے مصلحت آمیزی میں شمار کرتی تھی۔

"یہ میری بڑی الفت ہے۔ اس کی عمر اٹھائیس سال ہے اور اس کی نو سال کی بیٹی ہے۔ یہ میری دوسری بیٹی رفعت، تیئس سال کی ہے اور اس کا ڈیڑھ سال کا بیٹا ہم گھر چھوڑ کے آئے ہیں۔" وہ بڑی عمر کی نفیس سی خاتون جانے تعارف کروانے لگی تھیں یا طنز۔

"ایں..." اماں کے منہ پہ مایوسی صاف نظر آنے لگی۔

"برا مت مانیے گا بہن جی! میں بھی بیٹیوں والی ہوں۔ ہوسکتا ہے بیٹی کی شادی میں تاخیر کی وجہ آپ کی کوئی مجبوری رہی ہوگی۔ یوں تو میرے بیٹے کی عمر بھی اڑتیس سال ہے۔ میری مجبوری، میری بیوگی تھی۔ میرا بیٹا خود بھی بہت فرض شناس ہے۔ اپنی بہنوں کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوکر اس نے اپنا گھر بسانے کا فیصلہ کیا ہے گو کہ میں اس فیصلے کی شروع دن سے مخالف رہی ہوں مگر آپ جانتی ہوں گی، بیٹے جوان ہوجائیں تو والدین کو اکثر معاملات میں ان کے سامنے جھکنا پڑتا ہے اور بیٹیاں... یہ تو ہوتی ہی فرماں بردار ہیں انہیں کم عمری میں ہی گھربار کا کردینا چاہیے۔ آج کل تو کم عمر لڑکیوں کے مناسب رشتے دستیاب نہیں اور آپ کی بیٹی... خیر..." وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کو رکی تھیں۔

ان تینوں ماں، بیٹی کی بھی سانس رک گئی تھی۔ ابا مسجد میں نماز پڑھنے گئے تھے، ورنہ اب تک سینہ مسلتے کھانس رہے ہوتے۔

"ہر انسان کی اپنی ایک سوچ اور رائے ہوتی ہے۔ چاہے وہ دوسروں کے نزدیک منفی ہی کیوں نہ ہو مگر اس کے حامل انسان کو بہت عزیز ہوتی ہے۔ اسی طرح میری بھی یہ سوچ ہے کہ کم از کم پچیس سال کی لڑکی سے اپنے بیٹے کو بیاہوں گی اور معذرت کے ساتھ لڑکی نوکری ہرگز نہ کرتی ہو کیونکہ جب لڑکی اتنی ایج کی ہو اور خود مختار بھی ہو، وہ ڈیپینڈڈ لائف میں بہت مشکل سے گزارہ کرتی ہے۔ چاہے آپ مجھے جاہل عورت کا لقب دے دیں مگر میں اپنے موقف پہ ڈٹی رہوں گی۔"

بغیر کسی زیر، زبر پیش کے اٹل اور صاف انکار۔

سعدیہ کو واقعی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ انہیں جاہل کہے یا بہادر۔

سعدیہ نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں کو دوپٹے کے نیچے چھپالیا۔ ایسا تو ہر بار ہی ہوتا تھا۔ لوگ آتے اور کھاپی کے چلے جاتے۔ کسی کو اس کی بڑھتی عمر پہ اعتراض کسی کو نوکری پہ اور کئی شادی کے بعد بھی نوکری جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کرتے مگر یہ سارے اعتراضات وچولن کے ذریعے ان تک پہنچائے جاتے، یوں کبھی کسی نے منہ پہ صاف وضاحت کے ساتھ انکار نہیں کیا تھا۔

تعلیم سے نابلد اماں ان نفیس خاتون کے تقریری انداز سے متاثر تھیں یا ان کی کم فہمی تھی کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر میں بات کی تہ تک نہیں پہنچ پائی تھیں۔

"آنٹی! آپی شادی کے بعد جاب چھوڑ دیں گی۔ ابھی تو یہ مجبوراً کررہی ہیں۔" بائیس سالہ رابعہ نے آگے بڑھ کر رشتے کو سنبھالنا چاہا۔

سعدیہ نے ذرا سی گردن اٹھا کے، دھندلی نظر سے اپنی معاملہ فہم بہن کو دیکھا۔ مگر ان خواتین کو جانے کی زیادہ ہی جلدی تھی۔

"بہن! آپ کھانا کھا کے جائیں، سب تیار ہے۔" اماں ان کے برابر آکھڑی ہوئیں۔

اس خاتون کے شائستہ لب و لہجے نے اماں کی آس نہیں توڑی تھی۔ وہ کھانے کے دوران ایک کوشش اور کرنا چاہتی ہوں گی۔ انہیں نہ رکنا تھا، نہ ہی رکیں۔

انہوں نے اپنے بیٹے کی مجبوری گوش گزار کردی تھی، مگر اس نمکین سی لڑکی کی ذات سے وابستہ مجبوریوں سے انہیں ذرا بھی سروکار نہیں تھا۔

وہ ہاتھ گود میں دھرے یوں ہی بیٹھی رہ گئی۔ اماں نم آنکھیں اس سے چراتیں اپنے کمرے میں گوشہ نشین ہو گئیں۔ انہوں نے خالی چائے پی تھی۔ رابعہ کی شام سے کی جانے والی محنت کو چکھا تک نہیں تھا۔ نہ زیادہ بحث' نہ ہی بہلاوا۔

اس کے خالی ہوتے ذہن میں "ڈیپنیڈڈ لائف" کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"آپ نہیں جانتیں خاتون! میں تو کب سے منتظر ہوں' کوئی آئے اور مجھے اپنا اسیر کرلے' مجھے کسی پنجرے کا قیدی بنادے' مگر میرے بوڑھے ماں' باپ کی فکروں کو رہائی دے دے۔" وہ شدتوں سے رونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

آفس کا کام زیادہ تھا۔ وہ دو فائلیں گھر لے آئی۔ اسٹرونگ سا چائے کا کپ بنا کر نئے سرے سے چست ہونے کی کوشش کرتے ہوئے وہ سنگھار میز کا اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی۔

چائے کا چھوٹا سا گھونٹ لے کر اس نے کپ ایک طرف رکھ دیا اور بے خیالی میں آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ یوں ہی دیکھتے دیکھتے بے دھیانی میں لمبی چوٹی آگے ڈال کر اس کے بل کھولتی چلی گئی۔ عموماً" وہ صبح آفس جانے کے لیے بال بناتی تھی۔ ورنہ چھٹی کے روز بھی دو دن کی چوٹی بندھی رہتی۔ خود کو سجا سنوار کے آئینہ دیکھے عرصہ بیت گیا تھا۔ نرم جذبات بے قدری تلے روندے گئے۔ دل خود بخود ہر خوشی سے اچاٹ ہوتا چلا گیا۔

مدت ہوئی دور و نزدیک کے رشتے داروں سے میل ملاقات کیے ہوئے۔ وہ بھی اسے دیکھتے ہی کن سوئیاں لینے لگتے۔ فوراً" کھسر پھسر شروع ہو جاتی۔ اچھا بھلا خوشی کا گھر اسے سوگوار لگنے لگتا۔ اب وہ اماں کے بے حد اصرار پہ بھی کہیں آنے جانے کو راضی نہ ہوتی تھی۔

بیرونی کھلے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا کے نازیہ داخل ہوئی تھی۔ نازیہ اس کے تایا کی اکلوتی بہو تھی۔ ان کے گھروں کی صرف دیوار ہی ساجھی تھی' دل کبھی ساجھے نہیں رہے تھے۔ یہ سارے جھگڑے والدین تک کے تھے۔ اگلی پود میں کوئی عناد نہیں پایا جاتا تھا۔ بڑوں کی اس چپقلش نے سعدیہ کو تہی داماں کر دیا تھا۔

نازیہ ہر مہینے کے آخر میں ان کے گھر تین' چار چکر ضرور لگاتی تھی۔ اس کا شوہر محسن بیرون ملک مقیم تھا۔ دیور' جیٹھ کوئی تھا نہیں' سسر کا انتقال ہوئے برسوں بیت گئے۔ نندیں اپنے اپنے گھر کی ہو گئیں' ساس' وہ کام کی نہ کاج کی۔ یوں بھی بڑے کاروبار زندگی سے ریٹائر ہوئے تو لڑائی جھگڑے بھی ماضی کا قصہ پارینہ بن گئے۔ نازیہ کی واحد رونق اس کی آٹھ سالہ بیٹی سعدیہ تھی۔

نازیہ کو اکاؤنٹ سے پیسے نکلوانے ہوں' مہینے بھر کا راشن یا پھر بل وغیرہ جمع کروانے ہوتے' اس کے یہ سارے کام رابعہ سے بڑا بلال ہی کرتا تھا۔

سعدیہ کب سے کھوئی سی کیفیت میں لانبے بالوں میں مسلسل برش پھیرتی جا رہی تھی۔ دروازے میں لمحہ بھر سے آکے ٹھہری نازیہ نے گلہ کھنکار کے اس کی محویت توڑی تھی۔

"السلام علیکم!" سعدیہ نے اسے سامنے پاکر ہڑبڑا کر سلام جھاڑ دیا۔

"وعلیکم السلام!" اس کی خاموشی کو بغور نوٹ کرتے بڑی خوش دلی سے جواب دیا گیا تھا۔ ان کے بیچ خاموشی کا وقفہ در آیا تھا۔ اس خاموشی کو ہمیشہ نازیہ ہی توڑا کرتی تھی۔ سعدیہ زبان ہلانے کی زحمت بھی بمشکل کرپاتی تھی۔

"کیسی ہو؟" چند قدم آگے بڑھ کر وہ خود ہی بیڈ پہ بیٹھ گئی۔

سعدیہ ازراہ مروت بھی کسی قسم کی میزبانی نہیں نبھاتی تھی۔ اس کے ماضی کے اوراق پلٹنے والی نازیہ سے وہ یوں ہی بدکتی تھی۔ وہ حال میں زندہ اور مستقبل کی فکروں میں گھلی ہوئی تھی۔ ماضی کو وہ سر جھٹک کر

جھٹلا دیتی۔

"بس۔۔۔ ٹھیک۔" رسمی سی مسکراہٹ ہونٹ کے کونے پہ آٹھہری۔ وہ کھلے بالوں کا جوڑا کر کے کیچر میں جکڑنے لگی۔

"چاچی بتا رہی تھیں کچھ لوگ تمہیں دیکھنے آئے تھے۔" نازیہ نے لہجہ حتی الامکان سرسری رکھا۔

"جی۔۔۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔ "چائے پئیں گی؟" منظر سے ہٹنے کی ایک ذرا سی کوشش۔

"پھر بنی کوئی بات۔؟" وہ سر جھکائے بیڈ شیٹ کو گھور رہی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ موضوع اس لڑکی کے لیے تکلیف دہ ہے۔ اپنے تئیں وہ اسے اس تکلیف سے بچنے کا آسان حل بتایا کرتی تھی۔

"نہیں۔۔۔" ایک لفظ بڑی دقتوں سے حلق سے نکلا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم اور میں ایک ہی ڈگر پر زندگی گزار رہی ہیں' فرق صرف یہ ہے کہ تم غیر شادی شدہ اور میں شوہر اور بیٹی والی۔"

وہ سعدیہ اور خود کو ترازو کے ایک ہی پلڑے میں رکھ لیتی اور دوسرے پلڑے میں اپنے شوہر محسن کو۔ اب بھلا میزان برابر کیسے تولتا۔ سعدیہ کو کبھی محسن سے محبت تھی اور نازیہ کو آج بھی محسن سے محبت تھی اور محسن کے دل میں کیا تھا؟ یہ وہ خود جانتا تھا یا پھر نازیہ۔

"شاید۔۔۔" بے خیالی میں اسے سنتے ہوئے وہ بہت دور نکل گئی تھی۔

"شاید۔۔۔" نازیہ نے بیڈ شیٹ کے مشاہدے سے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

اسے سعدیہ سے خود سے اتنی جلدی متفق ہو جانے کی امید نہیں تھی۔

"یہ بھی مان لو ہم دونوں کا درد بھی ایک سا ہے۔" وہ بضد تھی۔

سعدیہ زمین پہ کسی غیر مرئی نقطے کو ڈھونڈتے اپنے اندر نمی سی محسوس کر رہی تھی۔ نازیہ کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایسی الجھی سلجھی گفتگو کرنے کا شوق تھا اور سعدیہ اتنی حقیقت پسند تھی کہ بلا چوں و چراں اسے سنتی جاتی بغیر تائید و تردید کے۔ بھلا جو شخص آپ کی دسترس میں ہی نہ ہو' اس کی یادوں' اس کی سوچوں اور تنہائیوں کا کیا سدباب کرتا؟

رشتے خوش فہمیاں پال کر نہیں جڑا کرتے۔

"یہ بھی تسلیم کرلو سعدیہ! کہ ہمارے دکھوں کا مداوا بھی ایک ہی شخص کر سکتا ہے۔"

اب کے اس کے لہجے میں غصے کی تپش تھی۔ وہ کہہ سکتی تھی کیونکہ "وہ ایک شخص" اس کا مجازی خدا تھا۔ وہ اس کی ذات پہ بہت سارے حق رکھتی تھی۔

سعدیہ کے لیے وہ نامحرم اور شجر ممنوعہ تھا۔ وہ کیونکر اس پہ حد اور فاصلے لگاتی۔

"ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے نازیہ۔"

"دلہن بننے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔" جملہ خاصا چبا کر ادا کیا گیا تھا۔

طنز تھا یا تازیانہ۔ وہ الفاظ' رشتے' محبتوں کو کبھی ترتیب اور سلیقے سے نہیں رکھ پائی تھی۔ وہ چلبلی سی' ہر حال میں مست' بے حد حساس اور تھوڑی ضدی عورت تھی۔

"آپ ہر۔۔۔"

"بھابھی! بلال بھائی آپ کا سامان لے کر آگئے ہیں۔"

رابعہ کی دخل اندازی سے سعدیہ خاموش رہ گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ نازیہ ہنکارا بھرتی کمرے سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

زبیدہ تائی اور حمیداں چچازاد بہنیں تھیں۔ ان کی ماؤں کی بھی بن نہ پاتی تھی۔ وہی دیورانی' جیٹھانی والی چپقلش' جو باآسانی آگے کی نسل میں بھی منتقل کر دی گئی۔ حمیداں اور زبیدہ دونوں اپنی پھوپھی کے گھر بیاہ کر آئی تھیں۔ ساتھ ہی ماؤں کی سکھائی پڑھائی پٹیاں بھی گرہ میں باندھ کے لے آئیں۔ پھوپھی نے لاکھ مصالحت کروانے کی کوشش کی' مگر اینٹ کا جواب

پھر۔

گھر کی فضا عجیب سی بے زاری کا شکار ہوگئی تھی۔ جنہیں پھوپھی اپنی عام زبان میں بھتیجیوں کی نحوست قرار دیتی تھیں۔ اس وقت کو کوستیں جب ان کے دل میں ان فسادی بھتیجیوں کو بہویں بنانے کا خیال سوجھا تھا۔ جنھوں نے ان کی خدمت کرنے اور گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بجائے سارا سکون ہی تلپٹ کردیا تھا۔ ان کے آپس کے جھگڑے تک بھی ٹھیک رہتا اگر ایک دن ان کے دونوں بیٹے آمنے سامنے نہ تن جاتے۔

اگلے دن پھوپھی نے دین محمد مستری کو بلوا کر دس مرلے کے گھر کے بیچ میں سے دیوار اٹھوادی۔ خود ان کا جدھر دل چاہتا وہیں بیٹھ کر کھالیتیں۔

برسوں بیت گئے اس دیوار کے پار دونوں گرہستن عورتوں نے اسے پاٹنے کی کوشش نہ کی۔ بچے بڑے ہوئے تو ان کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا شروع ہوگیا۔ پھر دونوں بھائیوں کا آپس میں پیار بھی بڑھ گیا۔ خوشی' غمی کے موقعوں پر حمیداں اور زبیدہ بھی ایک دوسرے کو برداشت کرلیتیں۔

تائی کی چار بیٹیاں اور ایک ہی بیٹا محسن تھا' جبکہ وہ چار بہن' بھائی تھے۔ سب سے بڑی سعدیہ' اس سے سال بھر چھوٹا باسط' پھر بلال اور آخر میں رابعہ تھی۔

اکرم دین کی کسی زمانے میں چلتی دکان ہوا کرتی تھی۔ پھر شوگر کا مرض انہیں جونک کی طرح چمٹ گیا۔ علاج کے ساتھ ساتھ لاکھ احتیاط کی' مگر دائیں پیر کی انگلیاں کٹ گئیں۔ ابا نے بیماری کا روگ جان کو لگالیا اور چارپائی کے ہو کر رہ گئے۔

حمیداں نے دکان کی چابی باسط کو تھمادی۔ باسط ان دنوں پڑھائی سے بھاگا ہوا تھا۔ اسے گھر کی پریشانیوں سے زیادہ آوارہ گردیوں سے غرض تھی۔ اماں نے پیار سے سمجھایا' ڈانٹا' مارا' ہر حربہ آزمالیا' باسط کو نہ ماننا تھا' نہ ہی مانا۔ ضرورتوں کا عفریت منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ باسط کی طرف سے مایوس ہوکر اماں نے گھر پہ ہی محنت شروع کردی۔

دکان کا بچا کھچا سودا بیچ کر ابا کا دوا دارو کرلیا گیا۔ سعدیہ کا ان دنوں میٹرک کا رزلٹ آیا تھا۔ آگے پڑھنے کی خواہش کو دل میں دبائے وہ چپ چاپ گھر کے کاموں میں جتی رہتی یا پھر باپ کی خدمت کرکے دعائیں سمیٹتی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا' اس روز اماں ملکوں کی چارپائی بُن رہی تھیں۔ رابعہ دوسرے سرے پہ بیٹھی بان کی رسی کھینچ رہی تھی۔ سعدیہ نے سارے صحن میں جھاڑو لگا کر کوڑا ٹوکری میں ڈال کر ٹوکری گھر سے باہر گٹر پہ رکھ دی۔ تب ہی اس نے دیکھا کہ محلے کی دو' تین لڑکیاں چادروں سے چہرہ چھپائے تیز تیز قدم اٹھاتی گلی کے نکڑ پر کھڑی ویگن کی طرف بڑھتی جارہی ہیں۔ یہ ناخواندہ لڑکیاں فیکٹری میں ملازمت کرتی تھیں۔ ویگن انہیں چھوڑنے اور لے جانے آتی تھی۔ وہ رابعہ کو ہٹا کر خود بان کی رسی کھینچنے لگی۔

"اماں۔۔۔ میں کچھ سوچ رہی ہوں۔" اس نے صرف چند لمحے سوچنے اور فیصلہ کرنے میں لیے تھے۔ اماں کو آگاہ کرنا ضروری تھا۔

"پتا نہیں! میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ جلدی سے چارپائی بنوں' ملکوں سے اس کی اجرت لے کر شام کی ہانڈی روٹی کا انتظام کروں۔ دو قمیصیں سلنے کو آئی ہیں۔ رات کو سلائی کروں گی' تیرے باپ کی دوائیں بھی لانی ہیں' دو دن سے پیر کی پٹی بھی نہیں کروائی' کہیں زخم نہ خراب ہوجائے۔" حمیداں کی اپنی فکریں تھیں۔

دو وقت کی روٹی اور دوائیں ہی ان کے روزمرہ کے مسائل تھے۔ انہوں نے اب باسط سے الجھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی کم ہی گھر پر نکتا تھا۔ صبح کو نکلا' رات کو دیوار پھلانگ کر گھر آجاتا۔

"اماں۔۔۔ میں کہیں نوکری کرلوں۔" اس نے لمبی تمہید باندھنے کے بجائے سیدھا کہہ دیا۔

"تین' چار' پانچ۔۔۔" رسیوں کو گنتے حمیداں کے ہاتھ ساکت ہوگئے۔

ان کے پورے خاندان میں کسی لڑکی نے نوکری نہیں کی تھی۔ گھر بیٹھ کر چھوٹی موٹی دستکاری کرلی جاتی۔ خود اماں نے بلا ضرورت کبھی دہلیز نہیں پھلانگی۔ جب تک اکرم دین سلامت تھا۔ دھنیے کے پتے تک خود لا کر دیتا رہا۔

حمیداں کی کھردرے بان کی وجہ سے انگلیاں چھلی جارہی تھی مگر اپنے بچوں کے پیٹ کی خاطر اپنی تکلیف کی پروا نہیں تھی۔

"نوکری۔۔۔ کون سی نوکری؟" حمیداں کے ہاتھ تھم گئے۔

وہ تحیر اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں گھری استفسار کررہی تھیں۔

"اپنی گلی کی لڑکیاں فیکٹری جاتی ہیں۔ ویگن انہیں چھوڑنے اور لے جانے آتی ہے' میں بھی ان کے ساتھ چلی جایا کروں گی۔" وہ نظریں نیچے کیے چنگاٹھ کو انگلی سے کھرچ رہی تھی۔ حمیداں کے تکلیف وہ تاثرات دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

"تجھے زیادہ ذمہ دار بننے کی ضرورت نہیں' میں کچھ نہ کچھ کررہی ہوں نا' تو دن میں رشیدہ کے پاس سلائی کڑھائی سیکھنے چلی جایا کر اور شام کو بچے ٹیوشن پڑھانے شروع کردے۔ میں آج ہی کچھ گھروں میں ٹیوشن کا کہہ کر آتی ہوں۔"

"پر اماں! سلائی سیکھنے میں سال بھر لگ جائے گا اور یہاں کے غریب غربا تجھے کتنی ٹیوشن فیس دے سکیں گے؟" اس نے ایک بار پھر ہمت پکڑی تھی۔

"دو' تین' چار۔۔۔" حمیداں پھر گنتی بھول گئیں۔

"اپنا منہ بند کرکے رسی پہ دھیان دے۔" حمیداں نے سختی سے ٹوک کر سعدیہ کو چپ کروادیا تھا مگر وہ رات کو بھوک سے روتے بلال اور رابعہ اور درد سے کراہتے ابا کو چپ نہیں کرواسکی تھیں۔

ملکوں نے چارپائی کی اجرت صبح دینے کا وعدہ کرلیا تھا۔ رابعہ بھوک سے زیادہ ہی نڈھال تھی۔ شاید وہ اٹھ کر روٹی کے ٹکڑے کے لیے تائی کے گھر بھاگ جاتی' جو کہ اماں کو بالکل گوارا نہ تھا۔ انہوں نے بیرونی دروازے کے کنڈے میں تالا ڈال کر چابی پراندے کے دھاگے سے باندھ لی تھی۔ "دروازے کو تالا لگالیا اماں! پر اس کے منہ کو کیسے تالا لگاؤ گی؟"

سعدیہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بے سبب کھڑی روتی رابعہ کو سن رہی تھی۔ چھوٹی بہن جھوٹے بہلاووں سے بہلنے والی نہیں تھی۔ تخت پر مشین رکھ کے بیٹھی حمیداں نے بغور اس کو دیکھا۔ متورم آنکھیں' بھیگی پلکیں' ستا ہوا چہرہ' بکھرے بال اور ہلکے ملگجے کپڑے۔۔۔ حمیداں ان پڑھ ہی سہی' مگر اپنی اس بیٹی کو بہت سارا پڑھانے کا خیال تب سے پنپ رہا تھا جب پانچ سالہ سعدیہ نے نرسری میں پہلی پوزیشن لی تھی۔

آج شام انہوں نے محلے کی عورتوں کو بچوں کو ٹیوشن بھیجنے کو کہا تو کئی ایک نے فوراً" انکار کردیا' کچھ نے اتنی کم فیس بتائی کہ وہ چپ چاپ اٹھ آئیں۔ ہر کوئی ان کی مجبوری سے بے خبر' فائدہ اٹھانے کو تیار تھا۔

"تو۔۔۔ تو وہ بہ۔۔۔ کو کچھ کہہ رہی تھی۔"

حمیداں سست روی سے قمیص کی ترپائی کرتے بہت دور پہنچی ہوئی تھیں۔

"کیا۔۔۔؟" سعدیہ کے سر پہ رابعہ کی گھٹی گھٹی سسکیاں' کسی ہتھوڑے کی مانند برس رہی تھیں۔

"وہ۔۔۔ فیکٹری۔۔۔ نوکری کا۔۔۔" سوئی کی نوک بڑی زور سے انگلی کی پور میں چبھ گئی تھی۔ خشک حلق سے "سی" کی آواز نہیں نکل پائی تھی۔

"آپ اجازت دو تو چھابڑی سر پہ رکھ کے لہسن ادرک بھی بیچ لوں گی' پر رابعہ اور ابا کو سسکنے سے بچالو اماں!"

ستون سے سر ٹکا کے آنکھیں کرب سے موندلی تھیں۔ کتنے ہی آنسو چہرے کو بھگو گئے تھے۔ حمیداں نے نظریں اٹھا کے بہت پیار سے اپنی نیک فطرت بیٹی کو دیکھا۔ حساس تو وہ پیدائشی تھی مگر اس قدر گداز دل۔۔۔ غربت انہیں اس مقام تک لے آئے گی' کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"تو فیکٹری چلی جایا کر۔" سر جھکائے وہ زمین میں جیسے گڑسی گئی تھیں۔

"میں گڈی سے کہنے جارہی ہوں کہ صبح مجھے بھی

فیکٹری ہی جائے۔" سعدیہ نے ماں کی بڑی سی چادر سے خود کو چھپا کر پراندے کی ڈوری سے چابی کھولی اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔



وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ میٹرک کی سند کی بنا پر اسے کوئی چھوٹی موٹی سیٹ مل جائے گی مگر اسے اپنی ساتھی چٹی ان پڑھ لڑکیوں کے ساتھ ہی پیکنگ کا کام کرنا پڑا۔ البتہ نگراں نے اس کا تفصیلی انٹرویو کر کے یقین دہانی کروائی تھی کہ اس ماہ کے آخر میں تین لڑکیاں مشین چھوڑ دیں گی۔ تب وہ ان کی جگہ بیڈ شیٹس کی سلائی کیا کرے گی۔ اس عہدے پر اس کی تنخواہ میں ایک ہزار کا اضافہ ہو جائے گا۔ بادل ناخواستہ اسے ایک مہینہ پیکنگ کرنا پڑی تھی۔

نگراں ریحانہ اس کی خاموش اور اپنے کام سے کام رکھنے والی طبیعت سے بہت متاثر ہوئی۔ اکثر اس کے پاس رک کر ادھر ادھر کی باتیں بھی کر لیتی۔ اسی نے سعدیہ کا دھیان پرائیوٹ تعلیم جاری رکھنے کی طرف دلوایا تھا۔ اس نے اماں کے مشورے سے ایف اے میں داخلہ فارم جمع کروا دیا تھا۔ تائی نے اس کے نوکری کرنے پہ لاکھ ناک بھوں چڑھایا اور خاندان والوں سے طرح طرح کی باتیں کی تھیں مگر وہ ان سب رویوں کو نظر انداز کر کے اکثر چپکے سے اوپر چھت پہ چلی جایا کرتی تھی۔ جہاں تائی کا اکلوتا سپوت اپنی کتابیں پھیلائے بڑے انہماک سے پڑھائی میں مگن ہوتا تھا۔

"تم ذرا سی فرصت میں بھی کتابیں لے کر بیٹھ جاتے ہو، تھکتے نہیں؟" کافی دیر اس کے متوجہ ہونے کا انتظار کر کے وہ خود ہی بول پڑی۔

"نہیں....." اس نے آواز پہ یک دم چونک کر سر اٹھایا۔ سعدیہ کو سامنے پا کر ٹھنڈی سانس بھری۔

ڈھائی ماہ ہو گئے تھے اسے نوکری کرتے۔ اس دوران ان کی یہ دوسری ملاقات تھی۔

"کیسی جا رہی ہے تمہاری جاب؟" وہ کتاب بند کر کے دیوار کے پاس آ کھڑا ہوا۔

پورے خاندان میں سعدیہ کی جاب مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ماں کی زبانی بہت کچھ سننے کو ملتا رہتا تھا۔ وہ بہت قابل اعتراض باتیں بھی سعدیہ کے متعلق کہہ جاتی تھیں۔ جنہیں سن کر وہ خاموش احتجاج کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"بہتر ہے اور تمہاری نوکری؟" وہ بھی پڑھائی کے ساتھ ساتھ نوکری جاری رکھے ہوئے تھا۔

"ہوں ٹھیک، کب تک نوکری جاری رکھو گی؟" محسن کا انداز بہت مبہم اور سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھوں کی مخصوص چمک بھی ماند تھی، جو سعدیہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہمیشہ کوندا کرتی تھی۔

"جب تک حالات دسترس میں نہیں آجاتے۔"

جب سے زندگی حقیقی معنوں میں سمجھ میں آئی تھی اس نے زندگی سے ٹال مٹول کرنا، تلخ حقیقتوں کو پس پشت ڈالنا چھوڑ دیا تھا۔ خود ایک قدم آگے بڑھا کر حالات سے سامنا کرنے کی ہمت اس میں تھی۔

"اگر حالات سنوارتے، سنوارتے میں دسترس سے نکل گیا تو....؟"

سعدیہ نے خوف آمیز تحیر لیے اسے دیکھا۔ جو سر جھکائے انگوٹھے سے دیوار کا سیمنٹ اکھاڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

دادی مرنے سے قبل سعدیہ اور محسن کو منگنی کے بندھن میں باندھ گئی تھیں۔ حمیداں اور زبیدہ نے صرف اس ایک معاملے میں خاصی فرماں برداری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اپنے شوہروں کی التجا بھری نظروں کا مان رکھ لیا تھا۔ سعدیہ کی عمر دس سال اور محسن پندرہ سال کا میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔

"تو....." سعدیہ نے اسے ادھورا جملہ مکمل کرنے پر اکسایا تھا۔ وہ اس کی سوچ میں آنے والی تبدیلی کو پکڑنا چاہتی تھی۔

"امی بہت ناراض ہیں، سادی! ہمارے خاندان کی سات پشتوں میں بھی کسی عورت نے گھر سے باہر جا کر نوکری نہیں کی۔"

محسن صاف بات پلٹ گیا تھا۔ اس کا ہمیشہ والا

دھیما، نرم خوانداز تھا مگر سنجیدگی ہنوز قائم تھی۔ وہ ابھی تک نظریں جھکائے گفتگو جاری رکھے ہوئے تھا۔

"تائی اماں خاندان والوں سے اور بھی بہت کچھ کہہ رہی ہیں۔ اگر انہیں میرے نوکری کرنے پر اعتراض ہے تو وہ یہ بات ڈائریکٹ گھر آکے مجھ سے بھی کر سکتی ہیں بالآخر میں ان کی ہونے والی بہو ہوں۔ حق ہے ان کا۔ وہ معمولی سی بات سمجھنے کے بجائے اچھال کیوں رہی ہیں۔" اس نے اپنے اندر اٹھتے لاوے پہ قابو پاکے بہت صبرو تحمل سے کہا تھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں دو محاذوں پہ نہیں لڑ سکتا۔" وہ اسے اپنی کمزوری سے آگاہ کر رہا تھا۔

یہ بھی سچ تھا کہ وہ چچا کے بگڑتے حالات اور مفلسی کا احساس کرتا تھا۔ وہ سعدیہ کے مضبوط کردار کا گواہ تھا۔ اسے سعدیہ کے نوکری کرنے پر قطعاً" اعتراض نہیں تھا۔ وہ اس کے اس قدم کو درست سمجھتا تھا۔ مگر ماں کا ہر وقت اس کے متعلق الٹا سیدھا بولتے رہنا اسے اپنے مستقبل کے لیے خطرے کا الارم لگتا تھا۔

سعدیہ اس کی کم عمری کی محبت تھی۔ اسے کھونے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ماں کے بدلتے تیور اسے کچھ اور ہی باور کروا رہے تھے۔ وہ اپنی ماں کو کبھی بھی کسی معاملے میں قائل نہیں کر سکا تھا۔ چاہے وہ گھریلو نوعیت کا معمولی سا مسئلہ کیوں نہ ہو؟ چار بہنوں اور ماں کے آگے اس کی رائے کی ذرا بھی اہمیت نہیں تھی۔

"میں اپنے اور تمہارے رشتے کو بچانے کی خاطر، تائی سے خوف زدہ ہو کر نوکری چھوڑ دوں؟" وہ بہت دل گرفتی اور مایوسی سے استفسار کر رہی تھی۔ اسے محسن سے اتنی کم ہمتی کی امید نہیں تھی۔

"رشتے کو نہیں سادی، محبت کو۔" اس نے پرزور انداز میں تصحیح کی اور وہ چپ کی چپ رہ گئی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے، وہ پھر بھی اسے منانے پہ مصر تھا۔ وہ شاید خود غرض ہو رہا تھا۔ اور سعدیہ سے بھی اسی خود غرضی کی توقع باندھ رہا تھا۔

"جو محبت مجھے اپنے والدین اور چھوٹے بہن، بھائیوں سے ہے، وہ کس کھاتے میں ڈالوں؟ ابا کو اپنے زخموں پہ کرلاتا، رابعہ اور بلال کو بھوک سے بلبلاتے چھوڑ کر تمہاری محبت کے رنگ میں رنگ جاؤں؟ ان کی تکلیفوں پہ پھاہا رکھنے کے بجائے تمہاری سنگت کے گیت گاؤں۔"

اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔ وہ لمحوں کا توقف کرکے پھر گویا ہوئی تھی۔

"تمہاری محبت بھی حقیقت سہی محسن! لیکن ان سب کی محبتیں تمہاری محبت پہ بھاری ہیں۔" آنسوؤں نے آنکھوں کی باڑ پھلانگ لی تھی۔

"میں باسط کو سمجھاتا ہوں، وہ مان گیا تو کسی نوکری کا بھی بندوبست کر دوں گا، پھر تم۔"

"اگر وہ نہ مانا....." سعدیہ دوبدو بولی تھی۔

اسے باسط کی طرف سے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ اسے اپنے بھائی کی خصلتوں کا علم تھا۔ محسن نے تب سے جھکی نظریں اٹھا کے اس کے نم چہرے پر جمادی تھیں۔ ان آنکھوں میں محبت، خوف، التجا، خفت اور بے بسی کے علاوہ بھی بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔

"پھر تمہیں سمجھاؤں گا، تم مان جاؤ گی نا؟" وہ کتنی آس لیے پوچھ رہا تھا۔ ایک طرف محسن کی محبت تھی دوسری طرف بہت سی محبتیں۔ کبھی وہ اپنے والدین کا صرف مان تھی، اب سہارا بھی۔ اسے بہت سی محبتوں کی طرف داری کرنا تھی۔ دونوں کے حالات حقیقت پسندی کے متقاضی تھے۔ خوش فہمی کا آسرا لینا نری حماقت تھا۔

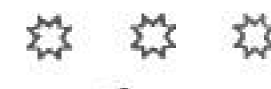
"اگر میں بھی نہ مانی....." اس کی کھوکھلی آواز اتنی دھیمی تھی کہ وہ بمشکل سن پایا۔

"پھر آخری کوشش کے طور پر اماں کو سمجھاؤں گا۔"

"اگر وہ بھی نہ مانیں تو....."

سعدیہ کا جی چاہا کہ محسن کے منہ پہ ہاتھ رکھ کے اسے خاموش کروادے، اسے کہے کہ اپنی ادھوری بات کبھی مکمل نہ کرنا۔

"تو میں اماں کی مان لوں گا۔" اب کھڑا ہونے کی سکت نہیں تھی۔ وہ فوراً "مڑ گیا۔ سعدیہ صدمے کی سی کیفیت میں دیوار کے ساتھ پشت رگڑتی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔



ان دونوں نے محبت کے کبھی لمبے چوڑے عہد و پیماں نہیں باندھے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی امانت طے تھے۔ اس کے بعد کسی اظہار یا توقع کی گنجائش ہی نہ نکلتی تھی۔

وہ بس ایک دوسرے کو حاصل کر لینا چاہتے تھے۔ جہاں محسن اسے دیکھ کر کھل اٹھتا تھا، وہیں سعدیہ کے چہرے پہ بھی ڈھیروں قوس قزح کے رنگ بکھر جاتے۔ جب وہ کوئی شوخ جملہ کہہ جاتا تو دونوں ذہن میں اس کی گردان کرکے محظوظ ہوا جاتا۔ ان کی محبت میں عجیب سا بانکپن اور سادہ لوحی تھی۔

اس ملاقات کے دو ہفتوں بعد محسن کا ایم بی اے کا رزلٹ آگیا۔ اس نے اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ خود مٹھائی لے کر ان کے گھر آیا تھا کیونکہ سعدیہ نے چھت پہ جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے مٹھائی لیتے ہوئے اسے پاس ہونے کی مبارک باد دی تھی۔

ڈیڑھ ماہ بعد اسے اماں کی زبانی پتا چلا کہ محسن نے پرانے آفس سے جاب چھوڑ دی ہے۔ اسے کسی بڑی کمپنی میں جاب کی آفر ہوئی ہے۔ تنخواہ بھی اچھی خاصی ہے۔ وہ لب کچلتی سب سنتی رہی۔ وہ ہمہ وقت آنے والے وقت کے وہموں میں مبتلا رہتی۔

محسن کو جاب کرتے محض تین ماہ گزرے تھے کہ اس کی بڑی دونوں بہنیں ان کے گھر آئیں۔ وہ کچھ دیر قبل فیکٹری سے لوٹی تھی اور اب تخت پر لیٹی ستا رہی تھی۔ شام کا سالن اور روٹی وہی بناتی تھی۔

"السلام علیکم چاچی!" دھاڑ سے دروازہ کھلا تھا۔ باجی زہرہ اور نگار اپنے بدتمیز بچوں سمیت آن وارد ہوئیں۔ گھر میں یکدم اودھم مچ گیا تھا۔

"ہائے چاچی! آپ برتن مانجھ رہی ہیں۔ وہ آپ کی لاڈلی کہاں ہیں؟ خیر سے میرے منجھلے نے مجھے خبر دی تھی کہ اس کی شاہی سواری اسے گلی کی نکڑ پہ اتار گئی ہے۔"

نگار باجی نے آتے ہی دھاوا بول دیا۔ ان کا اشارہ یقیناً" دین کی طرف تھا۔ انہیں اتنی طوفانی حالت میں دیکھ کر اس کے تو حواس معطل ہوگئے تھے کیونکہ وہ شاید کسی خاص کام سے آئی تھیں۔

"نن۔ نہیں، وہ ابھی تھکی ہوئی لوٹی ہے، میں نے....."

"لو اور سن لو۔" اب کے نگار باجی ٹھٹھا مار کر ہنسی تھیں۔ اماں کی منمناتی آواز ان کے بلند قہقہے میں دب گئی۔ تب ہی اندر لیٹی سعدیہ بھی کپڑوں سے شکن نکالتی باہر آگئی۔ ماتھے کی شکنیں ہنوز تھیں۔

اسے ان بہنوں کی طنزیہ گفتگو سے بڑی چڑ تھی۔ وہ بچپن سے دیکھتی چلی آرہی تھی کہ ساری بہنیں بڑی ذو معنی الفاظ اور اشاروں میں ان کے گھر کے متعلق باتیں کیا کرتی تھیں۔ جو تب اسے سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر اب وہ سمجھ دار ہوگئی تھی۔

"چاچی! آپ کی لاڈلی کولہو میں بیل کی جگہ تھوڑی جتی ہوئی تھی۔ جو تھک گئی ہے۔ ہم بھی دن بھر لگی رہتی ہیں، کبھی تھکاوٹ کا ڈھونگ نہیں رچایا۔ اب ہم عورتیں گھر کے کام نہیں کریں تو اور کون کرے گا؟ اب ہماری ماں بے چاری بوڑھی، وہ بہو کے ایسے چونچلے اٹھانے سے رہی اور تم خیر سے اپنی لاڈو رانی کی عادتیں بگاڑ کے ہمارے ہی متھے مار دو گی ایسی لڑکیاں بسنے....."

"باجی! آپ کے لیے کچھ ٹھنڈا لاؤں؟" باجی نگار کی زبان کو یکدم بریک لگ گئے۔ سب نے گردن موڑ کر برآمدے میں کھڑی سعدیہ کو دیکھا۔

اماں یونہی دیگچی مانجھنا بھول کر ان کی لن ترانیاں ہونقوں کی طرح سن رہی تھیں۔ وہ بار بار وضاحت کے لیے منہ کھولتیں مگر ان کی چلتی زبان کے سامنے رک جاتیں۔

"تو! سلام نہ دعا۔ گھر آئے مہمان کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔" اب زہرہ باجی کی بولنے کی باری تھی۔

نگار آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا بھرپور جائزہ لے رہی تھی۔ جیسے نوکری کرنے سے اسے سرخاب کے پر لگ گئے ہوں۔ سعدیہ کو ان کی چبھتی نگاہوں سے الجھن ہونے لگی۔

حمیداں کو محسن کے اچھے اوصاف اور دھیما مزاج پسند تھا۔ اس کے علاوہ اس رشتے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ حمیداں کی روایتی سوچ شریف النفس لڑکا اور کماؤ پوت تک ہی محدود تھی۔ ساس نندوں کے دل میں جگہ خدمت اور فرماں برداری سے بھی بنائی جاسکتی تھی۔

"میں نے سوچا، پہلے کچھ ٹھنڈا پلا کر آپ کا دماغ ٹھنڈا کردوں۔ اس کے بعد سلام دعا بھی ہو جائے گی۔"

اس نے بھی اپنے غصے بھرے تاثرات چھپا کر مسکراہٹ میں لپٹا طنز کیا تھا۔ ان کے ساتھ یوں ہی نمٹا جاسکتا تھا۔

شربت کے بعد چائے اور بسکٹ سے ان کی تواضع کی گئی۔

حمیداں نے اسے کئی مرتبہ مبہم سے انداز میں کھانا پکانے کا اشارہ بھی دیا تھا۔ مگر وہ ڈھیٹ بنی بیٹھی رہی۔

"ہاں بھئی چاچی! کب تک سعدیہ کی شادی کرنے کا ارادہ ہے؟"

زہرہ نے بڑی سی ڈکار لے کر اپنی آمد کا اصل مدعا بیان کیا۔ یہی خاص بات کرنے کے لیے انہوں نے چاچی کے غربت خانے کو رونق بخشی تھی ــــ حمیداں کا اس اچانک حملے پہ رنگ فق ہوگیا۔

"اتنی جلدی۔"

"جلدی کیسے چاچی! ہمارے بھائی نے اتنا سارا پڑھ لیا۔ بڑے آفس میں نوکری کرتا ہے، بیوی کا بوجھ اٹھا سکتا ہے، لوگوں کے بیٹوں کی طرح آوارہ گرد تھوڑی ہے۔ ہمیں اپنے بھائی کے سر پہ سہرا سجانے کا بڑا ارمان ہے۔ آخر ہمارا میکہ اسی سے آباد رہے گا۔" زہرہ نے بڑے مغرورانہ انداز میں بھائی کی تعریف کی۔

"ابھی میری کوئی تیاری ہی نہیں ہے۔"

حمیداں نے صاف بتادیا۔ یہ کوئی پردہ رکھنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ اگر وہ محسن کی شادی کا ارادہ کرچکے تھے تو ٹال مٹول سے کام نہیں لیا جاسکتا تھا۔ دونوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر حمیداں کو

"آٹھ سال ہوں گئے منگنی کو بیٹی کی ماں ہونے کے ناطے کچھ تو جوڑا جتا ہوگا۔ چاچے نے بھی ساری عمر بڑی کمائی کی ہے، وہ سدا کا چارپائی پہ نہیں پڑا ہے اور سعدیہ جو کما کے لاتی ہے، وہ بھلا کدھر خرچ ہوتا ہے۔" نگار نے جارحانہ پینترا بدلا تھا۔

سعدیہ کے تلووں لگی سر پہ بجھی، باپ کے لیے بار بار چارپائی کا لفظ اسے تپا رہا تھا۔

"دیکھیں نگار باجی....."

"چل سعدیہ! جا کے ہانڈی چڑھا۔" ماں نے اس کا جملہ پورا نہ ہونے دیا۔

وہ ماں تھیں اور بیٹی کے بہتر مستقبل کے لیے ہر اچھی بری سننے کو تیار تھیں۔ ان کی مجبوری معذور شوہر اور آوارہ بیٹا تھا۔

"کپڑا، برتن اور بستر۔ میں نے بنا کے رکھے ہیں مگر۔ مگر فرنیچر خریدنے کے لیے میرے پاس رقم نہیں ہے، تم لوگ تھوڑا انتظار کرلو میں اس کا انتظام بھی کرلوں گی۔"

حمیداں اٹک اٹک کر بڑی لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔

محسن دیکھا بھالا، ہاتھوں پلا سعادت مند بچہ تھا۔ ورنہ جب سے جیٹھ فوت ہوا تھا۔ جٹھانی نے بھی عید بقرعید پہ بھی ہونے والی بہو کے ہاتھ پہ سو روپیہ نہ دھرا تھا۔ حمیداں اس رشتے کے انجام بخیر ہوجانے پر مشکوک تھیں۔ ان حالات میں انہوں نے رشتے کا از سر نو ذکر کرکے جہاں دل میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی وہیں لاتعداد فکروں نے بھی گھیر لیا تھا۔

چیرتا ہوا جملہ تھا۔

انہوں نے بھلا کب بیٹی کی کمائی سے فضول خرچی کی تھی۔ گوشت کا ذائقہ چکھے مہینوں گزر گئے تھے۔

"حمیداں چاچی نے ابھی سے ہم بہنوں کو مکھن سے بال کی طرح نکالنے کی ٹھان لی ہے۔ ہمارا منتوں مرادوں والا بھائی اور ہم اس کی شادی میں شرکت ہی نہ کریں۔"

"ساری عمر ہمارا چاچا کمائی کر کر کے بڑگیا اور چاچی کے پاس سے چار دھیلے بھی نہ نکلے۔"

"حمیداں نے اپنے سسرالیوں سے دیا برتا ہوتو اسے میری بیٹیوں کے سسرال کا بھی کچھ خیال ہوتا۔ سسرال کے بغیر بھی بھلا عورت کی کوئی عزت ہوتی ہے۔" زبیدہ نے آخری تیر پیوست کیا تھا۔ حمیداں نے بے حد شکستگی سے جٹھانی اور چچا زاد بہن کو دیکھا۔ وہ سارا قصور اسی پہ ڈال کے اسے موردالزام ٹھہرا رہی تھی۔

اکرم نے بیوی کی بے بسی پر جھکا سر اٹھایا اور پھر سے جھکا کر گلا کھنکھارتے گویا ہوا۔

"اچھا بھابھی! اب آپ بتادیں سارے معاملات کیسے طے کریں، ہمارے پاس جو ہے ہم نے کھل کر بتا دیا ہے۔"

اکرم دین کا لہجہ دھیما اور بھیگا ہوا تھا۔ زبیدہ نے سوالیہ نظریں بیٹیوں پہ ڈالی اور ہنکارا بھرا۔

"میں کیا بتاؤں بکھیڑا آپ کا ہے، سلجھائیں بھی آپ خود ہی۔ ہم نے چار مہینے کا ٹائم دیا تھا۔ اب آپ لوگوں کا یہ رونا دھونا اور واویلا سن کر میں مزید ایک مہینہ دے سکتی ہوں مگر چند ایک لوگوں کو بارات میں لا کر بیٹیوں کو سسرال سے نکلوانا نہیں چاہتی۔ ماشاء اللہ وہ سب بھرے پرے گھروں میں بیاہی ہیں۔ پھر میرا اپنا میکہ بھی۔ ہم خوش اخلاق اور کھلے دل سے ملنے جلنے والے لوگ ہیں۔ کس کو بلائیں گے اور کسے منع کریں۔" زبیدہ نے چبا چبا کر کہتے ہوئے اجنبیت کی حد کردی تھی۔

وہ ماں بیٹیاں جانے کیا منصوبہ بنائے بیٹھی تھی۔ جو کچھ بھی ماننے کو تیار نہ تھیں۔

"ہم آپ کے سارے مطالبات مان لیں گے۔ ایک مہینے کا وقت بہت تھوڑا ہے کم از کم ایک سال دے دیں ہم آپ کو کوئی۔"

"نہ بابا نہ! مجھ سے اب بوڑھی ہڈیوں کے ساتھ کام نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی جوڑ میں درد اٹھا ہی رہتا ہے۔ جب میرا بیٹا کما رہا ہے تو میں کیوں نہ اس کا گھر آباد کروں۔ زندگی کا کیا بھروسا، اپنے جیتے جی اسے بسادوں بیٹیوں کا میکہ بھائی کے دم سے آباد رہے گا۔" زبیدہ نے قطعیت سے کہا۔

مسئلہ ان میاں بیوی کی عقل سے بالاتر تھا۔ زبیدہ اور اس کی بیٹیاں انہیں کسی بھی معاملے میں ذرا سی بھی گنجائش دینے کو تیار نہیں تھیں۔

زبیدہ ہر دس سیکنڈ بعد پہلو بدلتی۔ "یا پھر فرنیچر کی چند مہینوں کی مہلت دے دیں۔" بیٹی کے رشتے کو بچانے کی آخری کوشش۔

"نہ بھئی! مجھے شریکے میں ناک نہیں کٹوانی اور یہ "بعد" کس نے دیکھی ہے۔ سعدیہ کی شادی ہوگی، کمانے والا کوئی ہے نہیں تم لوگ جہیز کس کی کمائی کا دوگے، میرے بیٹے کو جہیز والیاں بہت۔" صفا چٹ انکار۔ اصل بات منہ سے نکل ہی گئی۔

سفاکی کی انتہا تھی۔ اس کے آخری جملے کا مطلب و مفہوم وہ بخوبی سمجھ گئے۔ ساتھ ہی ان کے اڑیل پن کی چھپی وجہ بھی سامنے آگئی۔ زبیدہ ان کے منہ سے انکار سننے کی خواہش مند تھی تاکہ جہیز اور زیور کی لالچ میں خاندان میں بے عزتی کا باعث بننے سے بچا جائے۔

"چاچی! تمہارا زیور بھی تو تھا۔ کب تک سنبھال کر رکھوگی۔"

"چاچی کوئی الیکٹرک سامان بھی نہیں خریدا ہوگا۔ ہم نے بھورانی کی چارپائیاں، دریاں، رضائیاں اور کھیس کی نمائش کر کے شریکوں اور سسرالیوں میں ذلیل ہونا ہے۔ ہمارے بھائی کو کوئی لڑکیوں کی کمی ہے۔"

"دھی تو فقیر کی بھی دروازے پہ نہیں بیٹھی رہتی۔ لوگ جہیز اور باراتیوں کے بغیر بھی لڑکی بیاہ کر لے جاتے ہیں، ہم پھر سگا خون ہیں۔ کم از کم مرحوم بھائی اور اماں جی کی آخری خواہش کا ہی احترام کرلو۔"

اکرم دین کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ اپنے لاچار وجود کا احساس کئی گنا بڑھ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے بھئی! جو غیر لوگ آپ کی لاڈو کو بغیر جہیز اور باراتیوں کے لے جاتے ہیں، آپ اسے ان کے ساتھ ہی وداع کریں۔ مرنے والوں کی دی گئی ذلت مجھے اپنے گلے ڈالنے کا کوئی شوق نہیں۔" زبیدہ اس چوہے بلی کے کھیل سے تھک گئی تھی۔

اس گھنٹہ بھر کی بحث کا کوئی حسب منشا نتیجہ نکلتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ برادری کے ڈر سے خود انکار نہیں کرسکتی تھی۔

اس کے پاس اس انکار کی وجہ اپنی بھانجی نازیہ تھی۔ جس کے باپ کی دو مربع زمین تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی پڑھی لکھی بہن۔ ایک بھائی ڈاکٹر، دوسرا امریکا اور تیسرا باپ کے ساتھ زمینوں پہ ہوتا تھا۔ وہ چھٹیوں میں محسن کے پاس پڑھنے کے لیے آئی تھی۔ دھیمے مزاج کا فرماں بردار سا یہ کزن اسے ایسا بھایا کہ اس نے گھر پہنچتے ہی ماں سے اس رشتے کا ذکر کردیا۔ اس کی ماں اپنی بیٹی کی ضدی طبیعت اور محسن کی منگنی سے آگاہ تھی۔ پھر بھی بیٹی کی ضد سے مجبور ہوکر، زبیدہ کو فون کیا اس خیال کے تحت کہ زبیدہ کے منہ سے انکار سن کر نازیہ رو دھو کے خود ہی حقیقت تسلیم کرلے گی مگر انہیں حقیقتاً "شاک لگا تھا جب زبیدہ نے فون پہ ہی جھٹ پٹ رشتہ قبول کرلیا۔ ماں کے پاس فون سے کان لگائے کھڑی نازیہ کی خوشی دیدنی تھی۔ لڑکے کی شرافت کا پرچار کر کے بھائی، باپ کو بھی منا لیا گیا۔ حالانکہ وہ اتنے غریب گھر میں بیٹی دینے کے روادار نہیں تھے۔

زبیدہ کی لاٹری نکل آئی۔ بہن کی دولت و حشمت اسے خوابوں میں بھی نظر آنے لگی۔ بیٹیوں سے مشاورت کر کے دیور اور دیورانی سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ سارا ڈراما تخلیق کیا گیا تھا۔

ٹھیک دو ماہ بعد نازیہ بیاہ کر ان کے گھر آگئی تھی۔ محسن کو جھوٹی سچی رام کہانی سنا کر بہت سی باتوں سے بے خبر رکھ کر یہ رشتہ طے کیا گیا۔ محسن کو نازیہ سے اتنی دیدہ دلیری کی امید نہیں تھی۔ اسے ادھر ادھر سے بہت سی پوشیدہ باتیں معلوم ہوگئی تھیں۔ مگر زبیدہ اور اس کی بیٹیوں نے اس اکیلے کی ایک نہ چلنے دی۔

تب محسن نے بھی ضد میں آکر یہ شرط رکھ دی کہ "اگر نازیہ کا امریکا والا بھائی اسے امریکا کا ویزا دے گا، تب ہی وہ ان کی بہن سے شادی کرے گا۔"

پہلے زبیدہ نے خوب لعن طعن کی۔ اسے کمینے اور لالچی فطرت جیسے القابات سے نوازا، پھر جب ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و فکر کیا تو اس ویزے کے بہت سے فائدے نظر آنے لگے۔ ادھر نازیہ کے باپ بھائیوں کو خبر ہوئی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئے۔ زبیدہ اور لڑکیوں کو اپنی پڑ گئی۔ ویزا نہ سہی ٹرک بھر کے جہیز کپڑے اور ان چاروں کو بالیاں ڈالنے کا ذکر خالہ نے کیا تھا۔ انہیں زیادہ کے چکر میں تھوڑا سا بھی ہاتھ سے نکلتا دکھائی دینے لگا۔ وہ ایک بار پھر محسن کو راضی کرنے پہ کمربستہ ہوگئیں مگر انہیں زیادہ تردد نہ کرنا پڑا۔ نازیہ نے خودکشی کی ناکام کوشش کر کے انہیں مزید کسی زحمت سے بچالیا۔ وہ ٹرک بھر کے جہیز نندوں، نندوئی کے لیے کپڑے، چاروں کے لیے بالیاں اور ساس کے لیے دو کنگن اور شوہر کے لیے امریکا کا ویزا بھی لے آئی۔

☼ ☼ ☼

سعدیہ رات کے دس بجے کھانے کے برتن اور کچن صاف کر کے کمرے میں آئی تھی۔ رابعہ اس کی دن بھر کی تھکاوٹ کو مد نظر رکھتے اسے گھر کے کاموں سے دور رکھتی تھی مگر سعدیہ نے زبردستی شام کی روٹیاں اور کچن کی صفائی اپنے ذمہ لی ہوئی تھی۔ وہ بلاوجہ خود پہ تھکاوٹ کا خول نہیں چڑھائے رہتی تھی۔

رابعہ کسی سے سعدیہ کے موبائل پہ بات کر رہی تھی۔ بہن کو اندر آتا دیکھ کر فوراً" کال کاٹ دی۔

سعدیہ نے بھی اس کی یہ تیزی نوٹ کرلی تھی۔ وہ شکی ضرور تھی مگر چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ دو ایک بار پہلے بھی اس کی حرکت نوٹ کرچکی تھی مگر زیادہ غور نہیں کیا۔

"کس سے بات کررہی تھیں؟" سعدیہ نے لہجے کو حتی الامکان سرسری رکھا۔

"وہ... وہ ایک دوست تھی۔" وہ اپنی زبان کی لڑکھڑاہٹ چھپا نہیں پائی تھی۔

"اچھا، مجھے دیکھ کر بند کیوں کردیا، کرلیتیں بات۔" وہ جان بوجھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی چیزوں کی ترتیب درست کرنے لگی۔

"نہیں.... " وہ دوسری طرف شاید اس کے بھائی نے کال ریسیو کی تھی، اس لیے میں نے بات کیے بغیر فون بند کردیا۔"

وہ مزید سوالات سے بچنے کے لیے موبائل سعدیہ کے تکیے کے پاس رکھ کر جلدی سے کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ سعدیہ کا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے موبائل پہ ڈائل کالز چیک کیں۔ اسکرین پہ آنے والا نمبر اجنبی نہیں بلکہ اس کے چھوٹے ماموں کے بڑے بیٹے کا تھا۔

"کیا خیال ہے رابعہ! چھوٹے ماموں کے گھر چلیں؟" رابعہ نے حیرت سے سعدیہ کو دیکھا۔ وہ کبھی کبھار ہی کسی رشتے دار کے ہاں جانے پہ راضی ہوتی تھی، وہ بھی بڑی منت وسماجت کے بعد۔

"نیک خیال ہے، لیکن یہ نہ ہو میں نہادھو کر تیار ہوجاؤں اور آپ کا ارادہ بدل جائے۔" رابعہ کھل اٹھی۔

"نہیں بدلے گا ارادہ، تم نہالو، میں بھی اپنے کپڑے نکال کر پریس کرلوں۔" اس نے رابعہ کے چہرے پہ پھیلی خوشی کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔

رابعہ کے ساتھ سعدیہ کو بھی دیکھ کر ممانی فاخرہ حیرت کے ساتھ بہت خوش ہوئی تھیں۔ ان کی تینوں بیٹیوں نے بھی ان کا استقبال بڑی گرمجوشی سے کیا۔ ظفر بھی جانے کس کونے سے آن وارد ہوا۔ تب ہی غیر محسوس انداز میں سعدیہ نے بہن کے چہرے کو پرکھا۔ جس پہ ظفر کو دیکھتے ہی گلاب سے کھل اٹھے تھے۔ ایک لمبی سانس خارج کرکے وہ ممانی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

ظفر بی اے کرکے کسی موبائل کمپنی میں جاب کررہا تھا۔ اس سے چھوٹی تین بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ ماموں کی گارمنٹس کی دکان تھی۔ اچھی گزربسر ہورہی تھی۔ وہ اور ممانی کھلے صحن میں اکیلی بیٹھی تھیں۔

"دیکھو بھلا ان لڑکیوں کو، پھر سے کمرا نشین ہوگئیں۔ میرے ساتھ کھانے کا انتظام کون کروائے گا؟ ذرا جو انہیں گھر آئے مہمان کی پروا ہو۔" ممانی تخت پہ ہی سبزیوں کا بکھیڑا ڈالے بیٹھی تھیں۔

"کوئی مسئلہ نہیں ممانی! میں اور آپ مل کر کھانا پکاتے ہیں۔" سعدیہ نے چاولوں کی پرات اٹھالی۔ فاخرہ ممانی کے ساتھ مٹر چھیلتے، گوشت صاف کرتے، سلاد اور رائتہ بناتے، مٹر پلاؤ اور گوشت پکاتے وہ بے شمار باتیں کرچکی تھیں۔ اسے اپنی یہ ممانی اسی لیے پسند تھیں کہ وہ باتوں میں ہیرپھیر نہیں رکھتی تھیں۔ جو دل میں، ہوتا، ہی منہ پہ بھی۔

"ممانی! آپ ظفر کی شادی کردیں۔ بچیاں ابھی پڑھتی ہیں اور آپ کا گھٹنوں کا درد بہت مسئلہ بنتا جارہا ہے۔" سعدیہ نے ازراہ ہمدردی ان کی تکلیف پہ مشورہ دیا تھا۔ ویسے بھی وہ ٹٹولنا چاہتی تھی کہ ممانی ظفر کی شادی کہاں کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

"تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ ظفر ماشاءاللہ سے چھبیس برس کا ہوچکا ہے۔ کماتا بھی ہے، ارادہ تھا کہ مائرہ اور ظفر کی ساتھ کروں مگر مائرہ ابھی پڑھنا چاہتی ہے اب میں مائرہ کو لے کر ظفر کی شادی میں تاخیر نہیں کرسکتی۔" مٹر پلاؤ کو دم لگاتے انہوں نے بڑی وضاحت سے بتایا تھا۔

"کہاں کریں گی ظفر کی شادی؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"اچھی ہو، خوب صورت ہو، پڑھی لکھی ہو، سلیقہ

دیکھا۔لال سرخ جوڑے۔۔۔"

"محسن کو لال رنگ پسند نہیں۔" اس نے فوراً ٹوک دیا۔

"تمہیں اس کی پسند و ناپسند کی بڑی خبر ہے۔اس کی محبت جو تھیں۔" نازیہ کا لہجہ تپ گیا تھا۔

"ہاں تھی۔" سعدیہ نے "تھی" کو کافی چبا کر ادا کیا۔

"تمہارا بھرم رکھنے کو مان لیتی ہوں۔ مگر مجھے یقین نہیں ہے۔"

اب کی بار وہ چپ رہی۔ توا گرم ہو کر سینک چھوڑنے لگا تھا۔ یہی سینک اس کے اندر بھی اٹھ رہا تھا۔

"سچ بتاؤں' خواب میں تمہارے دولہے کا چہرہ بہت دھندلا سا دکھائی دیا تھا' ٹھیک سے پہچان نہیں ہو سکی۔" اسے حقیقتاً" افسوس ہو رہا تھا۔

"تو پھر ایک یقین اور کرو کہ وہ دولہا' تمہارا محسن ہرگز نہیں ہوگا۔" اس نے بہت احتیاط کے ساتھ جلتے توے پہ روٹی ڈال دی تھی۔

"جب دس سال گزر جانے کے باوجود محسن میری سنگت میں خوش نہیں' تو تم کیسے کسی اور کا ساتھ قبول کر لوگی؟"

"تم اپنے شوہر کی خود غرضی کو' محبت کے خوب صورت ریپر میں لپیٹ کر مجھے گفٹ مت کرو۔" سعدیہ نے پلٹے بغیر کہا۔

"ہاں' تاکہ تم بھی کسی شخص کے دس سال آسانی سے برباد کر سکو۔"

نازیہ نے گہرا طنز کیا۔وہ اپنے شوہر کی دربدری کا ذمہ دار سعدیہ کو ٹھہرا رہی تھی۔

"ضروری نہیں کہ ہر رشتے کی شروعات محبت سے ہو' کچھ رشتے ایمان داری کے بھی متقاضی ہوتے ہیں۔ محبت نہ سہی' مگر میں اس شخص سے ایمان دار رہوں گی۔" اس کے لہجے میں سچائی بولتی تھی۔ لمحہ بھر کو نازیہ دنگ رہ گئی۔

"شاید تمہیں حاصل کر کے میری تنہائی کی سزا ختم کر دے وہ۔"

اس کے لہجے میں جانے کون سے دکھ بول رہے تھے۔وہ شوہر کا ذرا سا التفات پانے کے لیے کتنے عذاب پال رہی تھی۔

"محبت کوئی غلطی نہیں ہوتی نازیہ! اگر محسن تمہیں محبت کی سزا دینے پہ' خود کو حق بجانب سمجھتا ہے تو میں بھی اس کی بے وفائی پہ اسے سزا دینے پر قادر ہوں۔"

"سعدیہ تم۔۔۔" نازیہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔اس سے کوئی بات نہیں بن پڑی تھی۔سعدیہ نے کتنی عقل مندی سے اسے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا تھا۔

خود اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔وہ اس روز' روز کی ذلت سے تنگ آچکی تھی۔نازیہ نے پہلی غلطی محسن سے شادی کی ضد لگا کے کی تھی' محبوب کو پایا یا کھویا یہ الگ بات ہے۔اب وہ اپنی اس غلطی کا ازالہ دوسری غلطی کر کے یعنی سعدیہ کی محسن سے شادی کروا کے کرنا چاہتی تھی۔

سعدیہ کا کہیں رشتہ نہیں ہو پایا تھا' تو یہ اس کی قسمت' لیکن وہ نازیہ کو اب تک نہ سمجھ سکی تھی کہ وہ خود غرض ہے یا بے حس۔وہ صرف اپنے محبوب شوہر کی نظروں میں سرخرو ہونے کے لیے سعدیہ کی زندگی تباہ کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ممانی نے ظفر کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کر دی تھی۔ انہوں نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے رشتہ مہم کا آغاز' عزیز و اقارب سے ہی کیا تھا۔سارے رشتے داروں' خاص طور پر بیٹیوں والوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ماموں' ممانی بذات خود بہت اچھے تھے گھر کا ماحول بھی قابل قبول تھا اور ظفر بھی برسرروزگار ایسے میں ہر ایک کی خواہش تھی کہ ہماری بیٹی کا نصیب جاگ اٹھے۔سعدیہ کو یہ اطلاع ذرا لیٹ ملی۔ رات جب وہ سب چٹائی پہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے' ابا نے موضوع چھیڑ دیا۔

"تمہاری بھابھی کو کوئی لڑکی جچی بھی کہ نہیں۔" ابا کا موڈ بڑا خوش گوار تھا۔ انہیں اچانک ہی یہ قصہ یاد آگیا۔

"بھابھی فاخرہ آسانی سے قابو آنے والی نہیں ہیں' وہ اس لڑکی کو بہو بنائیں گی جو ان کی اوپری منزل کے دو خالی کمروں کو جہیز سے بھر دے۔" ممانی فاخرہ کے ذکر پہ اماں کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ حالانکہ ان کی اپنی بھابھی سے اچھی علیک سلیک تھی۔ بس بھابھی کے جہیز کے تقاضے نے ان کے ذہن میں از خود عناد پیدا کر دیا تھا۔وہ انہیں بہت لالچی سی لگنے لگی تھیں۔ اس جہیز جیسی مصیبت نے' ان کی بڑی بیٹی کی خوشیوں کو ویرانیوں میں بدل دیا تھا۔

"ظفر کی بات کر رہے ہیں؟" سعدیہ نے چونک کر استفسار کیا۔

"ہاں۔۔۔" حمیداں نے یک لفظی جواب دیا۔انہیں اس ذکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔اس نے یک لخت رابعہ کو دیکھا۔ جس کی رنگت زرد تھی اور وہ بے دلی سے کھانا ٹونگ رہی تھی۔ سعدیہ کو ذہن پہ زور دینے سے یاد آیا کہ وہ کتنے ہی دنوں سے چپ چاپ کام نپٹاتی پھرتی ہے۔ اس نے ایک آدھ بار پوچھا بھی اور وہ مغموم سی ہنسی ہنس کر ٹال گئی۔

"سارا خاندان ظفر کو اپنی بیٹی دینے کو تیار ہے اور آپ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہیں۔" بلال کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

وہ آج جلدی ورکشاپ سے آگیا تھا۔ان سب کے ساتھ ہی رات کا کھانا کھا رہا تھا۔وہ گھریلو معاملات میں کم ہی دخل اندازی کرتا تھا۔اس کا یوں گفتگو میں حصہ ڈالنا کسی اور کے لیے نہ سہی سعدیہ کے لیے شدید حیرت کا باعث بنا تھا۔

"کیا مطلب؟" حمیداں انجان تھیں یا بن رہی تھیں۔

"مطلب یہ کہ آپ کو رابعہ کی شادی نہیں کرنی' ظفر آپ کا بھتیجا ہے' پہلا حق آپ کا بنتا ہے۔" اس بار اس کے اندر کی تلخی چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ماں کا صرف سعدیہ کے لیے پریشان ہونا' اب اسے پریشان کر رہا تھا۔ حمیداں' سعدیہ کی وجہ سے رابعہ کا معاملہ بھی اٹکائے ہوئے تھیں' بلکہ سچ تو یہ تھا انہوں نے کبھی رابعہ کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا' وہ فی الحال سعدیہ کو نپٹانا چاہتی تھیں' پھر کسی اور کی باری آتی تھی۔

"خیر سے رابعہ کا بیاہ بھی کروں گی مگر پہلے سعدیہ۔۔۔"

"کیا سعدیہ؟" اس نے درشتی سے ماں کو ٹوک دیا۔

ہر کوئی ساکن ہاتھ اور نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ والدین کے ساتھ حتیٰ کہ سعدیہ سے بھی اونچے لہجے میں بات نہیں کرتا تھا۔وہ ان رشتوں کے لیے خاص احترام اور جذبات رکھتا تھا۔وہ ماں' بہن کی مشقت اور قربانیوں کا گواہ تھا۔

"اگر سعدیہ آپی کی شادی نہیں ہو رہی تو یہ ان کا نصیب' اس کی سزا ہم کیوں بھگتیں؟ آپ انہیں لے کر اپنے دوسرے فرائض سے نظریں مت چرائیں۔ یہ نہ ہو آپی کے لیے بر ڈھونڈتے ڈھونڈتے رابعہ کی عمر بھی نکل جائے۔"

اس کا چہرہ ضبط سے سرخ اور سعدیہ کا پیلا پھٹک ہو گیا تھا۔وہ بڑی بہن سے نظریں چراتا' ہاتھ میں پکڑا لقمہ پلیٹ میں پٹخ کر دسترخوان سے اٹھ گیا تھا۔ رابعہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں ناکام ہو گئی تھی۔ سب ہی سعدیہ کی حالت دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔وہ بے جان وجود کو بمشکل سہارتی اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی لگا لی۔

بلال کے سنگین الفاظ' بے حس لہجہ اس کے دماغ پہ ہتھوڑے کی مانند برس رہے تھے۔ آنکھوں کے سوتے بالکل خشک ہو چلے تھے۔

وہ خالی الذہن کیفیت میں بہت کچھ سوچنے کی سعی کر رہی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ بلال کی بدگمانی کیسے دور کرے؟ رابعہ کے ظفر سے رشتے کی بات اور اماں کو منانا' کتنے مرحلے درپیش تھے۔

زندگی کے پندرہ سالہ سفر نے اس کے اندر بہت صبرو برداشت کا مادہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی فطرت سے بخوبی آگاہ تھی۔ وہ اس کی طرف سے دلبرداشتہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ بڑی تھی اور اپنے اس مقام کو قائم رکھنے کے لیے اسے بڑے پن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ وہ بلال کی طرف سے دل چھوٹا کر کے اپنی پریشانیوں میں مزید اضافہ نہیں کر سکتی تھی۔ بلال کا کہنے کا انداز غلط سہی' مگر جو کہا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔

اور رابعہ... وہ کس قدر گھنی نکلی۔ ایک بار بھی بڑی بہن سے تذکرہ نہیں کیا۔ وہ بھی خود کو بڑی بہن کی طرح ثابت قدم رکھنے کا عزم کر چکی تھی۔ اپنی محبت سے اتنی خاموشی کے ساتھ دستبرداری' پندرہ سال قبل والی کہانی پھر سے دہرائی جانی تھی۔ اگر ابا تذکرہ نہیں کرتے' بلال غصے سے چیخ نہ پڑتا اور رابعہ کے آنسو نہ نکل آتے تو... اس نے ساری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ایک فیصلہ کرنے پر مرکوز کر کے بڑی خالہ کو فون کیا اور انہیں بڑے سبھاؤ سے ماموں سے رابعہ کی بابت درخواست کرنے کو کہا۔ موبائل آف کر کے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پہ آ بیٹھی۔ آئینہ اس کی بڑھتی عمر کی چغلی کھا رہا تھا۔ ماتھے سے اوپر چند ایک بال سفید ہو چکے تھے۔ چھ ماہ قبل ہی اس نے بالوں کو رنگا تھا۔ آنکھوں کے نیچے دو' تین باریک لائنیں پڑ گئی تھیں۔ بہن اوڑھ کے بڑھتی عمر راز بن جاتی۔ وہ بے اختیار ہو کے رونے لگی۔ زار و قطار رونا۔ اپنی بے نصیبی یا بے قدری پہ' وہ ہمیشہ ان چھوٹے بہن' بھائی کی نگہبان بنی رہی تھی۔ کسی نڈر محافظ کی طرح۔ اس نے انہیں زمانے کے سرد و گرم سے بچا کے رکھا تھا۔ کبھی ان پر ذمہ داریوں کا بوجھ نہ ڈالا۔ اپنی استطاعت کے مطابق ان کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتی۔

اسے یاد تھا جب وہ پہلی بار نوکری پر گئی تھی۔ اس کی تنخواہ بہت کم تھی اور ضروریات زندگی زیادہ۔ اماں اخراجات بہت کھینچ تان کر' ہر کام بہت ناپ تول کر کرتیں' جب آٹا بھی اوا خانہ کی ... [illegible]

لگا کے گوندھا جاتا۔ جب بلال اور رابعہ زیادہ روٹی مانگ لیتے' وہ چپکے سے اپنے حصے کی روٹی ان کی خالی چنگیر میں رکھ کے ہاتھ صاف کرتی اٹھ جاتی۔ وہ سردیوں اور گرمیوں میں پہلے ان کے' پھر اپنے کپڑے سلواتی۔

جب محسن کی شادی ہو گئی۔ حمیداں بھی اس کے لیے غیروں میں بر ڈھونڈنے لگیں۔ جو بھی رشتہ دیکھنے آتے' ان کی غربت اور گھر کی خستہ حالی' جگہ جگہ سے اکھڑے پلستر' سیلن زدہ دیواروں' بوسیدہ لکڑی کے دروازوں میں سو سو نقص نکالتے۔

سعدیہ کے پرزور اصرار پہ حمیداں نے شادی کے لیے جمع کی گئی رقم سے گھر کی مرمت کروالی۔ اب گھر میں کہیں نقص نہیں رہ گیا تھا۔ بہتر رشتے کے لیے گھر کا بھی بہتر حالت میں ہونا ضروری تھا۔ پھر نئے سرے سے کمیٹی ڈالی گئی' پیسے جمع ہوئے۔ لوگ آنے جانے لگے۔ اب نیا اعتراض اٹھایا گیا۔

لڑکی کا باپ معذور' دو چھوٹے بہن بھائی' بڑا بھائی آوارہ گرد اور لڑکی گھر کی واحد کفیل' اگر اس کی بھی شادی ہو گئی تو باقی سارے بھوکوں مریں گے۔ آوارہ اور بے روزگار لڑکے کی بہن کے رشتے پہ اعتراض' لڑکی کیا خاک گھر بسائے گی جب دھیان ہر وقت میکے میں اٹکا رہے گا۔ نظر رکھنے والے چھان چھان کے اعتراضات نکالتے۔

کچھ رشتے اس کی نوکری اور تنخواہ کی لالچ میں بھی آتے۔ ایسے لوگوں کو وہ خود انکار کر دیتی۔ حمیداں نے بڑی دقتوں سے باسط کو ڈھونڈا اور سو منت و سماجت کر کے کام کے لیے راضی کیا۔ باسط کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ کسی کے ماتحت نوکری نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اسے کریانے کی دکان ڈال کر دی جائے۔ اس بار بھی سعدیہ نے رسک لے لیا' اماں کے انکار کو پس پشت ڈال کر' جہیز کے جوڑے پیسوں سے باسط کو کریانے کی دکان ڈلوا دی۔ باسط نے بڑی خوشی خوشی دکان پہ جانا شروع کیا۔ وہ بمشکل ڈیڑھ ماہ انہیں خرچہ دیتا رہا۔ ابھی ان ماں' بیٹی اس کی طرف سے سکھ کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ وہ ... کسی لڑکی کے ساتھ آنکھ

کرنے لگا۔ لڑکی کی ماں آوارہ عورت تھی۔ حمیداں اور اکرم دین نے بیٹے کو پیار سے سمجھایا۔ سعدیہ کا احساس دلایا۔ جس کی خون، پسینے کی کمائی سے وہ دکان کا مالک بنا اینٹھ رہا تھا، مگر باسط کی ایک ہی رٹ رہی کہ لڑکی کے گھر رشتہ لے کر جاؤ۔ اکرم دین جوان بیٹے کی ضد کے آگے تھک ہار گئے، جبکہ حمیداں بھی ڈٹ گئیں۔ سعدیہ سے پہلے وہ باسط کی شادی بالکل نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ پھر ان کی جمع شدہ رقم اس کی دکان میں کھپ گئی تھی۔ اس سوچ کے تحت کہ وہ کمائے گا تو بہن کی شادی دھوم دھام سے ہو جائے گی۔

باسط کی ضد اور حمیداں کا انکار، لڑکی کی ماں کو صرف لڑکے سے غرض تھی۔ اس نے باسط کو ماں، بہنوں کے خلاف الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا کے، ان دونوں کی کورٹ میرج کروا دی۔ اس نے علیحدہ گھر کرائے پہ لے لیا۔

حمیداں بیٹے کا دکھ دل سے لگائے چارپائی کی ہو رہیں۔

وہ رات بھر ماضی کی کٹھن گھڑیوں میں الجھی روتی رہی صبح اس کی آنکھ رابعہ کے دروازہ پیٹنے پہ کھلی تھی۔

وہ بے دلی سے اٹھ بیٹھی۔ سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ آفس سے چھٹی نہیں کی جا سکتی تھی۔ دوپٹا اوڑھ کر پاؤں گھسیٹتے وہ باہر آگئی۔ پورے گھر میں غیر معمولی خاموشی کا راج تھا۔ بلال کی اپنے ناشتے اور کپڑوں کے لیے چیخ چیخ، ابا کی چائے کے لیے آوازیں، پورے گھر میں رابعہ کی دوڑیں۔۔۔ آج ہر سرگرمی مفقود تھی۔

"کہاں گئے سب لوگ؟" باورچی خانے سے ہی برتنوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

"ہوں۔۔۔" انڈا فرائی کرتی رابعہ چونک کر مڑی۔ اس نے بغور بڑی آپی کو دیکھا۔ جس کی آنکھیں رات بھر کی گریہ وزاری سے سرخ، چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس کا دل کٹ سا گیا۔ البتہ لہجہ میں رات کی کسی کی گستاخی کا گلہ ہرگز نہیں پایا جاتا تھا۔ معمول سا انداز تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"وہ تائی۔۔۔ کو رات فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ سب وہیں گئے ہیں۔" وہ پھر سے ناشتا تیار کرنے لگی۔

"اوہ بہت برا ہوا، اللہ پاک انہیں شفا دے۔"

ساری رات وہ جس اذیت سے گزری تھی، اس کے بعد تائی کے لیے یہ رسمی کلمات ہی ادا کیے جا سکتے تھے۔ اسے کوئی خاص ہمدردی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ان کی ذرا سی لالچ نے اس کے چودہ سال رول دیے تھے۔

رابعہ کو ناشتا لانے کا کہہ کر وہ آفس کی تیاری کے لیے مڑ گئی۔



ممانی فاخرہ کے فون نے پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔ وہ اس اتوار کو رابعہ کا باقاعدہ رشتہ لینے آنے والی تھیں۔ ابا کے خوشی سے آنسو نکل پڑے تھے۔ رابعہ کا خوشی سے برا حال تھا۔ ہر کام الٹ پلٹ کرتے، اس سے خوشی چھپائی نہیں جا رہی تھی اور اماں رابعہ کی حرکتوں اور شگفتہ رنگ چہرے کو گھور رہی تھیں۔

سعدیہ ایک لمبے عرصہ بعد دل سے مسکرائی اور مطمئن و سرشار ہوئی تھی۔ رابعہ کی خوشی اسے ہر شے سے زیادہ قیمتی لگ رہی تھی۔

حمیداں نے رات ہی بڑی بہن کا فون سنا تھا۔ انہوں نے سعدیہ کے فون کے متعلق بتا کر انہیں سمجھایا تھا کہ ایک بٹی کی آس میں، دوسری کا اچھا بر نہ گنواؤ۔ غیروں سے تعلق کرنا اور نبھانا آسان نہیں۔

یہ بات حمیداں سے بہتر کون جانتا تھا۔

"سعدیہ! ایک بات مانو گی؟"

وہ دھلے ہوئے کپڑے تہ لگا رہی تھی۔ جب کافی دیر سے غور و خوض کرنے کے بعد حمیداں نے سر اٹھا کر اسے پکارا تھا۔

"جی اماں ضرور!" وہ ماں کے انداز سے ٹھٹکی اور پھر مصروف ہو گئی۔ حمیداں کافی دنوں سے کشمکش و پیچ میں مبتلا تھیں کہ وہ سعدیہ سے اس پہلو پہ بات کریں یا نہ۔ انہیں اپنی بٹی کی فرماں برداری، بہادری اور نرم دلی پہ فخر تھا۔ وہ اسے کسی مخمصے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔

"اپنی تائی کی عیادت کے لیے چلی جا۔" حمیداں روانی سے بول گئیں

قمیص کی تہ لگاتے، اس کے ہاتھ تھم گئے۔ پندرہ برس گزر گئے اسے تائی کے گھر کی دہلیز پار کیے۔ اب بھلا وہ اس عورت کی عیادت کے بہانے کیوں جاتی؟ جس نے اس کے نوخیز خوابوں کو نوچ کر اسے خوشیوں سے محروم کر دیا تھا۔

وہ دوغلی فطرت کی نہیں تھی۔ جب اسے تائی کی بیماری کا سن کر کوئی خاص افسوس ہی نہیں ہوا تھا تو وہ دنیاداری کی خاطر ہی سہی عیادت کا فرض نہیں نبھانا چاہتی تھی۔

وہ حساس دل اور ماں کی لاکھ فرماں بردار، لیکن تائی زبیدہ کے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتی تھی۔

حمیداں نے سب کچھ بھول بھال کر، جٹھانی کی اسپتال میں خدمت کی تھی۔ آٹھ روز ان کے ساتھ اسپتال رہیں۔ اب بھی روز ان کے گھر ضرور جاتیں۔ ان کے چھوٹے موٹے کام، اپنے ہاتھ سے کرتیں۔ انہوں نے سعدیہ کا معاملہ خدا کی رضا اور مرضی پہ چھوڑ دیا تھا۔ اماں کا دل ان کی حالت پہ پسیج گیا تھا جو پندرہ برس سے بیٹے کی جدائی سہہ رہی تھیں۔ پھر تائی زبیدہ نے حمیداں سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ وہ اپنے کیے پہ از حد نادم تھیں۔

وہ بڑی تھیں اور حمیداں کے آگے گڑگڑا رہی تھیں۔ حمیداں نے ان کا بھرم رکھ کر معاف کر دیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے کسی بھی مقام پر، ان کے ساتھ بڑائی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

ہر کوئی اس صلح پہ خوش تھا۔ رابعہ نے اسے بتایا تھا کہ اس کے پیچھے تایا کی چاروں بیٹیاں بھی ان کے گھر کا چکر لگا چکی تھیں۔ خوب تعلق داریاں نبھائی جا رہی تھیں۔ سعدیہ سب دیکھ اور سن رہی تھیں مگر بالکل خاموشی سے۔ اس نے اماں، ابا کو ٹوکا تھا، سوال و جواب اور نہ ہی بحث کی تھی۔ وہ اپنے ہر معاملے میں آزاد اور خود مختار تھے۔

"نہیں اماں!" ایک لمبا توقف کر کے اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

"دیکھ پتر! میں تیری ماں ہوں، تیرے دکھ، سکھ کی شریک رہی ہوں۔ تیری تکلیف کو اپنے دل پہ محسوس کرتی ہوں، لیکن یہ بھی تو سوچ کہ ایک بار وقت کی ڈوری ان کے ہاتھ میں آئی تھی، انہوں نے اس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ہمیں ذلیل و خوار کیا اور اس دفعہ وقت ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم نے ان کا کیا نہیں لوٹانا، ورنہ ہم میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا۔ بدلہ دینے والی ذات رب پاک کی ہے، وہ بھی معاف کر دیتا ہے، پھر ہم انسانوں کی اوقات کیا؟ زبیدہ کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ تیرے لیے رب سے دعا بھی کرتی ہے۔ شاید رب اس بیمار کی عرض سن لے، تیرا نصیب بھی جاگ جائے۔ بس تو اسے معاف کر دے، تیری یہ معافی بہت سے بچھڑے ہوؤں کو ملا دے گی۔ زبیدہ کئی بار تیرا پوچھ چکی ہے، میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ سعدیہ کو تیرے پاس بھیجوں گی، اپنی ماں کی تربیت کا مان رکھ لے۔"

حمیداں اسے سوچ میں گھرا چھوڑ کے، چادر کے پلو سے آنکھیں رگڑتی اٹھ گئیں۔

جب زبیدہ بااختیار تھیں تو انہوں نے انتہائی سفاکی سے سعدیہ کو دھتکار دیا۔ اپنے مرحوم شوہر اور ساس کی لاج بھی نہیں رکھی تھی۔ آج وہ بااختیار تھی۔ فیصلہ کرنے میں خود مختار تھی۔ ماں نے اسے راہ دکھائی تھی۔ کوئی زور زبردستی نہیں تھی۔ وہ بدلہ بھی لے سکتی تھی اور معاف کر کے سرخرو بھی ہو سکتی تھی۔ جہاں اپنی ذات پہ اتنی تکلیفیں جھیلی تھیں ایک اور سہی، کم از کم یہ اطمینان تو رہتا کہ کسی کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ بلال کی موٹر سائیکل کی آواز نے اس کی سوچوں کا ارتکاز توڑا تھا۔

اس روز کے بعد آج اس کا اور بلال کا سامنا ہوا تھا۔ وہ یقیناً "جان بوجھ کر دیر سے گھر لوٹنے لگا تھا تاکہ بہن کا سامنا کرنے سے بچ سکے۔ صبح وہ سعدیہ کے آفس جانے کے بعد ہی کمرے سے نکلتا۔

"السلام علیکم۔" وہ جھجکتا ہوا دوسری چارپائی پہ آ

بیٹھا۔

وہ بڑی بہن کی قربانیوں کا قدر دان تھا۔ اس روز غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ جانے پہ اسے بے حد ندامت تھی۔ وہ یہ سب اماں سے اکیلے میں یا پھر سب کے سامنے دھیمے لہجے میں بھی کہہ سکتا تھا۔

"وعلیکم السلام!" سعدیہ نے خوش دلی سے جواب دیا۔ بلال بالکل خاموشی سے سر جھکا کے بیٹھ گیا۔

وہ بھائی کی ذہنی کیفیت سے آگاہ تھی۔ اس کا جھجکنا اور جھکی نگاہیں اس سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ وہ اس سے ناراض ہو کر گھر کی پہلی خوشی کے اثر کو زائل نہیں کر سکتی تھی۔

"بلال! میں تمہیں ضروری چیزوں کی لسٹ بنا دیتی ہوں، تم چائے پی کر لے آؤ۔ پرسوں مہمان آ رہے ہیں اور چھٹی کے روز تم گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جاتے ہو۔" وہ لہجے میں بشاشت لاتے بڑے دوستانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"کون مہمان آ رہے ہیں؟" وہ دھیمے سے منمنایا۔ سعدیہ کے مثبت رویے نے اس کا سر مزید جھکا دیا تھا۔ اس سے نظریں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

"ماموں اور ممانی ظفر کے لیے رابعہ کا رشتہ مانگنے آ رہے ہیں۔ سب مل بیٹھ کر صلاح و مشورہ کریں گے، لمبے چوڑے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا، بس چٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔"

اس کا معمول کا انداز تھا۔ بلال نے سر اٹھا کر اس کا چہرہ کھوجا۔ کہیں بھی ناراضی یا گلہ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی کہ اپنی اتنی عظیم بہن کا دل دکھانے کا باعث بنا۔ حالانکہ وہ خود اپنے نصیب کی ستائی ہوئی تھی۔

"آپی! پلیز مجھے معاف کر دیں، میں نے آپ سے بہت بدتمیزی کی تھی۔" وہ واقعی بہت شرمندہ تھا۔ اپنی غلطی قبول کرنے میں زیادہ تاخیر نہیں کی تھی۔

سعدیہ کا دل نہال ہو گیا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔ بھائی نے غلطی کی، شرمندہ ہوا اور معافی مانگ لی۔ اگر وہ اپنی غلطی تسلیم نہ بھی کرتا، تب بھی وہ کوئی بازپرس نہ کرتی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ چھوٹی چھوٹی رنجشیں بڑے مسائل کو جنم دیتی ہیں۔

"میں تمہیں ایک شرط پہ معاف کروں گی۔ اگر تم۔۔۔" اس نے رک کر ڈرامائی انداز میں وقفہ دیا تھا۔ بلال سوالیہ انداز میں بہن کو تکنے لگا تھا۔

"اگر تم مجھے اپنے خوابوں کی شہزادی کا نام بتاؤ گے۔" اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اگلوانا چاہا۔ بلال کے غصہ ہونے سے اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں بھی کوئی گنجلک ہے۔

"جی وہ۔۔۔" وہ نظریں چرا گیا۔ دل ہی دل میں بہن کی زیرک نظری کا بھی قائل ہوا۔ سعدیہ اس کے سرخ ہوتے چہرے کو پڑھ چکی تھی۔

"میری ورکشاپ کے استاد کی بیٹی ہے۔" خاصا شرماتے ہوئے بتایا گیا۔

"اوہ۔۔۔ تمہیں کہاں ملی؟"

"میں استاد کے ساتھ گھر جاتا رہتا ہوں۔" وہ نچلا لب کچلنے لگا۔ بڑی بہن کا احترام آڑے آ رہا تھا۔

"ہوں، اس سنڈے رابعہ کی بات پکی ہو گئی تو اگلے سنڈے میں اور امی تمہارے استاد کے گھر بھی چکر لگانے جائیں گے۔ اچھا ہے رابعہ کے ساتھ تم بھی نپٹ جاؤ۔" سعدیہ نے جلدی سے پروگرام ترتیب دے لیا۔

"نہیں آپی! پہلے آپ کی شادی۔۔۔"

"نہیں بلال!" اس نے بلال کو درشتی سے ٹوک دیا۔

"قسمت کا کیا بھروسا، بہتر ہے کہ سب اپنا اپنا حصہ لیتے جاؤ، جب میری باری آئے گی تو مجھے بھی میرا حصہ مل جائے گا۔" اس نے کاتب تقدیر سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ وہ کپڑے اٹھا کر الماری میں رکھنے چل دی۔

برآمدے میں کھڑی رابعہ اور بلال نے دل میں اپنی بہن کے لیے نیک مقدر کی خلوص نیت سے دعا مانگی تھی۔



ماموں، ممانی اور خاندان کے چند اور بڑے آ کے رابعہ کا رشتہ پکا کر گئے۔ منگنی کے بجائے دو ماہ بعد ڈائریکٹ شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ اماں نہال اور رابعہ کھلتا گلاب بن گئی۔ ابا بار بار اپنے آنسو پونچھتے پہلی بار ان کے گھر میں خوشی کے شادیانے بجنے والے تھے۔ سب کو خوش پا کر سعدیہ کے اندر تک سکون سرایت کر گیا۔ اس نے اپنی بہن کو ہجر کے کرب سے بچا لیا تھا۔ دوسری سعدیہ بننے سے بچا لیا تھا۔ اپنی شادی کے لیے بینک میں جمع کی گئی رقم سے رابعہ کی شادی کرنی تھی۔

مہمان شام گئے لوٹے۔ سارے گھر میں پھیلاوا تھا۔ رابعہ سے خوشی کے مارے کوئی سیدھا کام ہو کے نہیں دے رہا تھا۔ سعدیہ نے اس کی بوکھلاہٹوں کا مذاق اڑاتے اسے کام سے چھٹی دے دی۔ سارے گھر کا بکھیڑا سمیٹا اور پائپ لگا کر صحن دھونے لگی۔ سارا گھر صاف ستھرا کر کے وہ آخر میں کچن کی طرف آئی جو برتنوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ دن بھر کی تھکاوٹ کو خود پہ حاوی کیے بغیر مستعدی سے برتن دھونے میں جت گئی۔ برتن دھو کے کچن کی صفائی سے فارغ ہوتے دس بج گئے۔ سب ہی اپنے کمروں میں لیٹ چکے تھے۔ وہ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی، پھر دوپٹا اچھی طرح اوڑھ کر باہر نکل آئی۔ ساتھ والے گھر کا بڑا سا گیٹ کھٹکھٹاتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ گیٹ نازیہ کی بیٹی سعدیہ نے کھولا تھا۔ اسے اپنے دروازے کے باہر کھڑا دیکھ کر وہ اپنی ماں کو آوازیں دیتی اندر گم ہو گئی۔

اس نے تقریباً پندرہ برس کے بعد اس گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ گھر کا اندرونی نقشہ بالکل بدل چکا تھا۔ محسن کی امریکا کی کمائی سے سارا گھر توڑ کر نئے سرے سے تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ عجیب کیفیت میں قدم اٹھا رہی تھی۔

"سعدیہ۔۔۔" نازیہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ دھرا۔ اسے اپنے گھر پا کر وہ اپنی بیٹی کی طرح حیرت زدہ بالکل نہیں ہوئی تھی۔ جیسے اسے ایک روز اس کے آ جانے کا یقین ہو۔ سعدیہ نے دھندلی آنکھوں سے اسے دیکھنا چاہا۔

"میں تائی سے ملنے آئی تھی۔" اس نے آنے کا مقصد بتایا۔ وہ اپنی آنکھوں کی نمی کا پس منظر بیان نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اسے بڑے سے ٹی وی لاؤنج سے گزار کر پچھلی طرف چھوٹی سی راہ داری عبور کر کے کمرے میں لے گئی۔ سعدیہ کا جسم اتنے سالوں بعد تائی کو دیکھنے سے قبل ہی کپکپانے لگا تھا۔ اس کی اپنی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

نازیہ نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ نظریں جھکائے، اس کے نقش قدم پہ چلتی اندر داخل ہو گئی۔ زبیدہ تائی دوائیوں کے زیر اثر سو چکی تھیں۔ وہ بہت کمزور اور بوڑھی ہو گئی تھیں۔

"تائی سو رہی ہیں۔ میں لیٹ ہو گئی۔" سعدیہ نے اطمینان بھرا لمبا سانس خارج کیا۔

"کوئی بات نہیں، تم ہر کام لیٹ ہی کرتی ہو، آؤ میرے ساتھ۔" نازیہ کا لہجہ شفاف تھا، طنزیہ نہ ہی استہزائیہ۔

"اس سعدیہ کو دیکھو! ابھی تک بکس کھولے بیٹھی ہے، ساری شام اس نے کارٹون دیکھے ہیں۔" اس نے لاؤنج کے کارپٹ پہ بیگ کھولے بیٹھی سعدیہ کی طرف اشارہ کیا۔

"تم جانتی ہو، میں نے اس کا نام سعدیہ کیوں رکھا ہے؟" اس نے سعدیہ سے استفسار کیا تھا۔ اس نے بے اختیار نفی میں گردن ہلا دی۔

"محسن کے کہنے پر۔" وہ بہت حوصلے سے مسکراتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔

"چائے پیو گی یا کھانا لگاؤں۔" وہ فریج کھولے پوچھ رہی تھی۔ سعدیہ نے جواب دینے کے بجائے بغور اسے دیکھا۔ آنکھوں کے نیچے پڑتے سیاہ حلقے، قدرے بکھرے لمبے بال، ملگجا سا لباس، زردی مائل رنگت اور بے جان پھیکی سی مسکراہٹ۔ وہ بہت کمزور اور نڈھال دکھائی دے رہی تھی۔ حالانکہ سعدیہ نے اسے ہر حال میں بہت مسکراتے اور زندہ دل پایا تھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ الٹا اس سے

سوال کرنے لگی۔

"ہاں، مجھے بھلا کیا ہو گا؟"

چائے بننے تک ان کے بیچ خاموشی چھائی رہی۔

سعدیہ ناخن سے ٹیبل کی شفاف سطح کھرچتی رہی۔

ایک کپ اس کے آگے رکھ کر وہ اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"خالہ فالج زدہ ہو گئی ہیں۔ ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ میں اکیلی یہ بوجھ اٹھاتے اب تھکنے لگی ہوں، مجھے محسن کی کمی بہت فیل ہو رہی ہے۔" وہ رک گئی تھی۔

سعدیہ نے ہمیشہ اسے بہت نڈر اور پر اعتماد دیکھا تھا۔

آج ایک مرد کی کمی نے اسے کمزور کر دیا تھا۔

"کیا میں نے محسن کو تم سے چھین کر بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ جس کی سزا وہ خود کو اور مجھے دیتا آ رہا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی بیمار ماں کی خاطر بھی لوٹ آنے کو راضی نہیں، وہ بھلا کون ہوتا ہے؟ جزا اور سزا کا فیصلہ کرنے والا۔؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

سعدیہ سر جھکائے، اس کے درد کو اندر تک اترتا محسوس کر رہی تھی۔

"میں خود کو تمہاری محرومیوں کا مجرم سمجھتی ہوں اور ہر نماز کے بعد دعا کرتی ہوں کہ خدا کرے محسن لوٹ آئے تو میں اس کی شادی تم سے کروں گی۔ اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا ہے اور اگر خدانخواستہ اس بیماری کی خالہ، بیٹے کی شکل دیکھے بغیر چل بسیں تو میں خود کو کیسے معاف کروں گی۔ میں پہلے ہی بہت گناہ گار ہوں، تمہاری، محسن کی، اپنی معصوم بیٹی کی اور اب خالہ بھی....."

وہ ٹیبل پہ سر رکھے زار و قطار رونے لگی تھی۔

سعدیہ بالکل گم صم، اس کے حواسوں پہ ابھی تک محسن اور اس کی شادی کے الفاظ چھائے تھے۔ وہ اسے سختی سے منع کرنے کی خود میں سکت نہیں پا رہی تھی، اس لیے اٹھی اور چپ چاپ کچن سے نکل گئی۔ سعدیہ اپنی بکس کے درمیان آڑی ترچھی لیٹی سو گئی تھی۔

وہ ابھی چند قدم آگے بڑھی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی۔ محسن کی بڑی سی تصویر اس کے سامنے تھی۔

اس کے پیر تھم گئے۔ یہ اس کی امریکا کی تصویر تھی۔

وہ بہت جوان اور صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ ہونٹوں پہ ٹھہری مبہم سی مسکراہٹ اور جگر جگر کرتی آنکھیں، ان آنکھوں میں زندگی کی چمک ماند نہیں پڑی تھی۔ وہ دم بخود سی دیکھتی رہ گئی۔

ان آنکھوں میں کبھی اپنی محبت کا عکس دیکھ کر وہ سرشار ہو جایا کرتی تھی اور اب ساکت ہو گئی تھی۔

"سعدیہ پلیز! مجھے میرا محسن لوٹا دو۔ میں اپنی محبت میں شراکت برداشت کر سکتی ہوں، دوری نہیں۔ وہ بے شک تمہارا ہو کر رہے، آنکھوں کے سامنے تو رہے۔ مجھے اپنی محبت میں حاصل اور حصول کا حساب کتاب نہیں رکھنا، مجھے اپنی انا کو بھی بیچ میں نہیں لانا، کیونکہ..... کیونکہ میں صرف ایک بیوی ہی نہیں، ایک ماں بھی ہوں۔ آج محسن اور خالہ ہیں، کل کو میری بیٹی بھی، مجھے مورد الزام ٹھہرائے گی۔ پلیز سعدیہ! میری سزا ختم کر دو۔"

وہ سعدیہ کے پیچھے آ کر کھڑی بولتی اور روتی جا رہی تھی۔

اپنی پندرہ سالہ زندگی کی کتنی سیاہ گھنگھور راتیں اس نے تنہا روتے ہی گزاری تھیں۔ وہ نارسائی کے کرب سے آگاہ تھی، ہجر و کرب کا ہر باب اس نے بھی پڑھ رکھا تھا۔

اس نے اور محسن نے کبھی عہد وفا نہیں باندھا تھا، نہ کبھی کھل کے اظہار محبت کیا۔ اگر اس کی شادی ہوئی ہوتی تو وہ یقیناً "اپنے گھر اور شوہر کے ہمراہ خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہوتی۔ محسن کا تصور اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتا۔ اس نے کبھی کسی کو بددعا نہیں دی تھی۔ تائی، محسن اور نہ ہی نازیہ کو۔

کاتب تقدیر کا لکھا سمجھ کر اب تک صبر کرتی چلی آ رہی تھی۔

وہ ہارنے لگی تھی۔ پھرتی سے واپسی کے لیے پلٹی۔ لاؤنج کے دروازے کے پاس جا کر کچھ یاد آنے پر رکی تھی۔

"نازیہ! تائی جان سے کہنا، میں نے انہیں معاف

کردیا۔"

اپنے آنسو چھپانے اور نازیہ کی سسکیوں سے بچنے کے لیے وہ بھاگتی ہوئی گیٹ عبور کر گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلے اتوار سعدیہ اور حمیداں' بلال کے استاد کے گھر پہنچ گئیں۔ بلال نے رکشے والے کو سارا ایڈریس بمعہ نام و پتے کے سمجھا دیا۔ تھوڑی سی خواری کر کے انہیں مطلوبہ گھر مل گیا۔ بلال کا استاد اور بیوی بھی ان کی آمد سے آگاہ تھے۔ بڑی خوش دلی سے ماں' بیٹی کا استقبال کیا گیا۔ ان کا صاف ستھرا گھر اور شائستہ لب و لہجہ' انداز و اطوار' سب کچھ قابل تحسین تھا۔

مونا نامی وہ سانولی سی لڑکی بڑی طرح دار اور خوب صورت سی تھی۔ بڑی خوش اخلاقی اور اعتماد سے ان کے ساتھ باتوں میں مشغول رہی۔

مونا کی ماں نے بھی ہر ممکن تفصیلات ان سے پوچھ لی تھیں۔ وہ انہیں اپنے گھر کھانے کی دعوت دے کر' تین چار گھنٹے گزار کر گھر چلی آئیں۔ واپسی پہ اماں اور سعدیہ بہت مطمئن و مسرور تھیں۔ انہیں بلاشبہ بلال کی پسند پہ کوئی اعتراض نہیں تھا۔

رابعہ کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ ابھی باقاعدہ تاریخ نہیں رکھی گئی تھی۔ اگلے مہینے کی کوئی بھی تاریخ رکھی جا سکتی تھی۔ شادی کی تیاریاں بھی اسی حساب سے ہو رہی تھیں۔ رابعہ خود اماں کے ساتھ جا کر اپنی پسند سے ہر شے کی خریداری کر رہی تھی۔ چھٹی کے روز وہ سعدیہ کو بھی زبردستی گھسیٹ لیتی۔

جب ہر کوئی بہت خوش اور مطمئن تھا۔ مونا کی امی کی فون کال نے ساری خوشیاں ملیامیٹ کر دی۔

"معاف کیجیے گا بہن! ہمیں آپ کے بیٹے کا رشتہ منظور نہیں ہے۔" ان کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

"کوئی وجہ؟" اماں دہل گئیں۔ ان کے بیٹے کی خوشیوں کو گہن لگنے والا تھا۔

"برا مت مانیے گا بہن! آپ کے گھر میں بڑھتی عمر کی بن بیاہی بیٹی ہے۔ جس لڑکی کو خود خوشیاں نہ ملی ہو' وہ دوسروں کو مسکراتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتی۔ والدین اپنی اولاد کے لیے کبھی برا نہیں چاہتے' پھر میں کیسے جانتے بوجھتے اپنی بیٹی کو اذیتوں میں دھکیل دوں۔" وہ توجیہہ پیش کر رہی تھیں اور اماں کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔

رابعہ نے ہمت کر کے بلال کو ساری بات من و عن بتا دی۔ آخر چھپائی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ وہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"اچھا ہوا' جو ان کی پنچ ذہنیت کا پتا چل گیا۔ لوگ اس حد تک بھی گر سکتے ہیں۔ اب اس لڑکی کی خاطر میں بہن کو ہاتھ سے پکڑ کر کسی کے گھر بٹھا کے آنے سے رہا۔ مجھے شادی ہی نہیں کرنی' میں بنوں گا اپنی بہن کا سہارا' جیسے سترہ سال کی عمر میں وہ ہماری محافظ بن گئی تھی۔ اس لڑکی کو لے کر میں سعدیہ آپی سے بغض نہیں پال سکتا۔" وہ رونے لگا تھا۔

سعدیہ چپ چاپ اپنے جوان بھائی کو بہن کے دکھ پہ' یا محبت کے بچھڑنے پہ روتا دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج ماموں' ممانی اور خالہ وغیرہ شادی کی تاریخ طے کرنے آ رہے تھے۔ صبح سے گھر میں بھاگ دوڑ جاری تھی۔ رابعہ گھر انشین ہو گئی تھی۔ بلال سنجیدگی سے اندر' باہر کے تمام کام نبٹاتا جا رہا تھا۔ باسط کے دونوں بچے اور سعدیہ صحن میں کھیلتے پھر رہے تھے۔ بلال' تائی زبیدہ کو بھی وہیل چیئر پہ بٹھا کے لے آیا تھا۔

سعدیہ نے چاروں طرف نظر دوڑائی' تائی کے آجانے سے منظر کتنا مکمل ہو گیا تھا۔ سب سے ہوتی اس کی نگاہ نازیہ اور بلال پہ جا ٹھہری۔ وہ صبح سے ان کے ساتھ کاموں میں مصروف تھی۔

بلال کا سنجیدگی سے بھرپور ہر انداز' وہ بیرونی دنیا سے بالکل کٹ کے رہ گیا تھا۔ کام سے سیدھا گھر آتا اور چپ چاپ لیٹا چھت کو گھورتا رہتا۔ اداس سی نازیہ' جو اپنے غم کو چھپانے کے لیے ہنسی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ ٹھنڈی آہ بھرتے' اس سارے منظر کو اپنے

اندر اتارتے کچن میں پناہ ڈھونڈنے چلی آئی۔ جہاں بہت سے کام اس کے منتظر تھے۔

اس نے رائتہ بنا کر فریج میں رکھا اور سلاد بنانے کے لیے سبزیاں نکال لیں۔ تب ہی موبائل کی بیل گونجی تھی۔ اس نے متلاشی نگاہیں دوڑائیں۔ چولہے کے پاس رکھا نازیہ کا موبائل بج رہا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا لیا۔ اسکرین پہ "محسن کالنگ" چمک رہا تھا۔ وہ تذبذب کے عالم میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی تاکہ نازیہ کو آواز دے سکے لیکن وہ اسے کہیں بھی نظر نہ آئی۔

موبائل صرف چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوا اور پھر سے بیل بجنے لگی۔ اس نے تھوک نگل کے گلا تر کیا۔ خود میں بہت سی ہمت مجتمع کر کے یس کا بٹن دبا دیا۔

"ہیلو۔۔۔" اس نے اپنے ہاتھوں اور آواز کی لرزش پہ قابو پایا۔

"تم۔۔۔ سعدیہ؟" دوسری طرف آواز کی کپکپاہٹ بہت واضح تھی۔ شناسائی کے مراحل طے ہو گئے تھے۔

"جی۔۔۔ محسن۔" اس نے دھیمے سے اس کے شک کو یقین میں بدلا۔ تب ہی کچن میں داخل ہوتی' نازیہ ٹھٹک کر رکی تھی۔ اس کے منہ سے نکلا محسن کا نام سن لیا تھا اس نے۔

"کیسی ہو؟" اس نے لمبی سانس خارج کی تھی۔ جیسے برسوں کی تھکن اتر گئی ہو۔

"آ کر دیکھ لو' کیسی ہوں۔" وہ بہت سوچ سمجھ کر جواب دے رہی تھی۔

"تم پکارو گی' میں لوٹ آؤں گا۔" بات کرتے اس کی سانس خوشی سے پھول رہی تھی۔

"لوٹ آؤ محسن! تمہاری بہنیں' تائی جان' نازیہ اور تمہاری بیٹی منتظر ہیں تمہاری۔" اس نے سب کے نام گنوا دیے تھے۔

"اور تم۔۔۔"

وہ اس ناموں کی فہرست میں اسے ابھی بھی کھوجتا

چاہتا تھا۔

"میری ان سب میں کہاں گنجائش بنتی ہے۔" وہ پھیکا سا مسکرائی تھی۔

"تمہاری گنجائش آج بھی میرے دل میں ہے۔" وہ تیزی سے چیخ پڑا تھا۔

"آئی سوییر محسن! میرے دل میں تمہارے لیے ایسی کوئی گنجائش نہیں ہاں ایک وقت تھا کہ میں تم سے محبت کرتی تھی لیکن تب تمہاری زندگی میں نازیہ اور بیٹی نہیں تھیں۔ اب تمہاری ایک مکمل فیملی ہے۔ میں کوئی غاصب نہیں ہوں کہ دوسری عورت کے حق پہ ڈاکا ڈالوں۔"

وہ کہتی جارہی تھی اور محسن ہکا بکا تھا۔

"غاصب تو یہ سب ہیں' انہوں نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔" اس کی آواز صدمے سے چور تھی۔ اسے سعدیہ سے اتنی تلخی کی امید نہیں تھی۔ اسے گمان تھا کہ وہ اس عمر میں میرے ایک دفعہ پکارنے پہ چلی آئے گی۔

"دھوکا ان سب نے نہیں بلکہ تم نے مجھے دیا ہے۔ کیونکہ تم ایک بزدل اور ڈرپوک شخص ہو۔ میں تم سے محبت کرتی تھی نانی سے نہیں۔ اپنی ماں کو تم نے منانا تھا' میں نے یا نازیہ نے نہیں۔ اب تم اپنی بزدلی کا الزام کسی دوسرے پہ لگا کے سرخرو نہیں ہوسکتے۔ میرے لیے تم اور تمہاری محبت اب معتبر نہیں رہی۔" اس کے لہجے میں نمی تیر گئی تھی۔

وہ سانس لینے کو رکی اور محسن کی اس سفاک سچائی پہ ہی سانس رک گئی تھی۔ اس نے حقیقت کو ہمیشہ جھٹلا کر خود کو بری الذمہ کرلیا تھا۔ حقیقت کو کبھی اس رخ پہ سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"تم سے تو بہادر نازیہ تھی' جو اپنی یکطرفہ' چار دن کی محبت میں جیت گئی۔ اپنے باپ اور تین جوان بھائیوں کے آگے' صرف تمہاری محبت میں ڈٹ گئی۔ اس نے لڑ جھگڑ کر تمہارے لیے ویزا بھی حاصل کیا اور اپنے والد کے انکار پر خودکشی کی کوشش بھی کی مگر تم۔۔۔ تم مرد ہو کر اپنی برسوں پرانی محبت کے لیے کیا کرسکے؟ ایک ماں کو نہ منا سکے' اپنا موازنہ اپنی بیوی سے مت کرو' وہ تم سے لاکھ درجہ بہتر ہے اور میری مجرم تمہاری ماں یا بیوی نہیں بلکہ تم ہو۔ میں تمہاری ماں کی طرح خود غرض نہیں ہوں کہ ایک عورت سے اس کا شوہر چھین لوں اور نہ تمہاری طرح کم ہمت ہوں کہ اپنی تنہا لمبی مسافت سے گھبرا کے تمہیں اپنا ہم سفر چن لوں۔ ابھی صرف پندرہ برس گزرے ہیں۔ مزید پندرہ برس تنہائی کا عذاب کاٹ کر بھی میں تمہاری چاہ نہیں کروں گی۔ کیونکہ مجھے اٹھارہ' انیس برس کی عمر میں تمہاری زیادہ ضرورت تھی۔ چونتیس سال کی عمر میں مجھے تمہاری قطعاً" ضرورت نہیں۔ جتنی جلدی ہوسکے واپس لوٹ آؤ محسن! اپنے گناہوں کی فہرست مزید لمبی مت کرو اپنی ذات پہ اتنا بوجھ مت لادو کہ تم ڈھ جاؤ اور تسلیم کرلو کہ ایک عورت تم سے محبت کی بازی جیت چلی ہے مگر وہ تمہاری واپسی کی راہ تکتی ہے۔ تمہاری بیٹی اپنے باپ کی منتظر ہے۔ یہ نہ ہو محسن! کہ کل کو تم لوٹو تو نہ نازیہ محبت کی شمع روشن کیے تمہاری راہوں میں بیٹھی ہو اور نہ ہی تمہاری بیٹی باپ کی منتظر ٹھہرے پلیز محسن۔۔۔!" وہ ہانپنے لگی تھی۔

اس میں مزید بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ دوسری طرف سناٹا تھا۔ ایک بار بھی اسے ٹوکا' تردید یا تصحیح نہیں کی گئی تھی۔ نازیہ پیچھے کھڑی روتے ہوئے واپس مڑ گئی تھی۔ ایک لمبے توقف کے بعد محسن نے خود میں بولنے کی سکت پیدا کی تھی۔

"مم۔۔۔ مجھے معاف کردو سعدیہ!" وہ ہکلا رہا تھا۔

جب سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا تھا تو اس نے بھی مان لینے میں عار محسوس نہ کی۔ وہ جان گیا تھا کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اب وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ خوش گمان تھا کہ سعدیہ اس کی منتظر ہے۔ آج اس نے خوش فہمی بھی دور کردی۔ اب بھلا اور کیا چارہ تھا کہ بیوی اور بیٹی کے پاس واپس لوٹ آئے۔

"ایک شرط پہ۔۔۔ اگر تم سامنے آکر معافی مانگو گے تو۔۔۔" وہ آنکھ کے کنارے ٹھہرا آنسو انگلی سے جھٹک کر مسکرائی۔

"او کے۔۔۔" وہ بھی گیلا چہرہ خشک کرکے مسکرا دیا تھا۔

سعدیہ اب اسے رابعہ کی شادی کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ جب ان کا گیٹ بڑے زور سے پیٹا گیا تھا۔ دن بھر مہمانوں کی آمد اور گہما گہمی نے انہیں تھکا دیا تھا۔ سب اپنے بستروں پہ لیٹے سو گئے تھے۔ اب اس اچانک طوفانی دستک پہ سب کچی نیندوں سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"میں دیکھتا ہوں' کون ہے؟" سب اپنے کمروں سے برآمدے میں جمع ہوگئے تھے۔ پریشانی سے گیٹ کو تک رہے تھے جو مسلسل کھٹکھٹایا جارہا تھا۔

"کون ہے؟" بلال نے بھاگ کر صحن عبور کیا۔

"میں نازیہ! دروازہ کھولو۔"

"اللہ خیر کرے۔" اماں نے دہل کر دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

نازیہ کی آواز سب نے سن لی تھی۔ سب کے دل میں ایک ہی خدشے نے بیک وقت سر اٹھایا تھا۔ نازیہ روتی ہوئی آئی اور چاچی کے گلے لگ گئی۔ اماں خود بھی کپکپانے لگی تھیں۔ وہ سب سہمے کھڑے تھے۔

"ہائے ہائے! کیا ہوگیا نازیہ؟" اماں نے اسے زبردستی خود سے الگ کیا۔

"محسن اس مہینے کی ستائیس تاریخ کو واپس آرہا ہے۔" وہ خوش خبری سنا کر پھر سے رونے لگی تھی۔ سب کے پریشان چہروں پہ یک لخت مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"یہ بھلا رونے کی بات ہے' جھلی نہ ہو تو۔" اکرم دین نے شفقت سے اس کے سر پہ چپت رسید کی۔

"میں نہ کہتی تھی چاچی کہ تمہاری سعدیہ کے لیے میں ہی بر ڈھونڈوں گی۔ لے آئی ہوں اپنے بھائی کا رشتہ۔ پچھلے سال اس کی بیوی زچگی کے دوران مر گئی تھی۔ سال بھر کا بیٹا ہے۔ دیکھو چاچی! انکار نہ کرنا۔ سعدیہ بالکل میری بہنوں جیسی ہے اور کوئی بہن دوسری بہن کا برا نہیں چاہ سکتی۔" نازیہ نے حمیداں کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"بے شک مجھے تیری نیت پہ کوئی شک نہیں۔" اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"اور ہاں میں نے اپنی اماں سے کہہ دیا ہے کہ ہماری لڑکی جہیز بالکل نہیں لائے گی۔ انہیں اس پہ کوئی اعتراض نہیں۔" وہ ہاتھ نچا نچا کے بڑے مدبرانہ انداز میں بتا رہی تھی۔

"اور ہاں۔۔۔ تم بلال! صبح مجھے اپنے استاد کے گھر کا پتا سمجھا نا دیکھنا! میں چاچی کے ساتھ جا کر ان لوگوں کی طبیعت صاف کرکے آتی ہوں۔" وہ بڑی رعب دار آواز میں بولی۔

بلال نے نازیہ کو شوخی سے آنکھیں دکھائی تھیں۔ نازیہ کے بلال کو زور سے جھانپڑ لگانے پہ سب ہی کھلکھلانے لگے تھے۔

ایک لمبی تاریک رات کے بعد روشن صبح خوشیاں لیے موجود تھی۔

ثریا انجم

مجبوری کا نام

بادل زور سے گرجے، کمرہ لمحہ بھر کو روشن ہوا اور پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔

بارش کی پہلی بوند پڑتے ہی بجلی غائب ہوگئی تھی اور کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی واپسی کی امید کرنا اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینے کے مترادف تھا، کیونکہ بارش مسلسل ہورہی تھی اور ایسی برستی بارش میں بے چارے بجلی کے محکمے والے گھر سے نکل کر اپنی قیمتی جان خطرے میں کیسے ڈال سکتے تھے۔ یو پی ایس کی بیٹری بھی جواب دینے کو تھی۔ لہٰذا ساری ٹیوب لائٹس اور پنکھے بند کرکے صرف لاؤنج میں ایک انرجی سیور جلا کر گھر میں تھوڑی سی روشنی کا اہتمام کیا گیا تھا۔

چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب پر ایک عجیب سی چڑچڑاہٹ سوار تھی۔ دوپہر کے بعد شروع ہونے والی رم جھم سے دلوں میں جو ترنگ جاگی تھی، وہ تھوڑی ہی دیر گزرنے کے بعد بے زاری میں ڈھل چکی تھی۔ بچوں نے پکوڑوں کی فرمائش کی تھی جو اس نے فوراً ہی یہ کہہ کر رد کردی کہ گھر میں بیسن نہیں ہے، اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو بس یہ سوچ سوچ کر پریشان ہورہی تھی کہ ایسی بارش میں عدیل بائیک پر کیسے گھر واپس آئیں گے۔

تھوڑی دیر دونوں بچے منہ پھلا کر بیٹھے رہے، پھر نبیل نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔ "امی! میں بارش میں نہانے جاؤں؟"

"ہاں! جاؤ نہاؤ اور رات تک بخار چڑھا لینا، پھر کل اسکول کا ناغہ اور پڑھائی کا نقصان۔۔۔" وہ جھنجلائی۔

"امی تو بڑی دور تک سوچ لیتی ہیں۔" کومل جو نبیل سے دو سال بڑی تھی، دھیرے سے بولی۔ تابندہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

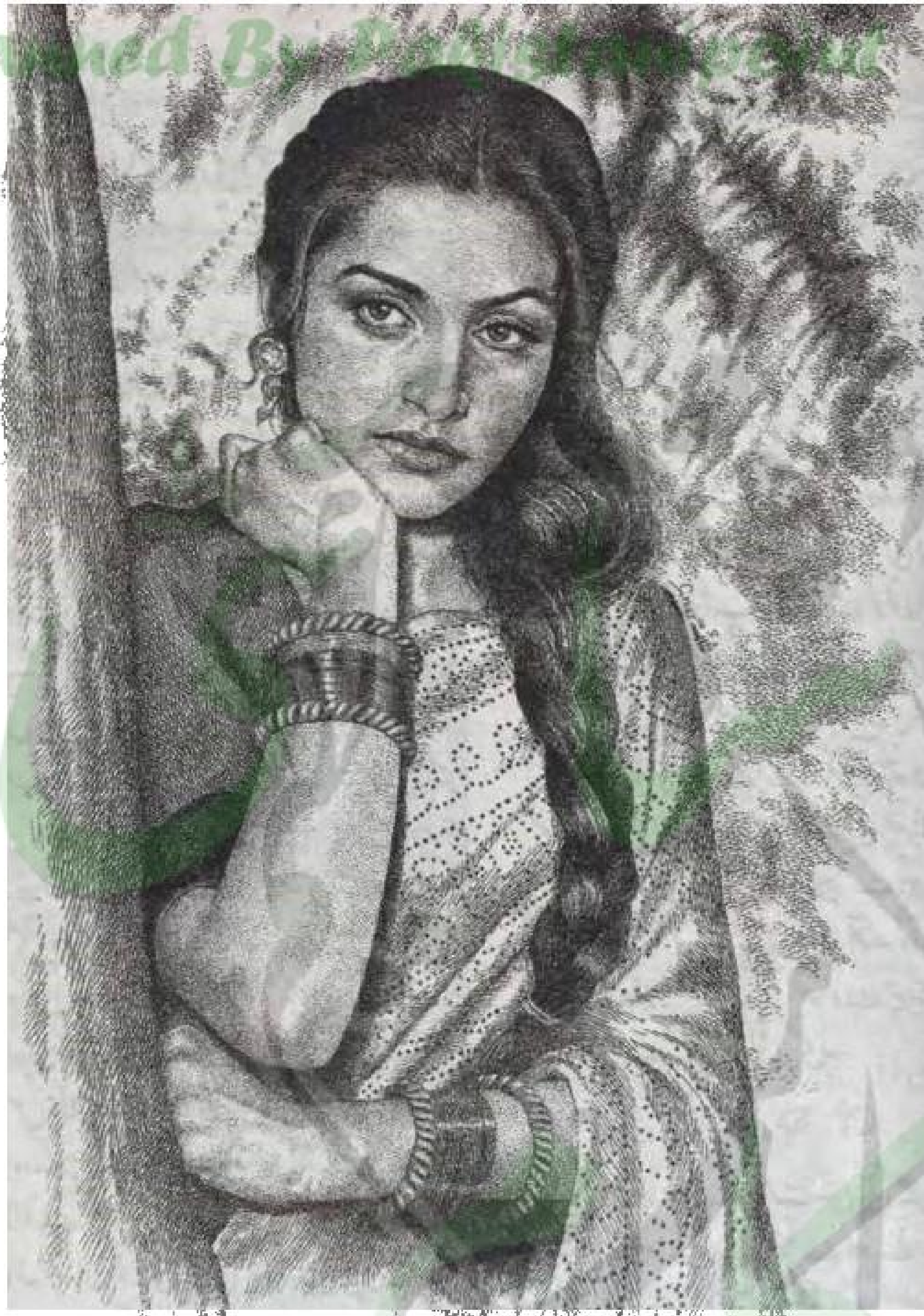
"زیادہ بڑی بڑی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ جاؤ جا کر اسکول کا ہوم ورک کرو، لائٹ تو اب آنے والی نہیں۔ یو پی ایس کا بھی کچھ بھروسا نہیں، دن رہتے جو کام ہوجائے اچھا ہے۔"

"امی پلیز، دن رہتے میرے یونیفارم کی شرٹ سی دیں۔" نبیل آہستہ سے بولا۔

"کیوں تمہاری شرٹ کو کیا ہوا؟"

"وہ امی ولید نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو میری شرٹ اس کے ہاتھ میں آگئی تو ذرا سی پھٹ گئی۔" نبیل نے ڈرتے ڈرتے شرٹ پھٹنے کی وجہ بتائی، مگر تابندہ کا پارہ ہائی ہوچکا تھا۔

"تم دونوں کو تو مجھے پریشان کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے۔ پتا ہے کہ بجلی نہیں آرہی تو مشین کیسے چلے گی اور ہاتھ سے ٹانکے بھرے تو کل پھر پھاڑ کے لے آؤ گے۔" تابندہ کی آواز بلند ہونے لگی تو دونوں بچوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کر اندر چلے گئے۔ تابندہ نے ایک گہری سانس لی۔ آج کل وہ یوں ہی ذرا ذرا سی بات پر خود پر سے اختیار کھو دیتی تھی اور بعد میں گھنٹوں کڑھتی



رہتی تھی۔

گھر میں آہستہ آہستہ سیلن کا احساس بڑھتا جارہا تھا۔ قریبی کچرا کنڈی سے اٹھنے والی بدبو ناگواری کی حد تک بڑھ چکی تھی۔

"پتا نہیں کہاں ہوں گے۔" نہ جانے کتنی بار وہ دل ہی دل میں یہ جملہ دہرا چکی تھی۔

عدیل کا گھر سے آفس تک کا فاصلہ بہت زیادہ تھا اور بارش کے دنوں میں راستے میں کئی جگہوں پر ایک ایک فٹ پانی جمع ہوجاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا دل وسوسوں میں گھرتا جارہا تھا۔

"یا اللہ عدیل خیر خیریت سے گھر واپس آئیں۔" ایک بار پھر اس نے صدق دل سے دعا مانگی اور نبیل کے یونیفارم کی شرٹ اٹھائی جو وہ چپکے سے اس کے قریب رکھ گیا تھا۔ شرٹ کی سائیڈ کی سلائی کھینچا تانی میں کافی ساری کھل گئی تھی اور وہ اگلے دن اسکول پہن کر جانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے شرٹ واپس رکھ دی۔ دونوں بچوں کے لیے نیا یونیفارم لیتے وقت اس نے پکا ارادہ کیا تھا کہ اگلے ماہ وہ ایک یونیفارم اور خرید لے گی، تاکہ ایک ہی یونیفارم ہونے کی وجہ سے جو پریشانی ہوتی ہے، وہ ختم

ہوجائے، مگر اب کئی مہینے گزر جانے کے باوجود وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہی تھی۔ عدیل تو مہینے کے آغاز میں اپنی ساری تنخواہ اس کی ہتھیلی پر رکھ کر ہر فکر سے آزاد ہوجاتے تھے اور وہ پورے مہینے سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے کے چکر میں ہلکان ہوتی رہتی تھی، ماں سے ملنے والی تربیت اور عدیل کے لیے دل میں بسی بے تحاشا محبت اسے کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر لانے سے روکے رکھتی۔ مگر ایک مسلسل جنگ لڑتے لڑتے اب اسے اپنا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

اس وقت بھی جب آس پاس سے بچوں اور بڑوں کی خوشی سے سرشار آوازیں اور برسات کے پکوان کی خوشبوئیں ہوا کے دوش پر سفر کرتی اس کی سماعتوں اور قوت شامہ سے ٹکرا رہی تھیں تو اسے اپنے دل میں اس خیال سے سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں کہ وہ اپنے بچوں کی پکوڑوں جیسی معمولی چیز کی فرمائش بھی پوری نہ کرسکی۔ کیا تھا اگر وہ نبیل کو بھیج کر محلے کی دکان سے بیسن منگوا لیتی، بچوں کے اترے ہوئے چہروں کا سوچ کر دل کو ایک گہرے ملال نے جکڑ لیا اور اس ملال کے ساتھ ہی ان گنت ادھوری خواہشوں کے چہرے بھوتوں کی طرح اسے اپنے آس پاس منڈلاتے محسوس ہونے لگے۔ کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ انسان کو کسی چھوٹی سی بات پر اپنی زندگی کی ساری محرومیاں یاد آنے لگتی ہیں اور وہ خود ترسی کا شکار ہوجاتا ہے، بالکل ایسی ہی حالت اس وقت تابندہ کی بھی تھی، مگر کبھی ہلکی اور کبھی تیز ہوتی بارش اور لحہ لحہ بڑھتی ہوئی تاریکی نے جلد ہی اسے اس کیفیت سے نکال لیا اور وہ نئے سرے سے اس فکر میں مبتلا ہوگئی کہ عدیل کسی مشکل میں نہ پڑ گئے ہوں۔

اس نے گیٹ کا لاک تو بہت پہلے ہی کھول دیا تھا، تاکہ عدیل کو گھر پہنچ کر دروازہ کھلنے کا انتظار نہ کرنا پڑے اور خود مسلسل دعاؤں کا ورد کرتے ہوئے اس کی خیریت سے واپسی کی منتظر تھی۔

گیٹ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور عدیل موٹر بائیک دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوا، وہ پوری طرح بارش میں بھیگ چکا تھا۔ بائیک کو ایک جھٹکے سے اسٹینڈ پر کھڑا کرکے وہ اندر کی جانب بڑھا، اس کے بالوں اور کپڑوں سے مسلسل پانی ٹپک رہا تھا اور چہرے پر تھکن اور بے زاری کے آثار تھے۔ شاید راستے میں بائیک بند ہوگئی تھی اور وہ اسے بہت دور سے گھسیٹ کر لایا تھا۔

"بڑی دیر کردی۔" تابندہ نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"پکنک منا رہا تھا۔" عدیل نے اس قدر جھنجلائے ہوئے انداز میں جواب دیا کہ تابندہ کو فوراً ہی اپنی بات کے بے تکے پن کا احساس ہوگیا اور وہ مزید کچھ بولے بنا کچن کی طرف بڑھ گئی۔

چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر وہ کچھ دیر کے لیے گم صم سی ہوگئی۔ یہ نہیں کہ عدیل صرف اسی وقت راستے کی تھکن اور بارش کی وجہ سے ہونے والی اذیت کی وجہ سے اس لہجے میں بولا تھا۔ وہ اکثر ایسے ہی اکھڑے انداز میں بات کرتا تھا اور وہ حیرت اور صدمے سے اس کا منہ تکتی رہ جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

یوں تو وہ سارے راستے ہی پانی میں بھیگتا ہوا آیا تھا۔ مگر شاور کے نیچے کھڑے ہونے سے وہ ساری کوفت جو برستی بارش میں بائیک کو گھسیٹ کر گھر تک لانے میں ہوئی تھی، پانی کے ساتھ بہہ گئی اور جب وہ خشک کپڑے پہن کر واش روم سے باہر نکلا تو اس کا موڈ کافی حد تک خوش گوار ہوچکا تھا۔ مگر یہ کیفیت بس تھوڑی ہی دیر کے لیے تھی جیسے ہی تابندہ ٹرے میں بسکٹ اور گرم بھاپ اڑاتی چائے لیے اس کے سامنے آئی تو اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات ایک بار پھر ناگواری میں بدل گئے۔ ملگجے کپڑے، کیچر سے نکل کر چہرے پر جھولتی بالوں کی لٹیں اور پورے وجود سے برستی تھکن جیسے ساری دنیا کا بوجھ اسی نے اٹھا رکھا ہو، اس میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہ تھی جو عدیل کے لیے کسی خوش گوار تاثر کا باعث بن سکے۔

عدیل کو تو وہ کبھی بھی پسند نہیں تھی، اس کی نظروں میں تو نوجوانی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی صدف سما گئی تھی۔

بالکل اپنے نام کی طرح سیپ سے نکلے موتی جیسا اچھوتا حسن اور کھلتے پھولوں جیسی شوخی وہ چھوٹے چچا کی بیٹی تھی جن سے اماں کا نہ جانے کس بات پر اختلاف تھا کہ وہ سوائے کسی خاص مجبوری کے ان کے گھر جانا بھی پسند نہیں کرتی تھیں اور یہ بات تو عدیل کے علم میں ہی نہ تھی کہ اگر چھوٹے چچا سے ان کا اختلاف نہ بھی ہوتا تب بھی انہیں اپنی یتیم بھانجی سے اس قدر محبت تھی کہ وہ بہو کے روپ میں کسی اور کی طرف دیکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں، کیونکہ ان کے خیال میں وہ انتہائی سلیقہ مند اور محبت کرنے والی تھی اور جس کے کسی کے بھی گھر بہو بن کر جانے سے اس گھر میں ایسا اجالا ہوجاتا تھا جیسے چاند، سورج بے وقت اس گھر میں اتر آئے ہوں۔

اول تو اسے اماں کے ارادوں کا پتا ہی نہیں تھا۔ دوسرے وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو پہلے تو آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر خود اپنا ہی عاشق ہوگیا تھا اور پھر اپنے لیے ایک ایسے شریک زندگی کا تمنائی بن گیا تھا جو اس کے مقابل آکر کسی طور بھی اس سے کم نہ لگے اور اس تلاش میں اسے کہیں دور جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑی، کیونکہ اس کے ددھیال میں سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک حسین شکلیں تھیں اور صدف تو سگے چچا کی بیٹی تھی۔ لہٰذا وہ بڑے اطمینان سے اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے لگا، مگر اسے کیا پتا تھا کہ ایک دن یہ سارے رنگ کچھ اس طرح سے گڈمڈ ہوں گے کہ زندگی کے کینوس پر بس ایک مٹیالا رنگ باقی رہ جائے گا۔

خالہ کو بھی اسی دن بیمار ہونا تھا جب وہ بینک میں جاب ملنے کی خوش خبری کے ساتھ اماں سے صدف کا تذکرہ کرنے کا ارادہ لے گھر میں داخل ہوا تھا اور اماں

گھبراہٹ کے عالم میں گھر سے نکلنے کو تیار تھیں۔

خالہ کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور ان کا یہ ہارٹ اٹیک عدیل کے دل کے سارے ارمان ایک ہی حملے میں ملیامیٹ کر گیا۔

اماں جو یوں بھی بھانجی پر دل و جان سے فدا تھیں اور اسے اپنی بہو بنانے کا ارادہ کیے بیٹھی تھیں۔ اس کمزور لمحے میں خالہ جان سے وعدہ کر آئیں کہ انہیں تابندہ کی طرف سے پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ اسے عدیل کی دلہن بنا کر ساری زندگی کا تحفظ دینے کو تیار ہیں۔ عدیل نے سنا تو حیرت سے ان کا منہ تکتا رہ گیا اور جب بمشکل اپنے آپ کو سنبھالنے کے بعد اس نے صدف کا نام لیا تو اماں ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

"دنیا کی ساری لڑکیاں ختم ہو جائیں اور ایک نصیر احمد کی لڑکی باقی بچے تو میں تمہاری شادی کا ارمان دل میں لیے اس دنیا سے چلی جاؤں گی، مگر وہ لڑکی بہو بن کر میرے گھر کی دہلیز پار کرے، یہ نہیں ہونے دوں گی۔"

عدیل نے لاکھ سر پٹخا، صدف کی خوبیاں گنوائیں اور آخر میں ہار کر بس اتنا ہی کہا۔ "اماں! صدف میری خوشی ہے۔"

تو وہ بڑی بے نیازی سے پان پر کتھے کی تہ لگاتے ہوئے بولیں۔ "اور تابندہ میری خوشی ہے، اب تم خود فیصلہ کر لو کہ تمہیں کس کی خوشی زیادہ عزیز ہے۔"

عدیل کے سارے خواب تہس نہس ہو گئے، مگر اماں خوش ہو گئیں۔

اس خوف سے کہ بیٹا کہیں بغاوت پر نہ اتر آئے، اماں نے جھٹ پٹ شادی کی تاریخ رکھ لی۔ خالہ کے پاس تو بیوگی اور بیماری کا بہانہ تھا۔ لہٰذا چند ہی ہفتوں بعد تابندہ خالی ہاتھ جھلالی چہیتی بھانجی سے اور بھی زیادہ چہیتی بہو بن کر ان کے گھر آ گئی اور آتے کے ساتھ ہی گھر کے کونے کونے میں ایسے رچ بس گئی جیسے ہمیشہ سے اسی گھر کا حصہ رہی ہو۔

وہ بس نام کی ہی تابندہ تھی، بچپن کی یتیمی اور غربت نے اسے بجھا سا دیا تھا۔ حالانکہ شکل و صورت اتنی بری بھی نہیں تھی۔ لمبا قد، سانچے میں ڈھلا سراپا، مگر جن نظروں میں صدف جیسا مکمل حسن سمایا ہوا تھا انہیں تابندہ پر کہاں ٹھہرنا تھا۔ عدیل کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ اسے نہ زندگی میں آگے بڑھنے کی جستجو رہی، نہ کچھ نیا حاصل کرنے کی آرزو۔ پہلے کومل اور پھر نبیل کی آمد پر اس نے نہ کسی خاص خوشی کا اظہار کیا اور نہ خالہ اور اماں کے آگے پیچھے دنیا سے چلے جانے پر زیادہ دنوں تک سوگ منایا۔

☼ ☼ ☼

قیمہ مٹر، ارہر کی دال، کھلے کھلے چاول اور گرم گرم روٹیاں اس نے بڑے چاؤ سے دسترخوان لگایا تھا۔

وہ ہر کام انتہائی شوق اور توجہ سے کرتی تھی۔ اسی لیے گھر کا ہر ہر گوشہ اس کی سلیقہ مندی کا مظہر تھا۔ وہ گھر جو اس کے آنے سے پہلے خاصی بے ترتیبی کا شکار رہتا تھا، اسی گھر کے ہر حصے کو اس نے کچھ اس طرح سے سنوار دیا تھا کہ اپنے پرائے سب ہی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے اور صرف گھر ہی نہیں اس نے اپنے دونوں بچوں کی تربیت میں بھی کوئی کمی نہیں آنے دی تھی۔

جب تک اماں زندہ رہیں، ہر سانس میں بہو کے گن گاتی رہیں اور ان کی بیماری کے دوران جس طرح اس نے ان کی خدمت کی، وہ ملنے جلنے والوں کے لیے حیرت کا باعث بن گئی، کیونکہ اس وقت کومل اور نبیل دونوں ہی بہت چھوٹے تھے اور اتنے چھوٹے بچوں کے ساتھ گھر کی ساری ذمہ داری اور کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ساس کی بھرپور تیمارداری کرنا کچھ ایسا آسان کام نہ تھا۔ اس نے جی بھر کے اماں کی دعائیں اور لوگوں کی تعریفیں سمیٹیں، مگر جس ایک ستائشی جملے... ایک ممنون نظر کا اسے انتظار رہا، وہ آج پندرہ برس گزر جانے پر بھی اس کے نصیب میں نہ تھی۔

اس نے اماں سے کئی بار سنا تھا کہ عدیل کو قیمہ مٹر اور ارہر کی دال چاولوں کے ساتھ بہت پسند ہے۔ اسی لیے اس نے کئی بار نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا کہ شاید اس کے کسی انداز سے یہ ظاہر ہو جائے کہ اسے کھانا پسند آیا ہے، مگر وہ ہمیشہ کی طرح بغیر کچھ کہے کھانا ختم کر کے اٹھ گیا اور وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

"امی! آج کھانا بہت مزے کا بنا ہے۔" کومل جوں جوں بڑی ہو رہی تھی، اس کی مزاج آشنا ہوتی جا رہی تھی، اس لیے اس کے چہرے پر پھیلی مایوسی اس سے برداشت نہ ہو سکی اور تابندہ کا موڈ بدلنے کے لیے اس نے خوش گوار لہجے میں کھانے کی تعریف کی، تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر معدوم ہو گئی۔

"شاید آپ پاپا کی تعریف کا انتظار کر رہی تھیں۔" کومل اس کی خاموشی توڑنا چاہ رہی تھی۔

"تم نے کی یا تمہارے پاپا نے، بات تو ایک ہی ہے نا۔" اسے بولنا پڑا۔

"شاید ایسے ہی موقع پر کہتے ہیں، مجبوری کا نام شکریہ۔" کومل شرارت سے مسکرائی۔

"کیسی مجبوری؟ زیادہ باتیں نہ کرو، چلو یہ برتن سمیٹو۔" تیزی سے کہتے ہوئے وہ رخ موڑ کر بچی ہوئی روٹی دسترخوان میں لپیٹنے لگی اور کومل کی مسکراہٹ رنجیدگی میں ڈھل گئی۔

☼ ☼ ☼

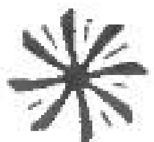
بادل زور سے گرجے، بجلی کی چمک سے کمرہ لمحے بھر کو روشن ہوا اور پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔

بارش کی وجہ سے ہلکی سی خنکی ہو گئی تھی۔ تابندہ پیروں کی طرف رکھا کھیس اپنے اوپر ڈالنے کے لیے اٹھی تو اس کی نظریں دوسری طرف کروٹ لیے گہری نیند سوتے ہوئے عدیل پر ٹھہر سی گئیں۔ اندھیرے کے باوجود وہ اس کے لمبے قد والے مضبوط سراپے کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ وہ سراپا جو برسوں پہلے اس کے دل کے نہاں خانوں میں اس طرح سمایا تھا کہ وہ پور پور اس کی محبت میں ڈوب گئی تھی اور یہ تو اسے شادی کے چند دنوں بعد ہی پتا چل گیا تھا کہ عدیل نے اس سے شادی محض اماں کے مجبور کرنے پر کی تھی۔ ورنہ وہ تو اپنے چچا کی بیٹی صدف کو پسند کرتا تھا۔ تابندہ کے ساتھ اس کا رویہ پہلے دن جیسا سرد اور جذبوں سے عاری ہی رہا اور وہ خود جو اس کی تمام تر لاتعلقی کے باوجود اس پر پروانہ وار نثار تھی تو یہ اس کی مجبوری تھی، گویا وہ دونوں ہی اپنے طور پر مجبور تھے۔

اس نے کھیس کندھوں تک اوڑھ کر آنکھیں موند لیں۔ باہر بارش یکساں رفتار سے ہو رہی تھی۔

"تو کومل! میری جان! تم نے ٹھیک ہی کہا، مجبوری کا بھی نام ہوتا ہے۔" بند آنکھوں میں کومل کا چہرہ سامنے لا کر وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوئی۔ "مگر ہماری مجبوری کا نام محبت ہے... وہ محبت جو تمہارے پاپا کو پہلے اپنی ماں سے اور اب اپنی اولاد سے ہے، وہی محبت جو مجھے تمہارے پاپا سے ہے اور تمہیں اور نبیل کو ہم دونوں سے ہے۔ محبت کے اس حصار میں رہتے ہوئے ہم کتنے عذابوں سے بچے ہوئے ہیں، کیونکہ محبت دکھ تو دیتی ہے، مگر ہمیں سنبھالے بھی رکھتی ہے، ہماری بہت سی خواہشیں ادھوری رہ جاتی ہیں، مگر ہم ادھورے نہیں ہوتے۔ خواہشوں کے پیچھے بھاگنے والوں کے لیے رشتہ توڑنا کچھ مشکل نہیں ہوتا، مگر ایک رشتہ ٹوٹنے سے کتنے لوگ بکھر جاتے ہیں، اس کا احساس تو رشتہ ٹوٹنے کے بعد ہی ہوتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ مجبوری کا ہی سہی، تمہارے پاپا یہ رشتہ ہمیشہ نبھائیں گے، کیونکہ وہ محبت کرتے ہیں اور میں بھی۔"

ایک مطمئن مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔



وجیہہ احمد

ستارے کا ولی

"مے آئی کال یو؟" (کیا میں آپ کو کال کر سکتا ہوں۔)

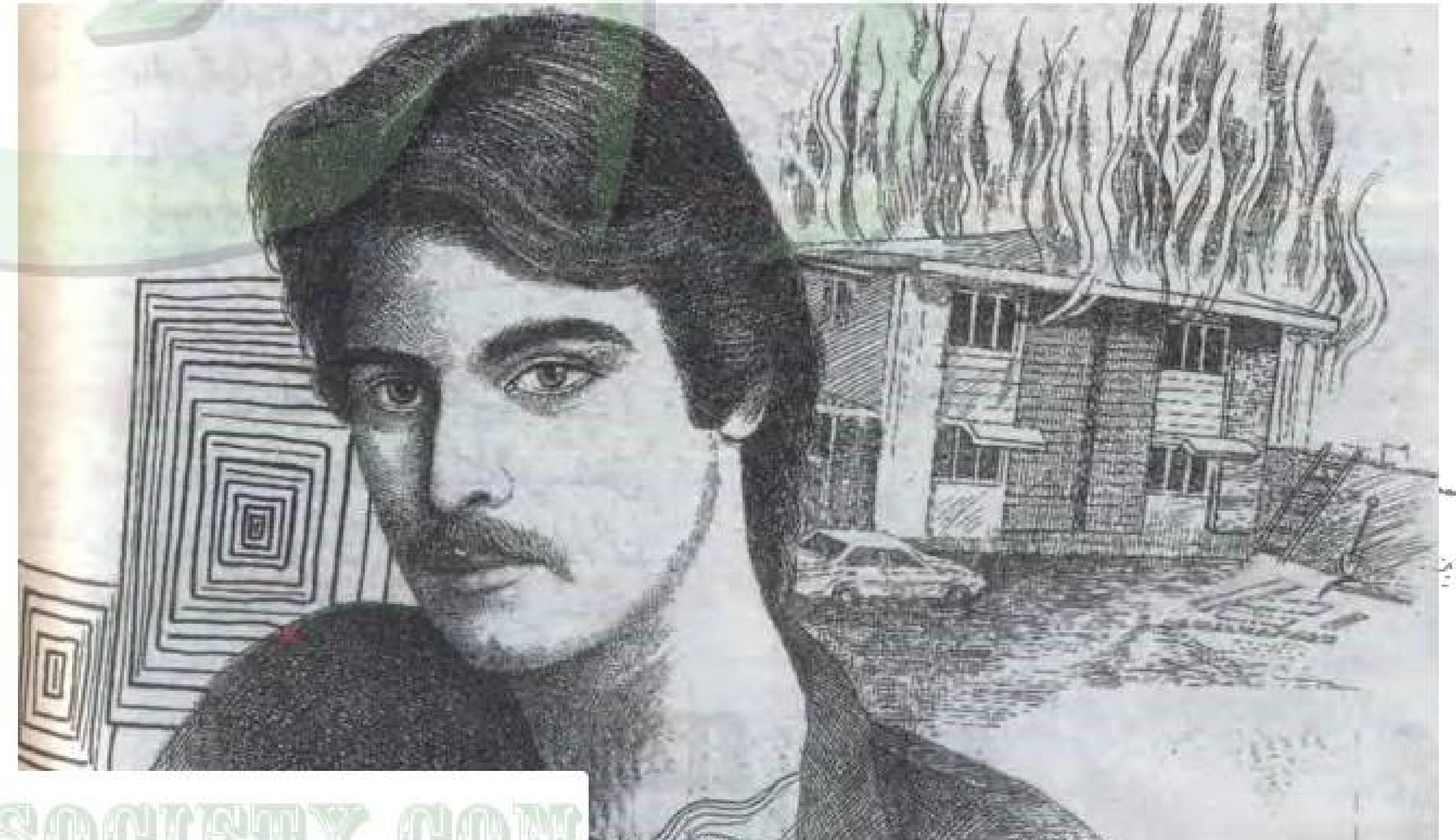
اس کی انگلیوں نے تیزی سے ٹائپ کیا پھر مختلف بٹن دبانے کے بعد میسج سینڈ کر دیا۔ شرارت سے اس کی گہری براؤن آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مخالف کے تپے تپے چہرے کا گھر بیٹھے مزے لے رہا تھا۔ اس کے سامنے ٹی وی پر جیو گرافک چینل لگا ہوا تھا۔ نظریں اسکرین پر چلنے والے جانداروں پر تھیں اور ذہن اٹکا تھا بیلی پر!

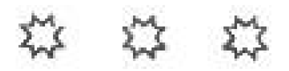
چند منٹ بعد جواب آچکا تھا۔ میسج کھولتے ہوئے اس کے لبوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اسکرین پر نظر آنے والے چند جملے اسے مزید مسکرانے کی دعوت دے رہے تھے۔

"فار واٹ؟"

"تمہاری خیریت کے لیے پاگل!" اس نے جواب میں لکھا۔ اب ان کی لڑائی رومن رسم الخط میں شروع ہونے والی تھی۔ دونوں طرف شکوہ جواب شکوہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اسے منا لے گا اور وہ بھی جانتی تھی کہ وہ مان جائے گی۔ حسبِ سابق، حسبِ معمول، حسبِ دستور۔

ناولٹ





"جس دن سے تمہیں پنک کلر میں ملبوس دیکھا، یہ رنگ میری زندگی بن گیا بیلی، میری صبح گلابی، میری شام گلابی، مجھے اس رنگ سے عشق ہے، یہ رنگ میری زندگی کے تمام رنگوں پر بھاری ہے۔"

وہ درخت پر نظریں جمائے بیٹھی تھی جہاں دو چڑیاں کسی راز و نیاز میں مگن تھیں، ہوا بڑی دلفریب تھی۔ آم کے درخت پر بور آرہا تھا۔ موسم انتہا کا دلفریب تھا، اتنا کہ ساری دلفریبی ہینڈز فری سے نکلتی آواز میں مدغم ہو رہی تھی۔ وہ حد سے زیادہ گم تھی، اس کی آواز میں، وہ بولتا تھا تو اس کی ساری حسیات کان بن جاتی تھیں۔ یہ آواز دنیا کی سب آوازوں سے کہیں زیادہ دل ربا اور خوب صورت تھی۔ وہ خاموش تھی، اتنا کہ ولی کو ٹوکنا پڑا۔

"سن رہی ہو نا تم۔"

"ہوں۔" کہہ کر اس نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"اب ملو گی تو یہی کلر زیب تن کرنا۔"

"اچھا نا پاگل!" وہ اسی کیفیت میں تھی، اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ولی۔۔۔" ولی کا جواب دینے کا انداز مستی لیے ہوئے تھا۔

"جی، جی، جی۔"

"ٹھیک سے سنو پاگل!" وہ کچھ چڑ سی گئی تھی، برہم ہو کر بولی تو وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"آئی ایم سیریس ناؤ۔"

"ولی! میری فرمائش یاد ہے نا تمہیں؟" وہ خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولی تو ولی نے بے ساختہ کہا۔

"امرود کے درخت کے پتے، خالی پرفیوم کی شیشیاں، ناکارہ پین۔ اف میری بیلی کی فرمائشیں۔" ایک دلفریب مسکراہٹ نے بیلی کے نرم ہونٹوں کو چھوا تھا۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"سب پتا ہے تمہیں، پھر بھی پوری نہیں کرتے۔" بیلی کی بات پر وہ لمحے کو چپ ہوا پھر کچھ سوچتا گویا ہوا تھا۔

"عجیب فرمائشیں ہیں نا تمہاری۔ امرود کے پتوں کا کیا کرو گی پاگل؟ اور ناکارہ پین کس کام آئیں گے؟ خالی شیشیوں کا کیا کرنا ہے تمہیں؟ آج بتا ہی دو مجھے۔"

بیلی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "چھوٹی عقل ہے نا تمہاری، تم نہیں سمجھو گے۔ یہ چیزیں ہماری محبت کا سرمایہ ہیں۔ میں عمر بھر دل سے لگا کر رکھوں گی، وہ پتے اس درخت کے ہوں گے، جن کے نیچے اٹھتے بیٹھتے تم نے عمر کا ایک حصہ بتایا ہوگا، کئی گرم راتوں میں تم اس پیڑ کے نیچے سوئے ہو گے۔ ان میں تمہاری سانسوں کی مہک بسی ہوگی، ولی! تم نے کئی بار مجھے سوچا ہوگا، تم نے کئی بار دھیرے سے میرا نام بھی لیا ہوگا۔ پیڑ کا پھل اتارتے ان پتوں نے تمہارے لمس کو محسوس کیا ہوگا۔ یہ پتے معمولی کیونکر ہوئے۔" ولی نے بیچ میں ٹوکا۔

"اچھا پاگل! ناکارہ پین اور خالی پرفیوم کی شیشیاں۔۔۔ ان کا کیا کرو گی؟"

"یہ چیزیں بھی تو میرے ولی کے لمس سے فیض یاب ہوئی ہوں گی نا۔"

وہ بیلی کی منطق پر لاجواب سا ہو گیا اور اسے یہ چیزیں دینے کی حامی بھر لی۔ آم کے درخت پر اب ایک چڑیا تھی۔ اداس اور تنہا۔



ولی اس کی زندگی میں اچانک آگیا تھا۔ دل پہ بٹھائے گئے لاکھ پہروں کے باوجود، ایسے اچانک جیسے دھوپ اگلتے سورج کو یکایک بادل ڈھانک لیں۔ سورج لاکھ بھنچے چلائے، پر بادلوں نے برس کے ہی جانا ہو۔

محلے کی لڑکی روبینہ کی بارات آئی تھی حیدر آباد سے، ولی اس بارات میں آیا تھا۔ دولہا کا کزن تھا۔ اس کی دلفریبی بھی عروج پر تھی۔ پنک لباس اور پنک اسٹون کے آویزے، لائٹ سی پنک لپ اسٹک وہ ولی کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی۔ ولی نے گھنٹے بھر میں اس تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ دلچسپی لے رہا ہے، پر یہ پتا نہیں تھا کہ حیدر آباد جاتے ہی رابطہ بھی کر لے گا۔ یہ مرحلہ اس نے دولہا کی مدد سے بخوبی طے کر لیا۔

ولیمہ تین دن بعد تھا۔ بارات کے دوسرے دن سے اسے ایک انجان نمبر سے میسج آنے لگے تھے۔ بیلی نے کئی بار پوچھا بھی کہ "کون ہیں آپ؟" پر جواب ندارد، وہ بس فارورڈ میسج بھیج رہا تھا۔ اسے حیدر آباد دیکھنے کا بے حد شوق تھا اور یہ شوق تب پورا ہوتا جب وہ ولیمہ میں جاتی۔ اس کی دلی مراد بر آئی، روبینہ کے گھر سے ولیمہ کا بلاوا بھی آگیا۔ اس نے خوشی خوشی ولیمہ میں جانے کی تیاری شروع کر دی۔



وہ کپڑے استری کر رہی تھی، جب میسج ٹون نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اسی نامعلوم نمبر سے میسج تھا۔ اس نے کھولا، لکھا تھا۔

"مجھے امید ہے، آج آپ ضرور آئیں گی۔" ایک شاک تھا جو اسے لگا تھا۔ اس نے جواب میں پوچھا تھا۔

"کہاں؟" چند لمحوں بعد جواب آچکا تھا۔

"حیدر آباد۔۔۔"

وہ چلتی ہوئی کھڑکی تک آئی تھی۔ ایک ہاتھ سے کھڑکی کے پٹ کھولتے دوسرے ہاتھ سے ٹیکسٹ ٹائپ کر رہی تھی۔ ہوا کا جھونکا آیا، اس کے تراشیدہ بالوں کی لٹیں کندھوں کو جھولتی آگے پیچھے جھولنے لگیں۔ تازگی کا احساس اس کی رگ رگ میں سرائیت کر چکا تھا۔

"آپ بتا کیوں نہیں دیتے کہ آپ ہیں کون؟" اس نے لکھا تھا۔ ولی کے چہرے پر مزا لینے کا اتار چڑھاؤ آ جا رہا تھا، اس نے جواب دیا۔

"بتا دیں گے، آپ رونق افروز ہو جائیں۔" اک عجیب سا تجسس اس کی رگ و جاں میں گردش کرنے لگا تھا۔ "پلیز! آپ بتا دیں ورنہ میں نہیں آؤں گی۔"

ولی ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"ارے، ارے! ایسا غضب مت ڈھایئے۔ بندہ گن گن کے دن گزار رہا ہے۔"

"میں آرہی ہوں۔ آپ کون ہیں؟" اس کے استفسار پر اسے بتانا ہی پڑا تھا۔

"ولید انصار۔"

"میرا نمبر کہاں سے لیا؟" اس نے پوچھا۔ ولی بے ساختہ ہنستے ہوئے ٹائپ کر رہا تھا۔

"تاڑنے والے قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں۔ باقی باتیں آپ کے آنے تک موقوف کر رہا ہوں۔ تم اپنا خیال رکھیے گا۔"

وہ خیالوں میں گم کپڑے استری کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، ہوا کے دلفریب جھونکے اس کے چہرے کو چھو کر جا رہے تھے۔ ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا۔۔۔ دروازہ کھلا۔۔۔ اور تیز آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ اس کی توجہ کا ارتکاز ڈانواں ڈول ہو کر پھر کپڑوں میں آن اٹکا۔

☆ ☆ ☆

سفید لباس میں وہ ایک پری دکھائی دے رہی تھی۔ موتیوں کی نفیس جیولری پہنی تھی، پر میک اپ نہیں کیا تھا۔ راستہ طویل تھا۔ ولید کے میسجز آرہے تھے۔ وہ کوسٹر میں تھی۔ ولی کو دیکھنے کا فطری تجسس بھی تھا۔ ولی نے اسے ٹیکسٹ کرکے پوچھا۔

"کہاں ہیں آپ؟"

"حیدر آباد میں داخل ہوا چاہتے ہیں۔" اس نے بتایا تو ولی نے ایک مشورہ دیا۔

"جہاں جہاں سے گزریں جگہیں بتاتی جائیں۔ میں اندازہ کرلوں گا کہ آپ کہاں ہیں۔"

وہ وقفے وقفے سے راستے میں نظر آنے والی جگہیں بتاتی رہی، کبھی کوسٹر کسی ہوٹل کے پاس رکتی، کبھی کسی سائن بورڈ کے پاس سے گزرتی۔ لال اینٹوں سے بنے قدیم گھروں کا شہر، جسے دیکھنے کی خواہش مند تھی، آج وہ سانس لے رہی تھی ان فضاؤں میں۔۔۔ ولی نے ایک بار پھر پوچھا تھا۔

"اب کہاں ہیں آپ۔" تو اس نے بتایا۔

"اکچوئلی مجھے رستوں کا نہیں پتا۔ میں فرسٹ ٹائم آرہی ہوں حیدر آباد۔ جہاں ہم ہیں، وہ عذرا کلینک کی ذیلی گلی ہے اور ایک سیاسی جماعت کے لیڈر کی بڑی سی تصویر آویزاں ہے۔"

"اوہ! پھر تو آپ پہنچنے والے ہیں۔ آپ کی کوسٹر وائٹ اینڈ بلو تو نہیں؟" ولی نے پوچھا تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ولی نے اسے بتایا کہ وہ اس سڑک کے اختتام پر کھڑا کوسٹر کو دیکھ رہا ہے۔ سڑک کے موڑ پر گاڑی رک چکی تھی۔ گلی کے کارنر والے گھر میں انہیں ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ولی نے اسے بتایا کہ وہ گاڑی کے بائیں طرف کھڑا ہے۔ اس نے ولی سے ڈریسنگ پوچھی تو ولی نے اسے بتایا کہ وہ گرے کلر کے ڈریس میں ہے۔ اس نے اسے ایک ہی نگاہ میں پہچان لیا۔ وہی لڑکا تھا جو بارات میں اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے ولی کی جانب ہاتھ ہلایا۔ ولی کے چہرے پر ایک جان دار مسکراہٹ آگئی۔

☆ ☆ ☆

وہ اسٹیج کے سائیڈ میں کھڑی دیوار میں نصب بڑے سے آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھی، وہ چلا آیا۔

"السلام علیکم!" ولی نے آکر سلام کیا تھا۔ یہ پہلی باقاعدہ بات چیت تھی جو ان کے درمیان روبرو ہو رہی تھی۔ بیلی نے کیچر بالوں میں لگاتے ہوئے جواب دیا تھا، دونوں کے درمیان کچھ جھجک سی تھی، ولی نے بات بڑھائی، تاکہ جھجک کچھ سمٹے۔

"آپ کو برا تو نہیں لگا یہ سب جو بھی ہوا؟" بیلی نے مسکرا کے جواب دیا۔

"ہوں۔۔۔ سوچوں گی کہ برا لگا یا نہیں۔" پھر دونوں بے اختیار مسکرا اٹھے۔

"کیا ہم کسی بہتر جگہ بیٹھ سکتے ہیں؟" ولی نے کوئی مناسب جگہ تلاشتے ہوئے اس سے استفسار کیا تو وہ سر ہلاتی ایک سمت میں رکھی ہوئی خالی کرسیوں کی طرف چل دی۔ وہ اس کی ہمراہی میں چلتا ہوا کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔ ولی نے اس کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مے آئی آسک یور نیم؟" (کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔) ولی کی بھرپور توجہ اس کی جانب مبذول تھی۔ وہ پاؤں پر پاؤں جمائے بیٹھی اپنی سینڈل کو حرکت دیتی اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"جہاں سے نمبر لیا تھا تو نام بھی وہیں سے پوچھ لینا تھا نا۔" وہ بظاہر مسکراتے گویا ہوئی تھی، مگر لہجے میں چھپے دلکش طنز کو ولی نے محسوس کرلیا تھا۔ ولی خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"جانتا ہوں، پر آپ سے سننے کا مزہ ہی کچھ اور ہوگا نا!"

"آپ نے بتایا نہیں آپ نے نمبر کہاں سے لیا۔" اس نے سوال کیا تو ولی کچھ گڑبڑا گیا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"مس سارا ظفر! میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

اس نے چونک کر ولی کی طرف نگاہ اٹھائی۔ ولی نے بالکل ٹھیک نام سے پکارا تھا اسے۔

"میں نے آپ کا نمبر فہیم بھائی کی وائف سے لیا تھا۔ آمنہ کو آپ جانتی ہوں گی، فہیم بھائی کی بہن ہیں۔ میں نے آمنہ کے سامنے آپ کی شناخت کرائی تھی بھابھی سے۔ بھابھی نے آپ کا نام سارا ظفر بتایا تھا۔ بھابھی کو باتوں میں لگا کر میں نے ان کے موبائل سے آپ کا نمبر لے لیا۔ آپ مجھے بے حد اچھی لگی تھیں۔ اتنی کہ پہلی نگاہ میں دل میں اتر گئی تھیں۔ میں اسٹریٹ فارورڈ بندہ ہوں، بات کو گھما پھرا کر نہیں کروں گا۔" چند لمحے توقف کے بعد پھر گویا ہوا تھا۔

"مجھ سے دوستی کریں گی آپ؟"

"ہمارے معاشرے میں لڑکوں سے دوستی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا میں آپ سے دوستی نہ کرسکتی ہوں اور نہ نبھا سکتی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں مگر یہ پاگل دل نہیں مانتا میرے دل نے آپ کو دوست مان لیا ہے آپ کی مرضی ہے دوست سمجھیں یا نہ سمجھیں۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو ولی یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

ولی جا چکا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔ روش پر چلتا ولی آنکھوں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ولی کی پشت پر تھیں۔

انتہا کا حبس تھا، گھٹن، بے بسی۔

"کاش! آکاش پر بکھرے بادل برس پڑیں۔" اس نے دل میں دعا مانگی۔ کچھ دعائیں کتنی جلدی مستجاب ہوجاتی ہیں نا۔ دل سے ہونٹوں تک بھی نہیں پہنچ پاتی اور قبول ہوجاتی ہیں۔

اور بعض دفعہ۔۔۔۔۔

21 جولائی کی گرم رات تھی۔ بادل امڈ امڈ کر سارے حیدر آباد پر چھا چکے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ ہلکی ہلکی بوندیں اس کے چہرے پر جذب ہونے لگیں۔ افراتفری میں ولیمے کا اختتام ہوا۔ وہ اسے دوبارہ دکھائی نہیں دیا۔ رات گئے جب بارش ہلکی ہوئی تو وہ لوگ کوسٹر میں سوار ہو رہے تھے۔ اس نے ولی کو دیوار سے لگے بارش میں بھیگتے دیکھا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے کوسٹر کو تک رہا تھا۔ وہ چپ چاپ کوسٹر میں سوار ہوگئی۔

"الوداع اے شہر! شرط وفائے زندگی میں تمہاری فضاؤں میں سانس لینے آؤں گی۔"

کوسٹر کراچی کی طرف رواں ہو چکی تھی۔

لال بتی پر گہری رات اترنے لگی، فضا میں بارش کی کرشماتی مہک رچ بس رہی تھی۔ وہ جانی پہچانی سی مہک جو دلوں کو آباد کرتی ہے۔ وصل پر زور دیتی ہے۔ دور جا کے بسنے والوں کو صدائے بے نام دیتی ہے۔

انتہا کا شور تھا۔ آوازیں تھیں یا سماعتوں میں پھٹنے والے بم، صورتیں تھیں بھیانک تھیں اور ڈراؤنے خواب جیسی تھیں، نگاہوں میں بھوکے شیروں جیسی چمک تھی۔ ہر کوئی داؤ میں تھا کہ شکار میں کروں، ہر کوئی اسے کھا جانے کی حسرت میں تھا اور رات تھی کہ اتنی تاریک کہ سب کے چہرے گڈمڈ ہوئے جاتے تھے۔ زندگی کیا ہے؟ سعی لاحاصل ہے۔ دشت میں جلتے پیروں ابھرنے والے آبلے کی مانند تکلیف دیتی ہے۔ پر چلنا تو پڑتا ہے نا۔ سفر جو تمام کرنا ہوتا ہے۔ دکھوں سے بھری زندگی میں اسے کسی چھاؤں کی تلاش تھی۔ کسی گھنیرے درخت کے نیچے پسارنے کی۔

☆ ☆ ☆

کراچی آنے کے بعد وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ الجھن میں پھنسی تھی، کیا ہوتا جو وہ مجھے کبھی ملا نہ ہوتا۔ زندگی گزر ہی تو رہی ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ہر کمرے میں کوئی روزن ہو۔ پھر اس نے ولی کو نظر انداز کرنے کی بہت کوشش کی۔ پر بے سود۔ اسے وہ اچھا لگا تھا۔ ساحلوں کی ہوا کے جیسا نمکین، پرکشش سا۔

"کیا ہی اچھا ہوتا جو سنگ سنگ چلتے۔" وہ اپنے دل کو سمجھا نہیں پا رہی تھی کہ سیل روشن ہوا۔ لائٹ نہیں تھی تاریکی تھی۔ اس نے اوپن کا بٹن دبایا۔ اسی کا میسج تھا۔

"میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ یس اور نو؟"

وہ ٹائپ نہیں کرنا چاہ رہی تھی' پر اس کی انگلیاں یس (ہاں) ٹائپ کرچکی تھیں۔ اس کے کمرے میں دیا جل چکا تھا۔ آنکھیں جو تاریکی میں دیکھنے کی عادی تھیں' اس روشنی کو قبول نہیں کرپا رہی تھیں۔ آخر یہ اندھیرا کب تک روشنی سے لڑتا؟ کبھی تو اس نے جانا ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

"ولید انصار! اگر میں آپ کو ولی کہوں تو کیسا رہے گا؟" اس نے ولی کو ٹیکسٹ کیا تو جواب لمحوں میں حاضر تھا۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ جو چاہیں کہہ سکتی ہیں آپ۔ ولی ڈفر' ولی ایڈیٹ وغیرہ۔" اس کے ہونٹوں کو تبسم نے چھوا تھا۔

پھر ولید انصار اس کے لیے ولی بن گیا۔

پوری کائنات ولی بن گئی۔

ولی نے یہ اجازت دینے کے بعد اس سے بھی ایک اجازت طلب کی تھی۔ "May i call you belle" (کیا میں تمہیں بیلی کہہ سکتا ہوں۔)

اس نے کہا کہ "پہلے بیلی کا مطلب بتاؤ۔" تو ولی نے کہا۔

"پاگل لڑکی! ڈکشنری میں ڈھونڈو نا۔"

"تم بتاؤ ولی! ابھی اور اسی وقت۔" اس کے جارحانہ انداز پر ولی مسکرا کر لکھ رہا تھا۔

"اچھا بابا! بتاتا ہوں' لڑو مت۔" اس کے ٹیکسٹ کے ساتھ ایک کیوٹ اسمائلنگ فیس بھی تھا۔ ولی نے اسے بتایا۔

" Belle (بیلی) مجھے یہ نام انتہا سے زیادہ پسند ہے۔ انگلش کا ورڈ ہے۔ جس کے معنی ایک خوب صورت عورت اور صنف نازک کی تازگی اور لچک کو بیان کرنے کے لیے استعمال میں آتے ہیں۔ آج سے تم بیلی ہو میری۔۔۔ بیلی۔۔۔ ولی کی بیلی۔"

اسے ولی کا یہ ٹیکسٹ انتہا سے زیادہ اچھا لگا تھا۔ اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔

وہ دونوں بہت مسرور تھے۔ یہ ان کی ابتدا میں ہونے والی بات چیت تھی۔ دونوں کو سامع کی ضرورت تھی۔ ایک بولتا' ایک سنتا رہتا۔ چیٹ کے علاوہ کال پر بھی بات ہونے لگی۔ تخاطب بھی تبدیل ہوگیا۔ آپ' تم میں سمٹ آیا۔ بیلی کے تخیل کی پرواز حیدر آباد تک پہنچ جاتی۔ بیلی عمر میں ولی سے بڑی تھی۔ اس نے ابتدا میں ہی ولی کو بتا دیا تھا۔ ولی کے نزدیک اس چیز کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بیلی بھی اس چیز کو نظر انداز کرچکی تھی۔

عمروں کے فرق سے کیا ہوتا ہے؟ بات تو انڈر اسٹینڈنگ کی ہوتی ہے' دلوں کے ملاپ کی۔ جسموں کا ملاپ تو کچھ بھی نہیں۔

ولی نے اپنے متعلق بہت کچھ بتایا تھا۔ پر سب کچھ نہیں۔۔۔ کچھ باتیں اسے دکھ دیتی تھیں۔ اور وہ اپنے دکھوں میں بیلی کو شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر ایک سچ کو دونوں نے مان لیا تھا۔ وہ نہیں رہ سکتا تھا بیلی کے بنا اور نہ بیلی رہ سکتی تھی ولی کے بنا۔

☼ ☼ ☼

"یار! کوئی بات ہے ایسی جو تم چھپاتی ہو' کوئی راز۔۔۔ کوئی اسرار سا ہے تم میں۔" ولی کی بات پر بیلی کا دل ڈوب کے ابھرا تھا۔ اس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے پوچھا۔

"مثلاً"؟" ولی کچھ چپ سا ہوگیا' پھر بولا۔

"کچھ نہیں! تم سناؤ' کیا کیا سارا دن؟"

بیلی نے مختصراً" تفصیل بتادی' جو کچھ بھی دن بھر کیا۔ ولی نے قصداً" بات گھمادی تھی۔ ورنہ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اداسی گھر کیے ہوئے ہے بیلی میں۔

☼ ☼ ☼

اس ڈراؤنے خواب سے باہر نکل جانا چاہتا تھا وہ۔ آہستہ قدموں سے چلتا وہ گھر کا بیرونی حصہ عبور کر آیا۔ چاند کی سولھویں رات تھی۔ فضا میں گوبر اور جنگلی پودوں کی باس تھی۔ چاندنی نے اس سبز وادی کو رات کے اس پہر اپنی آغوش میں بسا رکھا تھا۔ اذیتوں کے اس گھرے سمندر سے نکلنا تھا۔ پگڈنڈی سے ہوتا اک رستہ پختہ سڑک تک جارہا تھا۔ اس کے شعور نے اسے اک راہ دکھائی۔ اس کی نگاہیں حد نگاہ تک سڑک پر تھیں۔

☼ ☼ ☼

صبح سے شام ہوگئی تھی۔ ولی نے ایک بھی ٹیکسٹ کا جواب نہیں دیا تھا۔ نہ جانے کہاں مصروف تھا۔ بیلی کا غصہ انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

"سمجھتا کیا ہے خود کو' اب ذرا کرے کال' مزا چکھاؤں گی۔ ایک بھی میسج کا جواب نہیں دوں گی۔ سو دفعہ سوری کے میسج کرے گا تو سوچوں گی۔" وہ اندر ہی اندر ادھیڑبن میں لگی تھی۔ رات گئے تک وہ بار بار سیل چیک کرتی رہی۔ پر وہ موجود نہیں تھا۔ دل میں عجب خیالات بھی آرہے تھے۔ وہ ناراضی کے باوجود دل ہی دل میں اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

"یا اللہ! میرا ولی جہاں کہیں بھی ہو' اسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔"

رات کٹی' دن نکلا' وہ مجبور ہو کر اسے خود پکار رہی تھی۔ مختصراً" ٹیکسٹ ٹائپ کیا۔ کال بھی کی' پر ریسیو نہیں کی گئی تھی۔

"ولی۔۔۔"

ولی اپنے حواسوں میں آچکا تھا۔ کچھ لمحے پیشتر ہی جاگا تھا۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا' وہ شعلوں میں گھری بیٹھی ہوگی۔

"یار! کچھ پرابلمز ہوگئی تھیں گھر میں۔ میں بہت شرمندہ ہوں تمہیں بتا نہیں سکا۔ سیل فون گھر پہ رہ گیا تھا۔ رات گئے گھر آیا تھا۔"

"تم کسی اور کے سیل سے ایک میسج کرکے بتا بھی سکتے تھے۔ میری حالت کا اندازہ ہے تمہیں؟ ولید انصار! میں تم سے سخت خفا ہوں۔" وہ غصے میں سے اس کے پورے نام سے مخاطب کرتی تھی۔ وہ کافی کھسیانا ہوچکا تھا۔

"اچھا نا! سوری۔۔۔ یار معاف کردو' غلطی ہوگئی۔"

"سو میسج کروگے سوری کے' تب مانوں گی۔"

ولی کو پتا تھا' اسے اب یہی کرنا ہے۔ بیلی کا ان باکس اس کے "سوری" کے میسج سے بھر چکا تھا۔ بے ضرر سی لڑائیوں کے عادی تھے۔ روٹھنے اور منانے کا انداز سب سے جدا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بیلی۔۔۔" رات گئے ولی نے پکارا تھا۔

بیلی ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی تھی۔ موبائل کی اسکرین روشن تھی۔ بیلی نے ولی کو میسج کیا۔

"کیا ہوا پاگل؟"

"تمہاری یاد آگئی تھی پاگل ٹو۔۔۔" جواب حاضر تھا۔ بیلی نے چڑ کر کہا۔

"چین سے سونے بھی دیا کرو۔" ولی مسکراتے ہوئے لکھ رہا تھا۔

"ایک بات کہوں بیلی؟"

"ہوں۔۔۔" ہنوز کھویا کھویا سا انداز۔

"آئی لو یو۔" ولی کا ٹیکسٹ پڑھ کر ایک عکس کی شبیہ بنی تھی' وہ بولی۔

"کیوں لفظوں کو ضائع کرتے ہو۔ جب ہم جانتے ہیں کہ ایک دوسرے کو ایسے چاہتے ہیں جیسے پھول اور خوشبو! جیسے سیپ اور موتی۔ ہم الگ کیونکر ہوسکتے ہیں' جب یہ ملن روحوں کا ملن ہے ولی! تم مجھے ملو یا نہ ملو' تم خوشبو کی طرح مہکوگے میرے من کے آنگن میں۔"

"اے۔۔۔ اے۔۔۔ مس! میڈم۔۔۔ سارا ظفر! یہ نہ ملنے کی بات کیا کی تم نے' ہاں۔۔۔ خاموش' آئندہ ایسی بات مت کرنا' یار ویسے تم باتیں بہت اچھی کرتی ہو' ہم ایسی باتیں کر کیسے لیتی ہو؟" ولی نے بڑی لگاوٹ سے دریافت کیا تو وہ بولی۔

"جیسے سب کرتے ہیں۔" ولی انتہا سے زیادہ خوش تھا۔ اسے بیلی کا اظہار محبت بہت اچھا لگا تھا۔ وہ خوش

تھا' بہت خوش' پر رات بہت گہری تھی۔ خاموش اور پراسرار۔۔۔

☼ ☼ ☼

تین نفوس پر مشتمل افراد تھے۔ ان کے سانس بھاگنے سے پھولے جاتے تھے۔ جان کیسی پیاری چیز ہے۔ مرد کھائی دینے والا شخص ننگے پاؤں تھا۔ عورتوں کے پیروں میں بھی بوسیدہ سی ہوائی چپلیں تھیں۔ دھان کی ان کٹی فصلوں سے گزرتے ہوئے ٹھنڈ ان کی ہڈیوں کو چیرے دیتی تھی۔ دسمبر کی سرد ترین رات تھی' بائیسویں رات کا زرد' بجھا بجھا سا چاند تھا۔ پگڈنڈی سے پختہ سڑک کا سفر شروع ہوچکا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے کنارے کچے رستے میں درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے الجھتے بھاگ رہے تھے۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھیں۔ ان کے دلوں کو کسی نے مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔ لاری اڈہ بہت دور تھا اور گاڑی کا ملنا ناممکنات میں سے تھا۔ قریبی ایک اسٹیشن تھا۔ رات کے پچھلے پہر ایک ٹرین گزرتی تھی۔ ان کا رواں رواں کان بنا ہوا تھا کہ تعاقب میں کوئی ہے؟ گہری رات اور گہرا گواہ تھا کہ وہ جان توڑ کوشش کررہے تھے۔

اندھیری رات میں تنہا مسافر۔۔۔

☼ ☼ ☼

بیلی نے ولی کو شروع میں ہی بتادیا تھا کہ وہ اسے کچھ بہت اہم بتانا چاہتی ہے۔ ولی نے اس سے بہت پوچھا پر وہ ابھی قصداً" اسے بتانا نہیں چاہتی تھی۔ ولی کو ہر دو تین دن بعد دورہ پڑتا اور وہ اصرار کرتا' پر وہ بات ٹال دیتی۔ ان کی دوستی کو گیارہ ماہ ہوگئے تھے۔ بظاہر دوری تھی۔ مگر وہ ہر بات بن کہے سمجھ لیتے تھے۔ آج ولی نے سوچا تھا' ہر قیمت پر پوچھ کررہے گا۔

"بیلی! پلیز یار بتادو نا کتنے دنوں سے پوچھ رہا ہوں۔"

"میں نے کہا تو تھا' جب بتانا ہوا تو خود ہی بتادوں گی' پھر یہ ضد کیسی۔"

"ابھی بتانے میں کیا حرج ہے؟" اس کے لہجے میں اشتیاق تھا یا اصرار' بیلی کو عجب سی الجھن ہورہی تھی۔

"بیلی! بتارہی ہو یا نہیں' یس اور نو؟"

"نو۔۔۔"

"ایز یو وش! اپنا بہت خیال رکھنا' ٹیک کیئر۔" اس کا مطلب تھا کہ وہ اب میسجز نہیں کریں گے۔ بیلی سمجھی کہ وہ وقتی غصہ دکھا رہا ہے۔ غصہ اترے گا تو خود ہی رابطہ کرلے گا۔

مگر دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینہ میں بدل گئے۔ وہ اس کے کسی بھی میسج کا جواب نہیں دے رہا تھا اور نہ ہی کال اٹینڈ کررہا تھا۔ ولی کے رویے پر بیلی کا دل بہت ٹوٹا تھا۔ اسے لگا جدائی دل کے رستوں پر کھوج لگاتی پھررہی ہے۔ جدا ہونے کا وقت آگیا تھا۔

وہ پاگل تھی' بہت پاگل۔

رستے ایک ہوئے ہی کب تھے۔

وہ ولی کے لیے آخری ٹیکسٹ ٹائپ کررہی تھی۔ دل کی بستی میں تیرگی تھی۔ اداسی تھی۔ شوریدگی تھی۔ ماتم تھا' سسکیاں تھیں اور عذابوں کا دکھ تھا جو چھوڑ کے جانے والوں کے بعد پیاروں کے دلوں میں ہوتا ہے۔

"تم بہت انا پرست ہو ولی! حد سے زیادہ۔ میں بھی رستے کی دھول کی طرح بے اماں نہیں' ولید انصار! تم ایک سنگدل انسان ہو' نہ جانے اتنی ضدی کیوں ہو۔ کہیں کا غصہ کہیں نکالتے ہو۔ کیسے ولی ہو تم؟ ذرا بھی رحم تمہاری فطرت میں نہیں' تمہیں جواب دیتے شرم آتی ہے تو میرے الفاظ بھی یتیم نہیں جو تمہارے دست شفقت کے طلب گار ہوں۔ ولی! خوش رہو' بائے فار ایور ولید انصار۔۔۔"

ولی کے ذہن میں ایک لفظ کی تکرار ہوتی رہی۔

"یتیم' یتیم' یتیم۔"

ٹیکسٹ ختم ہوگیا تھا۔ پر کہانی اب شروع ہوئی تھی۔ وہ صرف ضد میں آکر اسے نظر انداز کررہا تھا۔ اب اس نے پردوں میں چھپے غم کو بیلی پر آشکار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

☼ ☼ ☼

وہ لوگ چار میل پیدل بھاگے تھے۔ اسٹیشن پر دو گھنٹے چھپے رہے۔ ٹھٹھرتے رہے' پھر ایک لوکل ٹرین سے آدھا سفر طے کیا۔ دوسری ٹرین پکڑی۔ اب وہ منزل مقصود کی طرف گامزن تھے۔ ٹرین بھی تیز رفتاری سے چلی جاتی تھی' ان کے چہرے غم کی دھول سے اٹے پڑے تھے اور جسم تھکن سے چور تھے۔ اب وہ لال اینٹوں سے بنے قدیم گھر میں تھے۔ آنسو تھے کہ تھمتے نہیں تھے۔ عورتوں کی ٹانگوں میں واضح کپکپاہٹ تھی۔ وہ موت کے منہ سے بچ آئے تھے۔ اپنے مہربانوں کی آغوش میں سسکتے' بلکتے رہے۔ بیسویں شب کا چاند تھا گگن پر' فضا میں اداسی تھی' رات ابھی باقی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یتیمی کا دکھ جانتی ہو بیلی! یہ دکھ کیسے ہڈیوں میں سرائیت کرتا ہے۔ دیکھا ہے کبھی؟ حلق سے چھین لیے جانے والے نوالوں کا دکھ؟ زندگی کیا صرف جینے کا نام ہے؟ مصائب کے بھاری ٹوکرے کاندھوں پر اٹھائے صحراؤں میں چلتے رہیں اور آبلے آپ کے پیروں کو چیرتے رہیں۔ بس! یہ زندگی ہے میرے لیے۔ امی کے لیے' اسما کے لیے' یہ ہے یتیمی کا سہرا جو لوگ اپنے رویوں سے ہمارے سروں پر باندھ دیتے ہیں' کیونکہ بیلی ہم یتیم ہیں۔ یتیموں کا ساتھ کون دیتا ہے؟ ہمارا قصور کیا تھا۔ بیلی مجھے اس بات کا جواب دو۔" وہ بکھر رہا تھا' سمیٹنا مشکل نظر آرہا تھا۔ پر وہ بیلی کا ولی تھا' اسے ولی کے زخموں پر مرہم رکھنا تھا۔ وہ ان لفظوں کو اندر ہی اندر ترتیب دے رہی تھی۔ جو اسے دلاسا دے سکیں۔

"یتیمی میں انسان کا کوئی ہاتھ نہیں ولی! اللہ کی رضا ہے' جس سے چاہے لے لے۔ دوسروں سے جینے کا سلیقہ سیکھو۔ ہمارے پیارے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھو! ان جیسا بھی یتیم کسی نے دیکھا؟ ماں کے پیٹ میں تھے کہ باپ کی شفقت سے محروم ہوگئے اور لوگوں کا ظلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر! اور صبر بھی ایسا جو امت کو آٹھ آٹھ آنسو رلادے۔ پھر ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے صابر کیوں نہ بنیں ولی! میں نے مانا' تمہارے ساتھ برا ہوا ہے' پر ستم کی شب کو زوال ہے ولی! یہاں نہ سہی پر آخرت میں تمہیں انصاف ضرور ملے گا۔ اب تمہارے پاس جو ہے' جیسا ہے' اس پر صبر و شکر کرو۔ صبر نہ ہوتا تو بندہ تو دکھ سے مرجاتا۔ میرے مولا کا احسان کہ اس نے صبر کو دنیا میں اتارا۔ جینے کی کوئی راہ ہی نہ رہتی' اگر صبر نہ ہوتا۔ قرآن پاک کی آیتوں کا مطالعہ کرو' اللہ واضح الفاظ میں ارشاد فرماتا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

ولی چپ چاپ سن رہا تھا' اسے صبر کی راہ دکھادی تھی بیلی نے۔۔۔ وہ آج پوری طرح کھلا تھا بیلی پر' اندر ہی اندر ضد دلانے والے دکھ بیان کررہا تھا۔ اپنی زندگی کے سامنے۔

☼ ☼ ☼

"میں دس سال کا تھا جب ابا فوت ہوگئے۔ اسما سات سال کی تھی۔ بہت خوش حالی تھی۔ پندرہ مربعے زمین تھی ابا کے نام پر۔ بہت بڑا گھر تھا ہمارا لال اینٹوں سے بنا۔ گھر کے پچھواڑے دس بھینسیں تھیں ہماری۔ سب سے کم داموں پر دودھ فروخت کرتے تھے ہم۔ سب لوگ بڑے خوش رہا کرتے تھے ہم سے۔ سب لحاظ کرتے۔ ابا کو یہ زمینیں وراثت میں نہیں ملی تھیں۔ انہوں نے دس سال بیرون ملک میں رہ کر پیسہ جمع کیا تھا۔ کچھ پیسہ امی نے زیورات بیچ کردیا تھا ابا کو' ہمارا وہ گھر آبائی تھا۔ چچاؤں کے حصے تھے گھر میں اور کچھ زمینوں میں۔ چاروں چچا اور دو پھوپھیاں سوتیلی تھیں۔ ابا کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ دادا نے دوسری شادی کرلی تھی۔ بظاہر تو سب ابا کو بڑا بھائی سمجھتے تھے' مگر اندر ہی اندر تعصب رکھتے تھے اور زمینوں میں سانجھے داری تصور کرتے تھے۔ دبی دبی زبان میں زمین میں سب کا حصہ قرار دیتے تھے۔

ابا اپنی موت نہیں مرے تھے۔ انہیں زہر دے کر

مارا گیا تھا۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا نظم ونسق چچاؤں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ امی کوڑی کوڑی کی محتاج ہو گئیں۔ ہم چاچاؤں کے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے بن گئے۔ باپ کے سامنے پیار جتانے والے ہمیں پیروں کی دھول بنا بیٹھے۔ کیوں؟ کیونکہ ہم یتیم تھے بیلی! ہمارے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسکول کی فیس کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ پیسے مانگنے پر جھڑکیاں ملتی تھیں کہ اب تمہارا یہاں کوئی کام نہیں، جاؤ اپنے نانا، ماموں کے پاس۔

امی میکے میں جانا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ عزت کے ساتھ بچوں کو سسرال میں پالنا چاہتی تھیں۔ پھر ابا کی چھوڑی ہوئی زمین۔ امی سوچتی تھیں کہ ولید بڑا ہو گا تو زمینوں کو سنبھالے گا۔ پر یہ امی کی خام خیالی تھی۔ پھوپھیاں آتیں، امی سے فضول باتوں پر الجھتیں اور ابا کو زہر دینے کا الزام امی پر لگاتیں۔

پانچ برس گزر گئے، میں اتنا سمجھ دار ہو چکا تھا کہ کھرے کھوٹے کی پہچان کر سکوں۔ میں نے زمینوں پر آنا جانا شروع کر دیا۔ سب کو بہت ناگوار گزرنے لگا۔ ایک دفعہ بڑے چاچا نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میرا زمینوں سے کوئی لین دین نہیں، اس لیے میں آئندہ وہاں نہ جاؤں۔ پھر ایک دن بہت برا ہوا، امی کی الماری سے زمینوں کے کاغذات چوری ہو گئے۔ امی اپنی آخری جمع پونجی بھی ہار بیٹھیں۔ میرے دادا، دادی فوت ہو چکے تھے۔ شاید وہ ہی کچھ ہماری مدد کرتے۔

پھر ایک رات آئی بیلی! بڑی ویران اور اندھیری۔ بڑے کمرے میں سب جمع تھے۔ چاچے، پھوپھیاں، چچاؤں کے جوان ہوتے لڑکے۔ علاقے کی لائٹ نہیں تھی۔ کھڑکیوں پر رکھے دیے جل رہے تھے۔ ہمیں بھی وہاں حاضر ہونے کے احکامات ملے۔ امی ہمیں لے کر بڑے کمرے میں چلی آئیں۔ میری چچاؤں اور ان کے بیٹوں سے تلخ کلامی ہو چکی تھی کئی بار۔ میں اپنا حق مانگنے کھڑا ہو چکا تھا۔ بڑے چاچا نے امی کے سامنے میری شکایتوں کا پنڈورا بکس کھولا ہی تھا کہ میں بیچ میں بول پڑا۔

"پندرہ مربعے زمین میرے باپ کی چھوڑی ہوئی ہے۔ آپ لوگ شرافت سے میرے حوالے کر دیں۔" بیچ میں امی بول پڑیں۔

"ولید! بیٹا دھیرج، بیٹھ کر بات کرو۔" امی کا لہجہ التجائیہ تھا۔ وہ ڈری سہمی عورت تھیں۔ امی کے ڈرے لہجے کی شہ پا کر چاچا کا بیٹا بول پڑا۔

"ابے او کم ذات! تجھے یہاں حق مانگنے کے لیے نہیں بلایا۔ اپنا بوریا بستر سمیٹ اور دفع ہو جا ادھر سے۔" دوسرا بیٹا بیچ میں کودا۔

"تیری نحوست سے بہت ہنگامے ہونے لگے ہیں یہاں۔" میں نے قہر برساتی نگاہوں سے دونوں کو گھورا۔

"حرام کے پیسوں کی زمین نہیں خریدی تھی میرے باپ نے جو تم جیسے کتوں کے حوالے کر دوں۔"

"اگر تیری زمین ہے تو لا کاغذات دکھا، دکھانا۔" یہ منجھلے چچا کی آواز تھی، سب کی نگاہیں میری جانب اٹھی تھیں۔ سب میرے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔ پھوپھیوں کے چہروں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ امی اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھیں۔ اسما، امی سے لگی بیٹھی تھی۔ چپ اور سہمی... یہ بازی ہم پہلے ہی ہار چکے تھے۔ پر مجھے یقین سا تھا کہ میں اپنی زمین لوں گا ضرور... میں نے سب پر ایک غضب ناک نگاہ ڈالی، پھر کہا۔

"تم ہماری بوٹیاں بھی نوچ کے کھا جاؤ گے۔ یتیموں کی بوٹیاں، تم کتوں سے بھی بدتر ہو، کتا تو مالک کا وفادار ہوتا ہے۔ تم تو میرا ہی کھا کر مجھی پر غراتے ہو۔ میں پٹواری سے چوری شدہ کاغذات کی نقل کاپیاں لا کر دکھاؤں گا۔"

میں گھر سے باہر نکل گیا، چاند کی چودھویں رات تھی۔ مجھے چاند سے عشق ہے۔ اس کی ہر رات مجھے یاد ہوتی ہے بیلی! میرے اندر بھانبڑ جل رہے تھے۔ میں دوسرے دن پٹواری کے پاس پہنچا۔ پر وہ بھی نہ جانے کون سی نسل کا آدمی تھا۔ نوٹوں سے بک گیا ہو گا۔ چچاؤں نے خرید لیا تھا اسے۔ کاغذات چچاؤں کے نام ہو چکے تھے۔ زمین دادا کی ملکیت بتا کر سب میں مساوی تقسیم کی گئی تھی۔

اور شریعت کی رو سے دادا کی جائیداد میں مرحوم بیٹے کے بچوں کا کوئی حق نہیں۔ ہم یہ بازی مکمل ہار گئے تھے۔ تو کیا جینے کا حق بھی ختم تھا؟ میں صرف پندرہ سال کا تھا، قاعدہ قانون کا نہیں پتا تھا۔ میں نے پھر بھی بہت کوشش کی، مگر بے سود، سب چچاؤں کے ساتھ تھے۔ میری ساری بھاگ دوڑ کا علم گھر کے ہر فرد کو تھا۔

ایک رات میں گھر دیر سے پہنچا۔ میرے بارے میں سب کا خیال غالباً یہ تھا کہ میں سو رہا ہوں۔ اس رات بھی بڑا اندھیرا تھا۔ میں بڑے کمرے کی بیرونی کھڑکی کے پاس سے دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ کوئی خفیہ میٹنگ ہو رہی ہے کمرے میں۔ میں دانستہ کھڑکی سے لگا کھڑا رہا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ سب لوگ ہمیں چاقوں سے قتل کرنے کا پلان بنا رہے تھے۔ فجر کی اذان سے کچھ دیر قبل کا پروگرام تھا۔ فجر کی اذان میں چار گھنٹے باقی تھے۔ میں گھر سے دبے پاؤں نکل گیا۔ انتہائی خاموشی میں بھی انتہا کا شور تھا۔ کان پڑی سنائی نہ دیتی تھی۔ پر یہ شور میرے اندر کا شور تھا۔ جب سب ان کے قبضے میں تھا ہی تو قتل کیوں؟ میرا قصور کیا ہے؟ مجھے اس بات کا جواب آج تک نہ مل سکا۔ شاید میں زندگی بھر ان کی راہ کھوٹی کرتا رہتا۔ جب ہی قتل تک سوچ لیا میرے باپ کے بھائیوں نے۔

بچ نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ ہم سب چیزوں پر لعنت بھیج کر بھاگ جائیں۔ ہمارے کمرے کے ساتھ صحن تھا۔ ایک تنگ گلی سے ہوتا ہوا ایک دروازہ پچھلی جانب کھلتا تھا۔ میں اس دروازے کو پھلانگ کے کھڑکی کے رستے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کا دروازہ امی نے میرے انتظار میں کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ میں نے اندر آتے ہی کنڈی لگائی۔ امی جاگ رہی تھیں، اسما گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے امی کو مختصراً سب بتایا۔ امی کے پاس کچھ روپے تھے جو انہوں نے پائی پائی کر کے جمع کر رکھے تھے۔ امی نے ان چند نوٹوں کو دوپٹے کے پلو سے باندھا۔ اسما کو جگایا اور پھر ہم پچھلے دروازے سے بھاگ نکلے۔ سفر کی جو اذیت ہم نے برداشت کی اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

پھر ایک طویل سفر کے بعد ہم حیدر آباد پہنچے۔ نانا کے آبائی گھر۔ چند سال سکون سے گزارے۔ زمینوں کا درد بھی دل میں اٹھتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ ماموں کو ہمارا وجود کھٹکنے لگا۔ ہجرت پھر ایک بار منہ کھولے سامنے کھڑی تھی۔ میں کام کرنے لگا تھا۔ امی نے کچھ پیسے جوڑ لیے تھے۔ کچھ نانا نے رحم کر کے ہمیں دو کمروں کا مکان عنایت فرما دیا۔ ہم اس گھر میں آباد ہوئے۔ امرود کا درخت پہلے سے وہاں تھا۔ آباد اور پھل دار... پھر میرے دن رات اس پیڑ کے نیچے آباد ہوتے چلے گئے۔ زندگی آگے بڑھی اور تم میری زندگی میں آ گئیں۔ امرود کے پیڑ پر آنے والے خوش گوار ہوا کے جھونکے کی طرح۔ بیلی اپنے دو کمروں کے چھوٹے سے گھر کو میں تمہارے وجود سے آباد کرنا چاہتا ہوں، کرو گی نا آباد؟" لائن اچانک کٹ چکی تھی، گھنٹے کا کال پیکج تھا۔ اس کی آواز کی بازگشت بیلی کے کانوں میں گونجتی اور ڈوبتی رہی۔

"میرا گھر آباد کرو گی نا۔" ولی کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ پر یہ کہانی ابھی باقی تھی۔ کہانی اب شروع ہوتی ہے۔



جس طرح بیلی کو ولی کی ضد، انا اور ہٹ دھرمی کسی مخفی کہانی کا احساس دلاتی تھیں۔ اسی طرح ولی نے بھی محسوس کیا تھا کہ بیلی بہت سی باتوں پر چپ ہو جاتی تھی۔ وہ اس سے ہر بات شیئر کرتی تھی۔ پر کھل کر اقرار محبت نہیں کر پاتی تھی۔ کوئی چیز تھی جو اسے روکتی تھی۔ ولی نے کئی بار اس سے کہا کہ میرے گھر آؤ، مگر وہ یہی کہتی تھی۔

"ولی میں تمہارے گھر نہیں آ سکتی۔ میں مجبور ہوں، اتنی ضد مت کیا کرو۔"

ولی ذرا، ذرا سی باتوں پر اس سے خفا ہو جاتا تھا اور

اندر ہی اندر کڑھتا بھی رہتا۔ پھر بیلی اسے منالیتی اور وہ مان بھی جاتا۔ جب ولی نے اپنا آپ اس پر ظاہر کردیا تو وہ بھی زمانے بھر کی ہمت اپنے آپ میں لاکر سب بتانے پر آمادہ ہوگئی۔ اس نے بارہا چاہا تھا کہ ولی کو سب بتادے پر وہ اپنے ہاتھوں سے اس روزن کو کیسے بند کرتی جو بڑی گھٹن کے بعد اس نے خود کھولا تھا۔ آج اس نے اسے بتانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

"ولی..." اس نے پکارا تھا اور وہ حاضر تھا۔

"جی جان!" اس کی جان نکل گئی تھی ولی کے اس تخاطب سے۔ ولی آج اس سے سارے عہد و پیمان لینا چاہتا تھا۔ دن بھر اسی سوچ میں سرگرداں رہا کہ اسے کیا کیا کہنا ہے۔ ساری بے تابیاں سنانی ہیں۔ دل کی تمام حکایتیں۔ اسے آج یہ بھی بتانا ہے کہ امرود کا پیڑ بھی تمہاری راہ تکنے لگا ہے' بیلی بس اس آنگن میں تمہیں آنا ہوگا بیلی۔ اس گھر کے در و دیوار بھی تمہاری راہ تکتے ہیں۔ وہ اس کے اس جواب سے ساری ہمتیں ہارنے لگی تھی۔ پر بتانا تو تھا تو آج...

"ولی! پلیز بی سیریس۔" ولی اس کا میسج دیکھ کر چپ سا ہوگیا تھا۔ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"کیوں بیلی؟"

"ولی! میں آج تمہیں ایک تلخ حقیقت بتانا چاہتی ہوں۔"

"تم ایک منٹ رکو' میں کال کرتا ہوں' تب بتانا جو بھی بات ہے۔" ولی کی اس بات پر وہ جز بز ہوگئی تھی۔ اپنی زبان سے بتانا تو بہت ہی مشکل لگ رہا تھا۔ ولی کال ملا چکا تھا' اب اسے ریسیو کرنا ہی تھا۔

"ہاں! اب بتاؤ میڈم! کون سی تلخ حقیقت ہے؟"

"ولی! آج میں تمہیں وہ بتارہی ہوں جو مجھے پہلے روز ہی بتادینا چاہیے تھا۔ جو بھی سزا دینا چاہو' تمہیں حق ہوگا۔ مجھ پر لعنت بھیجنا چاہو یا اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دینا۔ مگر مجھے معاف کردینا۔ ولی میں محبت کی گناہ گار ہوں۔ میں تمہارے جذبوں سے کھیلی ہوں۔ پر میں نے بھی آگ پر رقص کیا ہے' میرے پیروں میں بھی آبلوں کی کہانی ہے۔ مجھے حق نہیں تھا کہ میں محبت کی وادی میں اترتی۔ اس وادی میں جھوٹ نہیں چلتا۔ اس وادی کی زبان مجسم محبت ہے۔ میں نے اس وادی کے قواعد توڑے' میں نے تم سے وہ چھپایا جو سب سے پہلے بتانا تھا۔ محبت کی بستی میں جھوٹ بولنا قتل کردینے کے مترادف ہے۔ پر میں مجبور تھی' بہت مجبور۔ میرا بھی دل کرتا تھا اس گھٹن زدہ زندگی میں کوئی کھڑکی ہو' کوئی روزن ہو۔ جہاں سے روشنی آئے' تازہ ہوا آئے۔" ولی کو بیچ میں ٹوکنا پڑا۔

"بات بتاؤ بیلی... میرا امتحان مت لو پلیز! بولو کون سا سچ ہے وہ؟" وہ تذبذب کا شکار تھی۔ مگر بتانا تو تھا نا۔ آخر کب تک بے نشان راستے پر چلتی اور اسے بھی اپنے پیچھے گمراہ کرتی رہتی۔

"میرا نکاح ہوچکا ہے' آج سے دس سال تین ماہ اور دو دن پہلے۔"

بظاہر یہ ایک بات تھی۔ مگر یہ ایک بات نہیں تھی۔ ایک تیز دھار چاقو سے لگائی گئی ضرب تھی ولی کے جگر پر۔

امرود کے درخت پر بڑا گھمسان کا کارن پڑا تھا۔

کووں نے چڑیا کے گھونسلے پر حملہ کردیا تھا۔

چڑیا کے انڈوں نے ابھی نمو بھی نہیں پائی تھی' گھونسلے سے گر چکے تھے۔ چڑیا کو لوٹا گیا تھا۔ انتہا کا شور تھا صحن میں۔ وہ پیڑ کے نیچے موڑھے پر بیٹھا تھا۔ چڑیا کووں سے لڑ کر جاں بحق ہوگئی تھی۔ ولی کو لگا کہ چڑیا نہیں مری' وہ مرگیا۔ اس نے ساری ہمتیں جمع کیں اور بولا۔

"ایسا مذاق تو مت کرو پاگل! کیوں مارنا چاہ رہی ہو اپنے ولی کو... پلیز! کہہ دو نا کہ تم مجھے ستارہی ہو۔ تم میری ہو بیلی... ولی کی بیلی..." اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی شامل تھی۔

سناٹے تو بیلی کے من میں بھی اترے تھے۔ وہ کچھ لمحے چپ کی ردا اوڑھے بیٹھی رہی۔ آنکھوں سے بہنے والا لاوا جسے عرف عام میں آنسوؤں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ محض نمکین پانی نہیں تھا۔ وہ اس کی پوری حیاتی کا سب سے عظیم دکھ تھا۔ دکھ بھی اب غضب ناک جو جان کنی جیسا عذاب تھا۔

"دکس موڑ پر ملے ہو... کاش! پہلے کبھی مل گئے ہوتے۔ اب تو میرے پیروں میں بیڑیاں ہیں اس جرم کی جو میں نے کیا ہی نہیں۔" اس نے ساری ہمتیں جمع کرکے ولی کو یقین دلا دیا تھا۔ اس کے حقوق کسی اور کے نام پر تفویض کیے جاچکے تھے۔

☼ ☼ ☼

ایک ساعت گزری' عذاب کی صورت۔ ایک دن اور پھر ایک ماہ۔ ولی پلٹ کر نہیں آیا۔ ابھی تو اس نے عنوان سنایا تھا۔ کہانی تو ساری جوں کی توں پڑی تھی۔ وہ ہمت کہاں سے لاتی۔ جس محبت کے گلاب کی آبیاری اس نے ولی کے دل میں کی تھی۔ اس پھول کی پتیوں کو کئی ٹکڑوں میں بانٹا تھا۔ اس شخص کا سامنا کیسے کرتی۔

ولی نے اسے ٹوٹ کے چاہا تھا۔ اب اس کے اندر سناٹا تھا۔ دل میں تاریکی تھی۔ سانسوں کی ڈوریں تو بیلی کے ہاتھوں میں تھما چکا تھا وہ چاہے تو اسے دوام بخشے پر یہ منٹوں میں کیا ہوا تھا سب ختم۔

آج ایک ماہ بعد ولی نے اس کی کال اٹینڈ کی تھی۔ انتہائی خاموشی سے... سیل کو صرف کان سے لگایا تھا۔ آواز تو کہیں دفن کرچکا تھا وہ۔

"ولی پلیز! اپنی آواز تو سنادو۔ ایسی سزا مت دو مجھے..."

ہنوز خاموشی تھی۔

"ٹھیک ہے! مت بولو۔ تمہیں اس محبت کا واسطہ جو تم نے اپنی بیلی سے کی۔ لائن ڈسکنیکٹ مت کرنا۔ میری کہانی سن لو' پھر مجھے ہر سزا منظور ہوگی۔"

لائن پر ایک زندہ لاش موجود تھی۔ بیلی نے اس سلسلے کو آگے جوڑا...

"حیدر سعید میرے کاغذی شوہر کا نام ہے۔ وہ میرا سب کچھ ہے ولی! پر وہ میرا کچھ بھی نہیں۔ آج سے دس سال چار ماہ اور دو دن پہلے میں جب ٹھیک سولہ سال کی تھی' اس دن مجھے اس کے نکاح میں دیا گیا تھا۔ دکھ یہ نہیں تھا کہ میرے حقوق اس کے سپرد کیے گئے۔ دکھ یہ تھا کہ اس کے دل پر جس کی ملکیت تھی وہ سارا ظفر نہیں تھی' وہ علینہ اسحاق تھی۔ یہ شادی دو دلوں کا ملن نہیں تھی۔ جاہلانہ رسموں کی آبیاری تھی۔ حیدر سعید کی بہن فرزانہ میرے بھائی سے منسوب کی گئی تھی۔ وٹہ سٹہ ہوا تھا۔ فرزانہ بھابھی کی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لیے مجھے سولی پر چڑھایا گیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ حیدر' علینہ کے پیچھے دیوانہ ہے۔ کچھ زمینوں کا بھی لالچ تھا۔ خاندان سے باہر شادیوں پر زمینوں کے بٹوارے سے کہیں بہتر تھا کہ چاہے بے جوڑ رشتہ ہی کیوں نہ ہو کردو۔ زمین نہ دو' زمین میں دفن کردو۔

بھائی مجھ سے کافی بڑا تھا۔ ان کی شادی ہوگئی پر میرے نکاح پر اکتفا کیا گیا تھا۔ حیدر اس شادی پر قطعی تیار نہیں تھا۔ اس نے دوٹوک الفاظ میں انکار کردیا تھا۔ سب کے حد سے زیادہ مجبور کرنے پر وہ کاغذی نکاح پر تو تیار ہوگیا مگر اس نے نکاح کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ نکاح کے دوسرے دن وہ شہر چھوڑ گیا تھا اور آج تک نہیں پلٹا۔ میرے بھائی کی دس سالہ ازدواجی زندگی آج بھی سولی پر لٹکی ہوئی ہے۔ ان کے چار معصوم بچے ہیں۔ میں اگر کورٹ سے خلع لوں تو میرے پیرنٹس میرے بھائی پر زور دیں گے وہ فرزانہ بھابھی کو چھوڑ دیں اور بچے رکھ لیں پھر بچوں کا مستقبل کیا ہوگا ولی! وہ اپنی ماں کو دیکھ کر سانس لیتے ہیں۔

پورے دس سال چار ماہ اور دو دن تم اس اذیت کا اندازہ کرو' جو میں نے اس شخص کے لوٹ آنے کے انتظار کی اذیت میں گزارے۔ چاہے وہ مجھے پیر کی جوتی بنا کے رکھ لیتا' میں رہ لیتی۔ میں اپنے بھائی کا گھر اجڑنے نہیں دیتی۔ پر وہ آتا تو۔ تم اس عورت کی گھٹن کا اندازہ کرو جسے ایسے کمرے میں قید کردیا گیا ہو جہاں کوئی روزن نہ ہو۔ سورج کی حکمرانی نہ ہو۔ چاند ہو نہ تارے...

تم ملے' تمہیں دیکھا' تم تازہ ہوا کا جھونکا لگے۔ میرے اندر جینے کی امنگ نے سر اٹھایا۔ تمہاری رفاقت کے ایک سال میں پوری زندگی جی لی۔ اپنی

زندگی کے چھبیس سال میں اس سال میں جی چکی ہوں۔ اب مجھے کوئی اور نہیں چاہیے۔ میں اسی محبت کے سہارے جی لوں گی باقی ماندہ زندگی میں ولی کی نہیں بن سکتی۔ پر میرے پور پور پر ولی کا قبضہ ہے۔ محبت ہجر سے عبارت ہے۔ ولی! میرے لیے یہی اعزاز ہے کہ میں بے مول چاہی گئی۔ تم نے اپنا آپ مجھے بخش دیا بہت زیادہ ہے یہ میری اوقات سے ساری زندگی سجدے کروں اپنے رب کے حضور شکرانے کے تو کم ہے کہ اس نے ولی کو میرا بنا دیا۔ مجھے اپنے پیروں کی دھول بنا لو۔ پر میری چاہ مت کرو۔ میری ساری کشتیاں جل چکی ہیں۔ میں حیدر سعید کی ہوں۔ میں خود اس سے رہائی نہیں چاہوں گی۔ چاہے میری روح میرے جسم کو آزاد ہی کیوں نہ کر دے۔ بالفرض! حیدر سعید مجھے خود چھوڑ دے' میرے بڑے بہت بے رحم ہیں۔ وہ میرے بھائی کی جنت کو اجاڑ دیں گے۔ کیا ہوا جو میری قربانی سے میرا بھائی آباد رہے' شاد رہے۔ عورت تو قربانی کا دوسرا نام ہے۔ مجھے رسموں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ اب میں محبت کو قربان کرتی ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں بے سمت چلتی رہی۔ اور منزل میرے مقدر میں ہے ہی کب؟ میں نے تمہارا کچھ نہیں سوچا۔ مجھے معاف کر دو۔ بیلی کے ولی معاف کر دو مجھے۔" وہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ ولی کی آنکھ سے ایک آنسو کا سفر تھا۔ یہ سفر کی کہانی تھی۔ جو اپنے انجام کو پہنچنے والی تھی۔



ولی کو پہلے تو اپنوں نے لوٹا تھا۔ اسے بے گھر کیا اور اب وہ جو اسے زندگی سے بھی پیاری تھی۔ جو زندگی بن کر اس کے اندر جی رہی تھی۔ اسے بیچ راہ پر چھوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا اس کا جواب ولی کے پاس بھی نہیں تھا۔ وہ لٹا تھا تو بے مول وہ بھی کی گئی تھی۔ اس نے دس سال میں کئی بار دروازے کو دیکھا تھا کہ حیدر سعید لوٹ آئے۔ اسے اپنے ساتھ رکھ لے۔ چاہے جانے کا مان نہ سہی چھت کا آسرا تو دے۔ حیدر سعید کے والدین نے چار سال تو اس ڈرامے میں گزارے کہ وہ باہر چلا گیا ہے اعلا تعلیم کے لیے' سارا کے گریجویشن کرنے کے بعد رخصتی پر دباؤ ہر طرف سے بڑھنے لگا یہاں تک کہ بھائی اور بھابھی کی چپقلش بھی رہنے لگی عمیر اور نمہا کی زندگی بھی داؤ پر لگنے لگی۔ پھر حیدر کے گھر والوں نے واضح کر دیا کہ حیدر سے کسی کا بھی رابطہ نہیں ہے۔ اب آپ لوگ جو چاہیں فیصلہ کر دیں۔ بھابھی کی ملتجی نگاہیں اس کی جانب تھیں۔ ان کا سوال بڑا بھاری تھا۔ وہ انہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹا سکتی تھی۔ گھر والوں کا دباؤ تھا کہ کورٹ سے خلع لے لی جائے اور فرزانہ بھابھی کو ان کے گھر بھجوا دیا جائے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں اس نے فیصلہ لینا تھا۔ اس نے دوٹوک الفاظ میں خلع لینے سے انکار کر دیا تھا۔

"نکاح گھر والوں کی رضا تھا۔ اور اب "انتظار" میرا نصیب ہے۔ میں حیدر سعید کا انتظار کروں گی چاہے پوری زندگی بیت جائے۔"

دائروں میں بننے والی شکلیں دماغ کی اسکرین پر بنتی اور بگڑتی رہیں۔ اس کے خونی رشتے تھے۔ جنہوں نے ایک فضول رسم کی بھینٹ اس کی مسکراتی زندگی کے سولہ سال چڑھا دیے تھے آگے بڑھ بڑھ کر مشورہ دینے والوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ اکثریت کو پتا تھا کہ حیدر سعید جس لڑکی کے ساتھ صبح و شام بتاتا ہے وہ سارا ظفر نہیں علینہ اسحاق تھی۔ زندگی کے ماہ و سال سرک رہے تھے اس نے نو سال اس گھٹن میں گزار دیے' سب مگن تھے۔ بھائی چار بچوں کا باپ بن گیا۔ نئے ایریا میں شفٹ ہوئے پانچ سال ہوئے تھے۔ کوئی اس کے ماضی سے واقف نہیں تھا یہاں تک کہ روبینہ بھی۔ جس کی شادی میں وہ ولی کے سامنے خود کو ہار گئی تھی۔ ولی نے اس کے خود ساختہ خول میں شگاف ڈال کر اسے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ وہ بھی جذبوں سے عاری کوئی اونچائی کا پہاڑ نہیں تھی۔ جذبوں اور محبتوں سے گندھی عورت تھی۔ توجہ کی طالب تھی کاستہ دل میں محبت کے چند سکوں کی

طلب گار ازل سے مرد کی بن جانے والی عورت۔۔۔

ولی کہاں تھا‘ کیسا تھا‘ اسے کچھ علم نہیں تھا۔ اس سے بچھڑے چھ ماہ گزر چکے تھے۔ ولی تو ویسے ہی انا کا مارا انا پرست مرد تھا۔ وہ کیونکر لوٹ کر آتا اور لوٹ آنے سے حاصل بھی کیا تھا۔ لاحاصل بے رائیگاں سفر تھا اس کی جستجو ہی کیا کرنا جو آپ کو منزل تک ہی نہ پہنچا پائے۔ وصل تو ویسے بھی منزل نہیں۔ عشق کی معراج ہجر ہے۔ جو آپ کے اندر ہی اندر پنپ کے عشق مجازی کا شجر بن جاتا ہے اور اس شجر پر کھلنے والے پھول روشنی کے استعارے ہوتے ہیں‘ چمکتے ہیں دوسروں کو مثبت راہ دکھاتے ہیں۔ خواب جزیروں میں بھٹکنے والوں کو نئی منزل دکھاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

اکیس جولائی کا ایک حبس بھرا دن تھا۔ ولی کی دوستی کا دوسرا سال تھا۔ وہ صحن میں بچوں کے ساتھ کسی کھیل میں مگن تھی۔ یکایک اندھیرا چھا گیا۔ تیز ہواؤں سے پیڑ لہرانے لگے۔ آم کے درخت پر بچی کچی امبیاں صحن میں جھڑنے لگیں۔ بچوں نے شور مچایا۔ عمیر کچن سے ایک ٹوکری اٹھا لایا۔ نیہا اور حسن اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ٹوکری میں امبیاں اکٹھا کرنے لگے۔ بھابھی انہیں آوازیں دے کر اندر بلائے جا رہی تھیں ہلکی ہلکی بوندا باندی نے زور پکڑ لیا۔ چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔

سارا نے آنکھیں زور سے بند کیں اور ہتھیلیاں آسمان کے نیچے پھیلا دیں۔ بچے اسے آوازیں دیتے گھر کے اندر جا چکے تھے۔ بھابھی کچن میں چولہے پر کڑاہی رکھ چکی تھیں۔ تیل کی بھینی بھینی سی خوشبو اس کے نتھنوں سے آکر ٹکرا رہی تھی۔ کچن کی کھڑکی صحن میں کھلتی تھی۔ بھابھی کے کڑاہی میں پکوڑے ڈالتے ہاتھ لمحے بھر کو رکے تھے۔ وہ سارا کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کا پور پور بارش سے بھیگا تھا مگر وہ جانتی تھیں وہ آگ کے شعلوں میں گھری تھی۔

آنکھوں سے بہنے والا نمکین پانی تھا۔
غضب کا موسم۔
اور رِس رِس کے جمع ہونے والی اداسی۔

تب ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ اندر آنے والا شخص حیدر سعید تھا۔ حیدر کی نظریں سارا پر تھیں اور سارا پتھر کی بن چکی تھی۔ وہ گمان سے یقین کے سفر پر تھی۔

اور بھابھی موم کی مانند پگھل رہی تھیں۔ ان کی آنکھ نہیں رو رہی تھی‘ ہر نقش رو رہا تھا۔ وہ مبہوت ہو کے صحن سے دکھائی دینے والے منظر میں گم تھیں۔ حیدر ان کا لاڈلا بھائی تھا۔ جسے بچوں کی طرح پالا تھا۔ اور وہ بے حس ان کی زندگی کو منجدھار میں ڈوب جانے والی کشتی کی مانند چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پر وہ بھائی تھا۔ شکوے تو بہت تھے۔ بھائی کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس ترس جاتی تھیں۔ دل اندر ہی اندر روتا تھا۔ ان کا ماں جایا بھائی کیوں منہ موڑ گیا۔ وہ تو علینہ اسحاق کو اس کی دل لگی سمجھتی تھیں۔ وہ پانچ فٹ کی لڑکی ان کا روگ بن جائے گی یہ پتا نہ تھا۔ ایک ذرا سے غلط فیصلے نے کیسے کیسے‘ کس کس کو تباہ کیا یہ جان کے بھی سب انجان تھے۔ پتھر کی سارا میں جان پڑ چکی تھی۔ اس کے لب تھرتھرا کے آپس میں پیوست ہو گئے تھے۔

حیدر سعید مرے مرے قدموں سے چلتا اس کے روبرو ہو چکا تھا۔ بادل زور سے گرجا تھا۔ دونوں کے دل کہیں اندر ڈوب کے ابھرے تھے۔ وہ دھندلائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ حیدر سعید مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

”کیوں بھیگ رہی ہو سارا؟“ یہ پہلا جملہ تھا جو حیدر سعید کے منہ سے نکلا تھا۔ وہ چپ چاپ بے جان مورت کی طرح اسے دیکھے گئی اور دیکھے ہی گئی۔ پھر اس کی آنکھیں سوال کر رہی تھیں۔

”کیا جرم تھا میرا حیدر سعید؟ گیارہ سال آٹھ ماہ اور چار دن کس قانون کے تحت تم نے مجھے اپنے نام کی قید میں رکھا بولو! جواب دو‘ کیوں سزا دی مجھے‘ جب میرا کوئی جرم ہی نہیں تھا؟ تم پلٹ کے تو آتے مجھے اپنی لونڈی بنا کے رکھ لیتے میں رہ لیتی کیوں کیا میرے ساتھ ایسا بولو؟؟“ اندر کا لاوا بہہ رہا تھا‘ وہ چپ تھا۔ گھر کے سارے مکین برستی بارش میں آ چکے تھے۔ مختلف آوازیں تھیں‘ دکھ تھا بھابھی اس کے گلے لگ چکی تھیں۔ ہر لب پر ایک الگ سوال تھا پھر سب اسے اندر لے گئے۔ حیدر سعید کے پاس کسی بھی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اور سارا بھیگتی رہی صحن کے وسط میں
غضب کا موسم تھا
اداسی تھی
سود و زیاں کا حساب لگاتی ولی کی بیلی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات بھر وہ کتنا روئی تھی‘ کوئی نہیں جانتا تھا۔ گیارہ سال کے سیلاب کا بند ٹوٹا تھا۔ آنکھیں انگارہ تھیں۔ پور پور بخار میں پھنک رہا تھا۔ وہ کمرے کے اندر صحن میں کھلنے والی کھڑکی سے سر ٹکائے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائے کھڑی تھی۔ دائروں میں بننے والی شکلیں تھیں۔ اس کی اپنی شکلیں تھیں ہر ہر موقع کی شکل جب وہ عید تنہا مناتی تھی۔ وہ شکل بنتی اور بگڑتی‘ جب اس کے سنگھار کو سراہنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ بارشوں میں تنہا بھیگتی تھی۔ کوئی ساتھ دینے والا نہ تھا۔

پھر ولی کی محبت میں بتائے ہوئے دو سال۔
خوش باش بیلی اور سارا ظفر کی شکلیں آپس میں گڈمڈ ہوتی رہیں۔ اس کی توجہ کا ارتکاز ٹوٹا جب حیدر سعید اس کی پشت پر کھڑے ہو کر اسے آواز دے رہا تھا۔

”سارا!“ وہ ذرا کی ذرا پیچھے مڑی تھی۔ وہ ایک ساعت رکا پھر گویا ہوا۔

”میں مجرم ہوں تمہارا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی سارا! مجھے اس طرح غائب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جو بھی ہوتا یہیں رہ کے مقابلہ کرتا میں سارا! میں تمہیں لینے آیا ہوں تم میرے ساتھ چلو۔“ مطلب

پرست مرد کو ہمیشہ اپنی فکر رہتی ہے۔
اب تم مجھے کیوں لینے آگئے ہو حیدر سعید! تمہاری طرف تو میرا بہت حساب نکلتا ہے۔"

وہ یہ صرف سوچ کر رہ گئی تھی کہنے کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اسے زندگی تو حیدر سعید کے سنگ گزارنی تھی۔ چاہے زندگی کتنی ادھوری ہی کیوں نہ ہوتی۔ اس کے سارے گلے لب تک آتے اور لوٹتے رہے۔ اس نے حیدر سعید سے صرف یہ کہا کہ وہ حیدر سعید کے ساتھ چلنے کو تیار ہے۔ اس نے تو اس سے علینہ اسحاق کا بھی نہ پوچھا کہ اس کا قصہ کیا ہوا۔

✵ ✵ ✵

پندرہ دن کے اندر اندر اس کی رخصتی طے پائی۔
پھر وہ دن بھی آگیا۔ وہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ روبینہ اس سے ملنے چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گفٹ پیک تھا۔ وہ گفٹ ولی نے بھیجا تھا۔ وہ گفٹ اس کے ہاتھ میں کیا آیا۔ اس جگہ کی ہر چیز سکتے میں آگئی۔ گھڑی کے سیل ختم ہوگئے اور ٹک ٹک بھی بند ہوگئی تو بجنے میں سات منٹ باقی تھے۔ روبینہ سرگوشی میں بتا چکی تھی کہ "ولی کی طرف سے ہے یہ۔"

اس نے لرزتے ہاتھوں سے گفٹ کھول لیا۔ اس کا دل بڑی زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ اور جو کچھ اس میں تھا' اسے مار دینے کے لیے کافی تھا۔

ٹوٹے ہوئے پین' خالی پرفیوم کی شیشیاں' امرود کے سوکھے ہوئے بیج' پیڑ کے پتے......

دنیا کی نگاہ میں بھلا اس تحفے کی کیا قیمت ہوتی۔ پر بیلی کی زندگی کے لیے زادِ راہ تھا۔ ایک آنسو نے اس کی آنکھ سے ہجرت کا سفر باندھا اور اس کے پلو میں جذب ہو کر زندگی کھو دی۔ ایک سسکی سی لے کر اس نے محبت کو دل کے اندر دفن کردیا۔

پنکھے کی تیز ہوا سے سارے سوکھے ہوئے پتے بکھر گئے وہ پاگلوں کی طرح پتوں کو سمیٹنے کے لیے اٹھی۔ اچانک بارات آگئی کا شور اٹھا اور ولی کی محبت سر پٹخ پٹخ کر روتی رہی۔

✵ ✵ ✵

حیدر سعید کو آفس کی طرف سے حیدر آباد میں گھر ملا ہوا تھا وہ مہینے بھر کی چھٹی پر کراچی آیا تھا۔ غرض کا بندہ تھا۔ سارا کو یہ علم تھا کہ وہ اسے حیدر آباد لے جانے کے لیے آیا ہے۔ وہ چپ کی ردا اوڑھے رہی۔ وہ گونگی ہوچکی تھی' روبوٹ جیسی تھی وہ احساسات اور جذبات سے عاری۔

جس پل اس نے حیدر سعید کے گھر میں پہلا قدم رکھا تھا۔ اس کے دل نے شدید خواہش کی تھی کہ موت اسے اپنی آغوش میں لے لے۔ وہ اب اس شہر میں سانس نہیں لینا چاہتی تھی۔ یہاں اس نے پانچ فٹ دس انچ کے مرد کو مارا تھا وہ سانس کیونکر لیتی۔

حیدر سعید اس کا ہاتھ تھامے اسے اپنے بیڈ روم تک لے گیا تھا۔ آج وہ سارا کو پوری داستان سنانا چاہتا تھا۔ علینہ اسحاق سے سارا ظفر تک کا سفر......

وہ تین سال باہر گزار کے واپس آگیا تھا۔ اتنا سنگ دل تھا' اتنا بزدل تھا کہ پلٹ کے گھر نہ جاسکا پھر اس نے علینہ اسحاق سے شادی کرلی۔ اور اسے لے کر باہر چلا گیا۔ وطن لوٹا تو اس کے ساتھ اس کے دو جڑواں بچے تھے' ایک بیٹا اور بیٹی علینہ کو جان لیوا بیماری لگ گئی۔ دو سال اس نے جان توڑ کوشش کی پر وہ اسے بچا نہ سکا۔ بچوں کو وہ بورڈنگ میں بھجوا چکا تھا۔ علینہ مرگئی تو بچوں سے دوری کا احساس شدت پکڑ گیا۔ بچے چھٹیوں میں آئے تو اسے احساس ہوا' بچے بنا ماں کے ادھورے ہیں۔ اسے ماضی میں جھانکنے کا خیال آیا تو سارا ظفر اس کی ہر راہ پر کھڑی تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اس نے عدالت سے خلع نہ لے لی ہو۔ وہ بہت سارے ڈر لے کر کراچی آیا تھا پر اسے اپنی راہ دیکھتے پایا۔

علینہ کی موت اور دو بچوں کی موجودگی کا علم سب کو تھا۔ سارا کو بھی سن گن مل چکی تھی۔ اسے تو ہر حال میں نباہ کرنا تھا۔ یوں وہ بغیر حیل و حجت کے دو پلے پلائے بچوں کی ماں بن کر معتبر ہوگئی۔ دل کی دنیا ویران

تھی سو رہی۔ اس نے اپنے آپ کو اس ماحول میں ایڈجسٹ کرلیا۔

پھر ایک دن اس کی ملاقات روبینہ سے ہوگئی۔ روبینہ اس سے مل کر نہ صرف خوش بلکہ حیران بھی ہوئی کیونکہ شادی ہو کر وہ تایا کے گھر گئی تھی۔ روبینہ نے اس بات کا ذکر ولی سے بھی کردیا۔ ولی کو شدید دھچکا لگا تھا۔ اس کی زندگی اس کے شہر میں تھی پر اس کی نہ تھی۔

ولی نے شہر چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ ملائشیا چلا گیا تھا۔ اس نے بیلی کے نام آخری خط لکھا تھا اور اسے روبینہ کے حوالے کردیا تھا۔ روبینہ سارا سے ملنے اس کے گھر آئی اور ولی کا خط بھی ساتھ لائی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی' وہ بے اختیار بڑھی تھی کوئی کشش تھی جو اسے کھینچ رہی تھی۔ دروازے میں ایستادہ روبینہ کو دیکھ کر اس کا دل ڈوب کے ابھرا تھا۔ اپنی ہمراہی میں اسے ڈرائنگ روم تک لے آئی تھی۔ حیدر سعید گھر پہ نہیں تھا۔ وہ کھل کے بات کرسکتی تھی۔

خیر خیریت اور کولڈ ڈرنک سرو کرنے کے بعد وہ وہیں آگئی تھی جہاں اسے آنا چاہیے تھا۔
"ولی آیا تھا تمہاری طرف؟ کیسا ہے وہ؟ ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں! آتا رہتا ہے۔ پژمردگی سی ہے۔ ٹھیک ہے' وہ تمہارے لیے کچھ دیا ہے اس نے۔" روبینہ نے کہا۔
"کیا دیا ہے؟ دو جلدی مجھے۔" بے قراری اس کے انگ انگ سے مترشح تھی روبینہ ایک سرد اور خاموش سی نگاہ اس پر ڈال کر بولی۔

"دیتی ہوں۔ صبر کرو سارا حیدر! صبر جیسے ولی نے کیا بے پناہ' بے حساب صبر! صبر کی تلقین کرنا تو آسان ہے پر اس کے درجے پر پہنچنا بے حد مشکل۔ میرا تم سے ایک سوال ہے سارا! تم ولی کے دل سے کیوں کھیلتی رہیں؟ دنیا میں کھلونوں کی کمی تو نہ تھی، تمہیں کوئی حق نہیں تھا تم ایک جیتے جاگتے انسان کو مار ڈالو۔ جب تمہیں پتا تھا کہ تمہارے پیروں میں بیڑیاں تھیں' تم نے فرار کیوں چاہا؟ جب تمہارے پر ہی کٹے ہوئے تھے' تم نے اڑان کیوں بھری سارا کیوں؟ تم نے اس کے سارے خواب ایسے توڑے جیسے کسی نوزائیدہ انسان کو قتل کردیا جائے۔ تمہیں اس سے محبت ہو بھی گئی تھی تو سبک رو ندی کی طرح بہتیں۔ اس کے جذبوں میں تلاطم کیوں پیدا کیا؟ محبت تو دان کرتی ہے سارا! جذبوں کا خون نہیں۔ تمہارے پاس کوئی رستہ تھا ہی نہیں۔ تم اسے غلط راہوں میں بھٹکا کے خود اپنا گھر بسا بیٹھی ہو سارا حیدر! صرف اپنا نشیمن بچایا ہے تم نے۔"

سارا کو ایک گھونسا سا لگا تھا گھر بسانے کے نام پہ۔ روبینہ کا اشتعال فطری تھا۔ غصہ بھرا لہجہ ولی کی حمایت تھا۔ ولی رشتے کا ہی سہی' تھا تو دیور' سارا کی آنکھیں موتیوں کی لڑیاں پرو رہی تھیں۔ اس کے پاس صفائی میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔
روبینہ نے خط نکال کر میز پر رکھا اور چپ چاپ چلی

گئی۔ سارا بھیگی نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر ساری ہمتیں جمع کر کے لفافہ اٹھایا جو اوپر سے بالکل کورا تھا۔ پر اس کے اندر ایک کہانی بند تھی سیل رواں جاری تھا۔ اس نے دل میں اٹھتی سسکیوں کو دباتے خط کو نکالا۔ جھلملاتی آنکھوں سے ہتھیلیاں رگڑ کر آنسوؤں کو صاف کیا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ آہستہ آہستہ صاف دکھائی دینے لگا۔

پیاری بیلی!

جہاں رہو خوش رہو' آباد رہو۔ اس خط کو پڑھتے ہی نذر آتش کر دینا۔ میں نہیں چاہتا یہ ذرا سا رقعہ تمہاری ازدواجی زندگی کو تہس نہس کر دے۔

بہت زیادہ خواہش تھی مجھے اور میری بیلی کو کہ ہم اس شہر تمنا میں رہیں۔ اس کی ٹھنڈی میٹھی فضاؤں کو اپنے من میں اتاریں۔ پر یہ خدا کو منظور نہیں تھا۔ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔ میں تمہارا جوڑ نہیں تھا۔ سو تم میری ہو نہ سکیں۔ یہی کافی ہے کہ ہم بنا غرض کے چاہے گئے.... اور چاہت بھی انتہائی چاہت کہ سانس تم لیتیں اور دل میرا دھڑکتا۔ خیر! چھوڑو.... ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ اپنا بہت، بہت اور حد سے زیادہ خیال رکھنا۔ اس شخص کے لیے جو تمہارے بنا جینے کی جنگ لڑ رہا ہے۔ میں نے تمہیں معاف کیا بیلی! میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں کہ ہم ایک پسندیدہ شہر میں ہوں اور ہماری سانسیں الگ الگ گھروں میں ہوں۔ نہیں نہیں بیلی! مجھے یہ برداشت نہیں۔

تم میری محبت کے چمن میں مسکراتی رہیں' کافی ہے۔ تم نے مجھے محبت کرنا سکھا دی۔ میں تو اناڑی تھا' پاگل تھا۔ راہ سے بھٹکا مسافر تھا۔ تم نے مجھے رستہ دکھا دیا۔ تم نے میرا رستہ کھوٹا نہیں کیا۔ ہاں! میری وجہ سے تمہارا رستہ کھوٹا ہوا۔ تم خود سے کیے گئے عہد سے ہٹ گئیں۔ میں تمہاری راہوں میں محبت اوڑھے نہ کھڑا ہوتا تو تم کبھی بھی متزلزل نہ ہوتیں۔ تم بہت عظیم ہو۔ تم نے ایک ہنستے بستے گھر کو بچانے کے لیے محبت کو قتل کیا تو یہ کوئی جرم نہیں۔ جرم تب ہوتا' جب جذبوں میں کوئی کھوٹ ہوتی۔ تم پہ کوئی دفعہ عائد نہیں ہوتی۔ تم میری زندگی سے نکل چکی ہو پر آج بھی امرود کا پیڑ مجھ سے تمہاری باتیں کرتا ہے۔ بیلی! ہوائیں آج بھی تمہیں خوشبوؤں کے ہنڈولے پر بٹھا کر میرے صحن میں اترتی ہیں اور میں تمہیں محسوس کر لیتا ہوں۔ آج بھی میرے خوابوں پر حکومت ہے تمہاری۔ آج بھی بارش کی بوندیں تمہاری پائل کی مدھم چھن چھن سی برستی ہیں یہاں' یہ سب دنیا کی نگاہ میں تو تصوراتی ہو سکتا ہے پر میرا گمان یقین میں بدل چکا ہے تم دور رہ کے بھی کبھی دور نہ ہو سکیں۔ تم ولید انصار کی سانسوں میں مہکی ہو بیلی! تمہارے وجود کو میں نہ پا سکا۔ میں بد قسمت تھا۔ پر تمہاری روح پر میرا تسلط آج بھی قائم ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ باقی نہ رہا۔ میں تمام شکووں کو سزائے موت دے کر قبر میں اتار چکا ہوں۔ ضروری تو نہیں جن سے پیار ہو' انہیں شکایتوں کی مار بھی ماری جائے۔

مانا کہ دل بڑا نادان ہے پر اسے سمجھانے کی سعی کرنا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں جس طرح میں تمہیں نہیں بھلا پایا تم بھی مجھے نہ بھول پاؤ گی۔

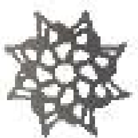
میں یہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں جب تم یہ سطور پڑھ رہی ہو گی۔ میں یہاں سے میلوں دور جا چکا ہوں گا۔ ہجرت تو میرا مقدر ہے' میں مقدر کو اوڑھ لیتا ہوں۔ تم جدائی کے آنچل کو اپنے سر پر پھیلا لو اور میری محبت کو اپنے بائیں پہلو میں امر کر لو۔ تم دنیا کے کسی بھی خطہ میں رہو' ولی کی بیلی رہو گی۔

اور....

میں....

بیلی کا ولی....

وہ خط کو مٹھی میں بھینچ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی اور یہ رونا تو اب عمر بھر کا تھا۔



تیرے میرے درمیان

مہوش افتخار



"بابا آج واپسی پہ اپنی بی پی کی ٹیبلٹس لیتے آیئے گا' ختم ہو گئی ہیں۔" وہ احسان صاحب کے سامنے ناشتہ رکھتے ہوئے بولی تو وہ اثبات میں سر ہلا کر ہاتھ میں پکڑا اخبار تہہ کرتے ہوئے اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟"

"بس جا رہی ہوں۔" وہ ایک نظر وال کلاک پہ ڈالتے ہوئے تیزی سے ان کے لیے چائے بنانے لگی۔

"کل کس وقت واپسی ہوگی؟" انہوں نے پلیٹ اپنی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

"ان شاء اللہ شام تک واپس آجائیں گے۔" وہ پیالی ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولی اور پھر عجلت میں تیار ہونے چل دی۔

وہ آج اپنے کالج کی اسٹوڈنٹس اور دیگر اسٹاف ممبرز کے ساتھ دو دن کے لیے بائے روڈ اسلام آباد ٹرپ پہ جا رہی تھی۔ حالانکہ اس شہر کا محض حوالہ ہی اس کے



مکمل ناول

بوجھل دل کو مزید بوجھل کر دیا کرتا تھا۔ مگر یوں اپنے ماضی کی تلخ یادوں سے اپنے حال کو بھلا کب تک پراگندہ کیا جا سکتا تھا؟ یہی سوچ کے اس نے سب کے بے حد اصرار پہ جانے کی ہامی بھرلی تھی۔ کپڑے تبدیل کرنے اور معمول کا ہلکا پھلکا میک اپ کرنے کے بعد وہ اپنا پرس اور رات کا پیک شدہ چھوٹا سا سفری بیگ اٹھائے' تیز قدموں سے باہر آئی تھی۔ بابا سے مل کر وہ دونوں سوئے ہوئے بھانجوں کو پیار کرتی آپی کے ساتھ پورچ میں چلی آئی تھی۔

"اپنا خیال رکھنا۔" اس پہ آیت الکرسی پڑھ کر پھونکتے ہوئے مومنہ نے اسے گلے لگایا۔

"آپ بھی۔" وہ اس سے الگ ہوتے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھی تو ایک لحظے کو مومنہ کا دل چاہا کہ وہ اسے روک لے۔ نجانے کیوں عجیب سی بے چینی یک لخت اسے اپنی ذات کا احاطہ کرتی محسوس ہوئی تھی۔

"فی امان اللہ!" سر جھٹکتے ہوئے اس نے گاڑی میں بیٹھتی بہن کو اللہ کی امان میں دیا تھا۔ اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ڈرائیور تیزی سے گاڑی نکال لے گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہاں تیمور! کیس میں کس حد تک پروگریس ہوئی ہے؟" نیازی صاحب نے تیمور مہناج کے کرسی سنبھالنے کے بعد استفسار کیا۔

"سر! تقریباً" نوے فیصد کام مکمل ہو چکا ہے اور جو رزلٹ سامنے آیا ہے' اس نے تو مجھے چونکا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے تو یہ معلوم تھا کہ ڈرگز اور عورتوں کے کاروبار میں ملوث اس گینگ کے ہاتھ خاصے لمبے ہیں۔

لیکن اتنے لمبے ہوں گے اس بات کا اندازہ نہ تھا۔ بہت سی اہم سیاسی اور کاروباری شخصیات ان لوگوں کی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے بندے بڑے دھڑلے سے مختلف شہروں میں یونیورسٹیز' خاص کر گرلز کالجز اور بہت سے وومن ہاسٹلز کے اندر تک گھسے ہوئے ہیں۔ ان کے خلاف کوئی کارروائی تب ہی کامیاب ہوگی' جب آخر تک ہمارا کام یونہی مکمل رازداری اور احتیاط سے جاری رہے گا۔ بصورت دیگر آپ تو جانتے ہیں کہ یہ سیاسی مگرمچھ آخری وقت میں بھی کیسے پوری گیم پلٹ سکتے ہیں۔" تیمور نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو نیازی صاحب دھیرے سے اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولے۔

"جانتا ہوں۔ اس کیس پہ کسی کا اثر ورسوخ چل نہ سکے' اسی لیے اسے ہم ایجنسی والوں کے سپرد کیا گیا ہے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ کتنے پانی میں ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اس لیے رازداری اور احتیاط کی طرف سے تو تم بے فکر رہو۔ لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھنا' ثبوت اتنے مضبوط ہونے چاہئیں کہ کوئی چاہ کر بھی ان لوگوں کو قانون کے شکنجے سے آزاد نہ کرواسکے نہ ہی ہم سے کوئی سوال جواب کرسکے۔"

"آپ بے فکر رہیں سر! میں نے ایسے ثبوت اکٹھے کیے ہیں کہ ان کی مدد کو آنے والا کم از کم دوبار تو ضرور سوچے گا۔" تیمور اعتماد سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"گڈ!" اس کی اسی قابلیت کے بل بوتے پہ ہی تو اجمل نیازی نے یہ دشوار کیس اسے سونپا تھا۔

"پلان آف ایکشن کے بارے میں کچھ سوچا ہے تم نے؟" اجمل صاحب نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی سر! وہ بھی تقریباً" تیار ہے۔ ایک دو دن میں' میں اور باری آپ کے ساتھ اسے ڈسکس کریں گے۔ اس آپریشن کے لیے موسٹ سوٹ ایبل آفیسرز کی فہرست بھی ہم نے تیار کرلی ہے۔ ان شاء اللہ چار' پانچ دن میں ہم ریڈ کے لیے بالکل تیار ہوں گے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا تو اجمل صاحب مسکرا دیے۔

"ان شاء اللہ! او کے۔ دین ینگ مین' بیسٹ آف لک۔ ود یور مشن۔"

"تھینک یو سر!" اس نے مسکراتے ہوئے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

☆ ☆ ☆

ٹرپ پہ جانے والی فائنل ایر کی ساری لڑکیوں اور اسٹاف کو صبح آٹھ بجے کا وقت دیا گیا تھا۔ مگر نکلتے نکلتے نو بج گئے تھے۔ مزید کسر سڑکوں پہ موجود بے پناہ رش نے پوری کردی تھی۔ یوں لاہور شہر سے نکلنے میں ہی انہیں اچھا خاصا وقت لگ گیا تھا۔ مگر خوشی سے چہکتی' ہنستی مسکراتی اسٹوڈنٹس کو اس بات کی قطعاً" پروا نہ تھی۔

"کیا بات ہے بشریٰ اور نائمہ! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اتنی چپ چپ کیوں ہیں دونوں؟" اپنے ساتھ بیٹھی ماہم سے باتیں کرتی انابیہ کی نظر جونہی اپنے دائیں جانب دوسری قطار میں خاموش بیٹھی ان لڑکیوں پہ پڑی' وہ ان سے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"بس میڈم! یونہی۔" بشریٰ سیدھی ہوتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی تو انابیہ ایک نظر اس کے الجھے الجھے سے چہرے کو دیکھتے ہوئے اثبات میں سرہلا گئی۔

یہ لڑکی بشریٰ ابھی چند ماہ پہلے ہی ان کے کالج میں ٹرانسفر ہوکے آئی تھی۔

اپنے چہرے سے وہ باقی لڑکیوں سے خاصی بڑی دکھائی دیتی تھی۔ مگر انابیہ کو جو چیز پہلے دن سے کھٹکی تھی' وہ تھے اس کے انداز واطوار۔ اس کی بول چال' اٹھنے بیٹھنے حتیٰ کہ اس کے دیکھنے تک میں ایک عجیب سا سطحی پن اور بے باکی تھی۔ جسے انابیہ جیسی شائستہ اور سلجھی ہوئی لڑکی کے لیے برداشت کرنا خاصا مشکل امر تھا۔ مگر چونکہ وہ ایک استاد تھی' اس لیے اپنے کسی بھی اسٹوڈنٹ سے محض اس کے طور طریقوں کے باعث امتیازی سلوک کرنا اس کے نزدیک سراسر غلط فعل تھا۔ اسی لیے اس نے آج تک اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں لیکن وہ وقتاً" فوقتاً" اپنی سب ہی اسٹوڈنٹس کو اپنے اندر رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ پیدا کرنے کی نصیحت کرتی رہتی تھی۔

"میڈم! ہم ایک بجے تک اسلام آباد پہنچ جائیں گے؟" ایک نظر نائمہ کی طرف دیکھتے ہوئے بشریٰ نے سوال کیا تو انابیہ کلائی پہ بندھی گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

"ایک بجے تو مشکل ہے' دو ڈھائی بج جائیں گے' کیونکہ آپ کو معلوم تو ہے کہ جس ریسٹ ہاؤس میں ہمارا اسٹے (قیام) ہے' وہ اسلام آباد شہر سے تھوڑا آگے ہے۔"

اس کے جواب پہ بشریٰ اثبات میں سرہلاتی نائمہ کی طرف پلٹ کے کچھ کہنے لگی تو انابیہ بھی ماہم کی طرف رخ پھیر گئی۔ مگر تب ہی نائمہ کی جھنجلائی ہوئی قدرے بلند آواز انابیہ کا سارا دھیان ایک بار پھر ان کی جانب مبذول کرواگئی۔

"تو پاگل لڑکی انہیں ساڑھے تین چار بجے کا ٹائم دونا!" اور انابیہ نے چونکتے ہوئے بے اختیار پلٹ کے ان دونوں کی طرف دیکھا تھا۔ مگر وہ دونوں اپنی کھسر پھسر میں اتنی مگن تھیں کہ انہیں انابیہ کی نظروں کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

"یہ کس کو ٹائم دینے کی بات کررہی ہیں؟" پرسوچ انداز میں ان دونوں کو دیکھتے ہوئے انابیہ نے سوچا تھا۔

اس لڑکی پہ اعتبار کرنے کو تو اس کا دل پہلے بھی تیار نہ تھا لیکن اب تو ان دونوں پہ خاص نظر رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی اسے۔

دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے وہ ساری بات ماہم کو بتانے کے ارادے سے اس کی جانب پلٹی تھی۔ مگر اس کی آنکھ لگی دیکھ کے وہ بے اختیار اک گہری سانس لیتے ہوئے ماہم کی طرف موجود کھڑکی سے بھاگتے منظر پہ نگاہیں جماگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

چمکتی روش پہ سیاہ لینڈ کروزر کے رکتے ہی مستعد گارڈ نے اتر کر تیزی سے پچھلا دروازہ کھولا تو اندر براجمان ہستی اک شان بے نیازی سے باہر نکل آئی۔

اس کے باہر آنے تک پیچھے دو گاڑیاں اور آرکی تھیں۔

"آیئے۔ آیئے۔ آپ کا ہی انتظار تھا۔" معاً" سامنے موجود برآمدے میں لکڑی کا بھاری داخلی دروازہ کھول کے ایک خوبصورت سی عورت' نفاست سے سجی سنوری ملازموں کے ہمراہ آنے والوں کے استقبال کو تپاک سے آگے بڑھی تھی۔

"آداب عرض کرتی ہوں حسنی صاحب۔" کروفر سے کھڑے اس بے حد شان دار شخص کے قریب پہنچ کے اس عورت نے ایک ادا سے مسکراتے ہوئے ہاتھ پیشانی تک لے جاکر سلام کیا۔

"کیسی ہو فیروزہ؟" چمکتی ہوئی سنہری آنکھیں بے نیازی سے ایک پل کو فیروزہ بائی کے چہرے کی طرف اٹھی تھیں اور اس عمر میں بھی فیروزہ کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"کرم نوازی ہے حضور کی۔" ستائشی نظروں سے اس کے ساحرانہ نقوش کو تکتے ہوئے فیروزہ نے بے اختیاری کے عالم میں سوچا۔ "کیا کوئی مرد اتنا بھی وجیہہ ہوسکتا ہے؟"

اس دوران پچھلی دو گاڑیوں میں بیٹھے افراد بھی ملازموں کی معیت میں ان کے قریب چلے آئے تو فیروزہ کو نا چاہتے ہوئے بھی ان کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔

"ان سے ملو' یہ ہیں ہمارے بہت اچھے دوست شاہد لغاری' علی شکیل' سفیان حیدر اور ندیم باری۔ یہ سب ملک کی مایہ ناز ہستیاں ہیں اور آج کل ہمارے مہمان ہیں۔ لیکن آج رات کے لیے ان کی مہمان نوازی میں تم کو سونپ رہا ہوں۔" کہے بعد دیگرے وہ اپنے

دوستوں کا تعارف کرواتے ہوئے آخر میں دھیرے سے مسکرایا تو فیروزہ کی باچھیں کھل گئیں۔ ایک نہیں بلکہ اکٹھی پانچ بے انتہا دولت مند آسامیاں! یہ رئیس زادہ حسنی مرتضیٰ تو قلیل عرصے میں ہی اس کے لیے سونے کے انڈے دینے والی مرغی ثابت ہوا تھا۔

"زہے نصیب۔ آج جب آپ کے بندے نے فون پہ بتایا کہ رات میں آپ کے ساتھ کچھ خاص مہمان ہوں گے تو یقین جانئے تب سے ہی میں نے آپ کے مہمانوں کے شایان شان تیاریوں کی کوشش شروع کردی تھی۔۔۔ آپ نے مجھ ناچیز پہ بہت بھاری ذمہ داری عائد کردی ہے حسنی صاحب!" مسکراتے ہوئے اس نے آخری جملہ قصداً "گھبرائے ہوئے انداز میں آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے ادا کیا تو حسنی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"میں جانتا ہوں، مجھے مایوسی نہ ہوگی۔"

"شکریہ! آیئے اندر تشریف لایئے۔" وہ ان سب کو لیے اندر کی جانب بڑھی تھی جہاں ساری رات اس خوبصورت بنگلے میں محفل اپنے عروج پہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ماہم کو "روڈ سیکنس" کی شکایت ہونے کی وجہ سے سارا راستہ متلی اور گھبراہٹ محسوس ہوتی رہی تھی۔ اس کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے انابیہ چاہ کر بھی اس سے بشریٰ اور نائمہ کے متعلق کچھ ڈسکس نہ کرسکی تھی۔ مگر اپنے طور پہ وہ ان دونوں پہ نگاہ رکھنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ بنا کسی تصدیق کے ماہم کے علاوہ کسی اور سے کچھ بھی کہنا اس نے فی الحال مناسب نہیں سمجھا تھا۔

ریسٹ ہاؤس پہنچ کر فریش ہونے اور گھر والوں کو فون کرنے کے بعد ماہم تو بنا کچھ کھائے پیے لیٹ گئی تھی۔ لیکن باقی سب کھانا کھانے کے بعد اردگرد کا علاقہ دیکھنے کی نیت سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ساتھ آئے چپراسی اور دو تین اور ملازموں کو پرنسپل نے وہیں ریسٹ ہاؤس پہ رکنے کے لیے کہا تھا۔

"سب لڑکیاں ساتھ ساتھ رہیں۔ ادھر ادھر اکیلے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" پرنسپل نے باآواز بلند سب اسٹوڈنٹس کو ہدایت جاری کی تھی اور انابیہ کی نظریں بے اختیار بشریٰ اور نائمہ کی جانب اٹھ گئی تھیں، جواب تک تو سب کے ساتھ ساتھ ہی تھیں۔

"ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور بارے میں بات کررہی ہوں۔" ان کے چہروں سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے اس کی نظریں کلائی پہ بندھی گھڑی کی جانب اٹھی تھیں، جہاں ساڑھے چار بج رہے تھے۔ پرسوچ نظروں سے دونوں کو دیکھتے ہوئے، وہ اردگرد پھیلے خوبصورت نظاروں کی جانب متوجہ ہوئی تھی، جن کی کشش میں آسمان پہ تیزی سے چھائے بادلوں نے ڈھیروں اضافہ کردیا تھا۔

ٹھنڈی ہوائیں، پرکیف نظارے اور دوستوں کے ساتھ نے بہت جلد اسے بھی کچھ دیر کے لیے ہی سہی، ہر سوچ اور ہر فکر سے آزاد کردیا تھا۔

ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے وہ سب مگن سے آگے بڑھ رہے تھے جب اچانک بادل بڑی زور سے گرجے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے ننھی ننھی بوندیں برسنے لگی تھیں۔

"کم آن گرلز! واپس چلیں، اس سے پہلے کہ بارش تیز ہوجائے!" پرنسپل کی ہدایت پہ وہ بھی سب ٹیچرز کے ساتھ مل کے لڑکیوں کی جانب بڑھی تھی جو "میڈم پلیز ابھی نہیں" کی رٹ لگائے کسی طور واپس جانے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ اس دوران بوندیں پھوار میں تبدیل ہوگئی تھیں۔

بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں اضافہ ہوا تو ناچار لڑکیوں کو بھی اپنی ضد چھوڑ کے واپسی کی راہ لینی پڑی۔ آگے بڑھتی لڑکیوں میں انابیہ نے بشریٰ اور نائمہ کو تلاشنا چاہا تھا، مگر ایک تو وہ لڑکیوں کے پیچھے تھی اور دوسرا تیز ہوتی بارش کی وجہ سے سب ہی اتنا تیز چل رہے تھے کہ اس کے لیے دونوں کو ڈھونڈنا مشکل ہوگیا تھا۔

"ارے وہ دیکھو۔ وہ اوپر کی طرف کون جارہا ہے؟" نجانے کس کی آواز تھی، مگر گھبرا کر پلٹ کر دیکھنے والوں میں وہ سب سے پہلے تھی۔

"یہ تو بشریٰ اور نائمہ ہیں!" ایک اور آواز نے پہچان کا مرحلہ آن واحد میں طے کیا تو انابیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

وہاں موجود سارا گروپ اب باآواز بلند انہیں پکار رہا تھا، مگر وہ دونوں بنا پیچھے پلٹے تیز قدموں سے آگے بڑھتی جارہی تھیں۔

"یہ۔ یہ دونوں سن کیوں نہیں رہیں؟" میڈم نزہت نے پریشانی سے انابیہ کی جانب دیکھا۔ جو اپنا بدترین خدشہ سچ ہوتا دیکھ کے حواس باختہ سی آگے بڑھی تھی۔

"میڈم! آپ میرے ساتھ آئیں۔۔۔ زارا! تم سب نیچے جاؤ اور ٹیچرز میں سے کسی کو فوراً" واپس بھیجو۔" وہ رکے بنا پلٹ کر بولی تو میڈم نزہت انابیہ کے انداز سے کسی گڑبڑ کا احساس ہوتے ہی اس کے پیچھے لپکی تھیں۔ جبکہ زارا اور وہاں کھڑی لڑکیاں باقی سب کے جو کافی آگے نکل چکے تھے، پیچھے دوڑی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک بہت گھنے جنگل میں تنہا کھڑی سہمی ہوئی نظروں سے ہر سو پھیلتی تاریکی کو دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہی تھی۔ مگر نکلنے کا کوئی راستہ دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں اچانک "آپی آپی" کی پکار پہ وہ ایک پل کو ڈر کے رکی تھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ انابیہ کی آواز پہچانتے ہوئے دیوانہ وار آواز کی سمت دوڑی تھی۔

بھاگتے ہوئے درختوں کی سوکھی ٹہنیوں نے جگہ جگہ سے اس کے جسم اور چہرے کو چھیل ڈالا تھا، مگر وہ زخموں کی پرواہ کیے بنا بھاگی چلی جارہی تھی کہ معاً ٹہنیوں میں پھنسا کوئی کپڑا اس کے چہرے سے آکر ٹکرایا تھا اور وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ تیزی سے چلتی سانس کے ساتھ اس نے بغور اس کپڑے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کسی کا دوپٹا تھا۔ بے اختیاری کے عالم میں اس نے ہاتھ بڑھا کے اس پھنسے ہوئے دوپٹے کو آنکھوں کے قریب کیا تھا اور پھر بری طرح چونک گئی تھی۔

وہ انابیہ کے اس سوٹ کا دوپٹا تھا جو وہ پکنک پہ پہن کے گئی تھی۔

بری طرح روتے ہوئے اس نے اس دوپٹے کو درختوں کی شاخوں سے نکالنا چاہا تھا، لیکن اس کی اس کوشش میں الجھا ہوا دوپٹا جگہ جگہ سے پھٹنے لگا تھا۔ تب ہی کسی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دھیرے سے پکارا تھا۔ "مومنہ! اٹھو بیٹا نماز کا وقت نکل رہا ہے۔" اور وہ جو گہری نیند میں تھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

اس کا جسم دھیرے دھیرے لرز رہا تھا اور سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔

"کیا ہوا مومی بیٹا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" احسان صاحب بیٹی کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کے پریشان ہوگئے تھے۔

"بابا! میں نے بہت برا خواب دیکھا ہے۔ بہت برا!" روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے بے قراری سے باپ کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ پلیز بیہ کو واپس بلالیں۔ فوراً" بلالیں۔" آنسو بھری آنکھوں سے ان کی جانب تکتے ہوئے وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی تو پریشان سے احسان صاحب اس کے قریب بیٹھ گئے۔

"اللہ خیر کرے۔ تم اسے فون کرو ہم ابھی اس سے بات کرلیتے ہیں بیٹا۔" اور مومنہ نے سرعت سے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا موبائل اٹھاتے ہوئے انابیہ کا نمبر ملایا تھا۔ لیکن دوسری جانب مسلسل بیل جاتی سن کے اس نے کال کاٹتے ہوئے دوبارہ سے نمبر ملایا تھا۔ لیکن بے سود۔

"بابا۔ وہ۔ وہ فون نہیں اٹھا رہی۔" وہ روہانسی ہوتے ہوئے بولی تو احسان صاحب اس کا سر سہلاتے

ہوئے بولے۔

"وہ اٹھائے گی بیٹا۔ تم حوصلہ تو کرو۔ بلکہ ٹھہو میں ڈائری لاتا ہوں۔ اس میں ماہم کا نمبر ہے۔ ہم اسے کال کر کے دیکھ لیتے ہیں۔" وہ تیزی سے اٹھ کے باہر کی جانب بڑھے تو مومنہ نے اپنا سر تھام لیا۔

صبح جب انابیہ گھر سے نکل رہی تھی' تب ہی اسے عجیب سی گھبراہٹ نے آن گھیرا تھا جو پھر سارا دن اس کے دل پہ چھائی رہی تھی۔ لیکن جب دوپہر میں اس کا فون آیا تو اسے قدرے تسلی ہوئی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کے وہ بچوں کو لیے عادت کے مطابق سونے کے لیے لیٹ گئی تھی اور اسی دوران یہ عجیب و غریب خواب اسے دکھائی دیا تھا۔

"میری بہن کی حفاظت فرمانا میرے مولا!" آنکھیں موندے اس نے دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کو پکارا تھا۔ کہتے ہیں کہ فجر کے اور عصر کے وقت دیکھے گئے خواب سچے ہوتے ہیں اور مومنہ کو یہی خیال رہ رہ کے مزید پریشان کر رہا تھا۔



تیزی سے برستی بارش نے اوپر کو جاتے اس راستے پہ قدم جمانا بہت مشکل بنا دیا تھا' اس پہ مستزاد گھبراہٹ اور پریشانی۔ وہ اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ اپنی اس کوشش میں وہ کتنی ہی بار پھسل کر گرتے گرتے بچی تھی۔ جس کے نتیجے میں کئی چوٹیں ہاتھ پاؤں پہ لگی تھیں۔ لیکن اسے کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔

میڈم نزہت' جو کافی سینئر ٹیچر تھیں' ان کی ہمت تو کب کی جواب دے چکی تھی۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اور یہی چیز بشریٰ اور نائمہ کو بار بار پیچھے دیکھنے پہ مجبور کر رہی تھی۔

"نائمہ! جلدی کرو۔" پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہوئے بشریٰ گھبراہٹ بھرے لہجے میں نائمہ سے مخاطب ہوئی تھی۔ ان دونوں کی منزل اس راستے کے اختتام پہ اوپر موجود سڑک تھی' جہاں ان دونوں کے بوائے فرینڈز گاڑی لیے ان کے منتظر تھے۔

دراصل نائمہ کا اگلے ہفتے اپنے کزن سے نکاح ہونے والا تھا۔ لیکن چونکہ بشریٰ کے توسط سے اس کی دوستی بشریٰ کے خالہ زاد حارث سے ہو گئی تھی اس لیے نائمہ کو اپنے والدین کا یہ فیصلہ کسی طور قبول نہ تھا۔

سارے حالات کو دیکھتے ہوئے بشریٰ نے نائمہ کو گھر سے بھاگنے کا مشورہ دیا تھا۔ جسے نائمہ نے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد قبول کر لیا تھا۔

ان ہی دنوں کالج کی جانب سے یہ ٹرپ اناؤنس ہوا تھا اور ان دونوں کی جیسے ساری مشکل آسان ہو گئی تھی۔ بشریٰ نے حارث اور اپنے بوائے فرینڈ عماد کے ساتھ مل کر سارا پلان ترتیب دیا تھا۔ جس کے مطابق حارث اور عماد ایک دن پہلے ہی اسلام آباد پہنچ کر اس ریسٹ ہاؤس اور اردگرد کے علاقے کا اچھی طرح سے جائزہ لے چکے تھے۔ ان تینوں کی مہارت اور مضبوط پلاننگ نائمہ کو حیران کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی کامیابی کا بھی یقین دلا گئی تھی۔ وہ خوش تھی۔ بے حد خوش۔

ریسٹ ہاؤس پہنچ کر انہوں نے صرف ایک میسج کیا تھا اور لڑکوں نے انہیں سڑک تک پہنچنے کا ایک راستہ سمجھاتے ہوئے تسلی سے صحیح موقع ڈھونڈنے کو کہا تھا۔ کھانے کے بعد باہر گھومنے کا شور اٹھا تو بشریٰ نے نائمہ کو اشارہ کر دیا۔ اس کے نزدیک ڈھیروں لڑکیوں میں سے نظر بچا کے غائب ہونے کا یہ اچھا موقع تھا۔ بارش کی وجہ سے مچنے والی ہلچل کا ان دونوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتیں اگر جو پانچ چھ لڑکیوں کا یہ گروپ انہیں دیکھ نہ لیتا۔

ان سب کے پکارنے کے باوجود وہ دونوں نہیں رکی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ جب تک کسی کی سمجھ میں آئے گا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں؟ اور کیوں جا رہی ہیں؟ وہ سڑک تک پہنچ جائیں گی۔ لیکن برا ہو تیز ہوتی بارش

اور انابیہ احسان کا جو محض چند لمحوں کے توقف کے بعد ہی دیوانہ وار ان کی جانب دوڑ پڑی تھی۔ اسے مسلسل اپنے پیچھے آتا دیکھ کے دونوں کو پریشانی اور گھبراہٹ نے آن گھیرا تھا۔

"بشریٰ! میں مزید تیز نہیں چل سکتی۔" نائمہ نے ہانپتے ہوئے جواب دیا تو بشریٰ نے دانت پیستے ہوئے ایک نظر تعاقب کرتی انابیہ پہ ڈالی اور پلٹ کر نائمہ کا بازو دبوچتی اوپر کو بڑھنے لگی۔ وہ دونوں سڑک کے خاصی قریب پہنچ چکی تھیں۔ حارث اور عماد انہیں اوپر آتا دیکھ کر لپک کے آگے کو بڑھے تھے۔ مضبوطی سے ڈھلان پہ قدم جماتے ہوئے عماد نے بشریٰ کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے اوپر کھینچ لیا تھا۔

"یہ۔ یہ تمہارے پیچھے کون آرہا ہے؟" عماد کی نظر جونہی انابیہ پہ پڑی اس کی پیشانی پہ شکنیں نمودار ہو گئیں۔ اس کی بات پہ حارث نے بھی تیزی سے پلٹ کر نیچے دیکھا تھا۔

"ہے ہماری ایک ٹیچر' کمبخت نے دیکھ لیا ہے ہمیں۔" بشریٰ نے ہانپتے ہوئے کہا تو عماد نے پلٹ کر گہری نظروں سے اس نازک اور شفاف وجود کی جانب دیکھا جو بارش اور دشوار راستے کی پرواہ کیے بنا تیزی سے اوپر چڑھنے میں مصروف تھی۔

"اب دیکھ کیا رہے ہو' چلو نا!" عماد کو بت بنا دیکھ کے بشریٰ نے چڑ کر کہا تو عماد کی سوچ میں ڈوبی آنکھیں انابیہ سے ہٹ کر بشریٰ پہ آٹھہریں۔ اگلے ہی لمحے اس نے بشریٰ کی کلائی پکڑتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا۔

"اس ہیرے کو بھی کیوں نہ اپنے ساتھ لے چلیں۔" انابیہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تو بشریٰ نے ٹھٹھک کر نیچے کی جانب دیکھا۔

"لیکن اس نائمہ سے کیا کہیں گے؟" بشریٰ نے سوالیہ نظروں سے عماد کی طرف دیکھا۔

"وہ ہوش میں رہے گی تو اس سے کچھ کہیں گے نا۔"

"اسے تم گاڑی میں لے جا کے فرنٹ سیٹ پہ رکھی کولڈ ڈرنک پلاؤ۔ میں تب تک اسے قابو میں کرتا ہوں۔" اس کی بات پہ بشریٰ تیز قدموں سے حارث کے ساتھ کھڑی نائمہ کی جانب بڑھ گئی تھی اور پھر وہ دونوں اسے لے کر گاڑی کی طرف چلے گئے تھے۔

اس دوران انابیہ بھی گرتی پڑتی سڑک کے قریب پہنچ ہی گئی تھی۔ بشریٰ اور نائمہ کو کسی آدمی کا سہارا لے کر اوپر چڑھتے اس نے خود دیکھا تھا۔ اور اس کا دل ملال کے ساتھ ساتھ شدید غصے سے بھر گیا تھا۔

اپنے جسم کی پوری طاقت لگاتے ہوئے وہ آخری چند قدم اٹھاتی اوپر آئی تھی۔ اور پھر ایک پتھر کا سہارا لیتے ہوئے وہ سڑک کے کنارے پر چڑھ آئی تھی۔ پھولی سانس کے درمیان تھوک نگلتے ہوئے اس نے بے جان ہوتی ٹانگوں پہ بے اختیاری کے عالم میں ہاتھ رکھتے ہوئے بے چینی سے برستی بارش میں اپنے اردگرد دیکھا تھا اور جوں ہی اس کی نظر سڑک کے دوسری جانب قدرے آگے کو کھڑی گاڑی پہ پڑی تھی' وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوسرے کے بعد تیسرا قدم اٹھاتی' کسی نے اس کے وجود کو پیچھے سے جکڑ لیا تھا۔

چیختے ہوئے اس نے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش میں بھرپور مزاحمت کی تھی۔ لیکن اس مضبوط شکنجے سے نکلنا اتنا آسان نہ تھا۔ تب ہی ایک کپڑا ناک اور منہ پر مضبوطی سے جما دیا گیا تھا بری طرح مچلتے ہوئے اس نے اپنے منہ پہ جمے ہاتھ کو ہٹانا چاہا تھا۔ لیکن اس کی ہر کوشش آنکھوں کے آگے چھائے اندھیرے کے آگے دم توڑ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ماہم کا نمبر ملاتے ہوئے مومنہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے کال ریسیو کرتے ہی مومنہ نے بے قراری سے انابیہ کے بارے میں استفسار کیا تو جواباً" ماہم نے اسے ساری ٹیچرز کے ساتھ انابیہ کے باہر جانے کے متعلق بتاتے ہوئے ان سب کا حال

احوال دریافت کیا تھا۔ مومنہ کا انداز اسے بھی پریشان کر گیا تھا۔

انابیہ کی واپسی پہ رنگ بیک کروانے کا کہتے ہوئے ماہم فون بند کر کے باہر برآمدے میں آکھڑی ہوئی تھی۔ موسلادھار بارش اور آسمان پہ چھائے گہرے بادلوں نے دن کے اجالوں میں ہی ڈھلتی شام کا سماں بنا دیا تھا۔ موسم کے تیور دیکھتے ہوئے اسے پریشانی ہو رہی تھی کہ یہ سب اب تک لوٹے کیوں نہ تھے؟

چپراسی وغیرہ کو ان لوگوں کے پیچھے بھیجنے کا سوچتے ہوئے وہ قدرے ہٹ کر بنے سرونٹ کوارٹرز کی طرف جانے کو آگے بڑھی ہی تھی کہ دور موجود گیٹ سے بہت سی لڑکیاں اور ٹیچرز اندر داخل ہوئی تھیں۔ انہیں آتا دیکھ کے ماہم اپنی جگہ پر رک گئی تھی۔ لیکن جب کچھ ٹیچرز سرونٹ کوارٹرز کی جانب بھاگیں تو وہ بے اختیار چونک گئی۔

"کہاں رہ گئے تھے آپ لوگ؟" بارش میں شرابور وہ سب آگے پیچھے دوڑتی ہوئی برآمدے میں داخل ہوئیں تو ماہم اپنی جھنجلاہٹ ظاہر کیے بنا نہ رہ سکی۔

"غضب ہو گیا ماہم! وہ بشریٰ اور نائمہ نہیں ہیں۔ وہ دونوں نجانے کب اور کیسے سب سے چھپ کر ایک جانب کو بھاگے جا رہی تھیں کہ کچھ لڑکیوں اور انابیہ نے انہیں دیکھ لیا۔" اس کی کولیگ ارم تیزی سے اس کے قریب آتے ہوئے بولی تو ماہم کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔

"کیا؟"

"ہاں۔ انابیہ اور میڈم نزہت تو اسی وقت ان دونوں کے پیچھے بھاگی تھیں۔ لیکن ہم چونکہ آگے آگئے تھے۔ اس لیے ہمیں تھوڑی دیر میں پتا چلا۔ پتا لگتے ہی سعدیہ' حمیرا اور نادیہ کو پرنسپل نے ان کے پیچھے دوڑایا تھا اور اب فوراً" سرور وغیرہ کو بھیجنے کے لیے کہا ہے۔" ارم نے ساری تفصیل ماہم کے گوش گزار کی تو ماہم کا سر چکرا گیا۔

"تو کیا وہ پکڑی نہیں گئیں؟"

"کچھ پتا نہیں۔ ابھی تک ان کے پیچھے جانے والوں میں سے کسی کی بھی واپسی نہیں ہوئی۔" وہ پریشانی سے بولی تو ماہم نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا۔

"اوہ میرے خدا! یہ۔ یہ کیا ہو گیا؟" اس کا رنگ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اطلاع تھی یا کوئی بم جس نے "احسان ہاؤس" میں حشر برپا کر دیا تھا۔ انابیہ اپنی دو اسٹوڈنٹس کے ساتھ اچانک لاپتا ہو گئی تھی۔ کہاں؟ کیسے؟ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ان دو لڑکیوں کا تعاقب کرتے ہوئے اوپر کو جاتے راستے کی طرف گئی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔

اطلاع ملنے کے فوراً" بعد احسان صاحب تو اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ جبکہ تڑپتی ہوئی مومنہ پیچھے بچوں کے ساتھ اکیلی رہ گئی تھی۔ اس کا خواب ایک بھیانک حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

وہاں اس دوران پولیس بلوائی گئی تھی۔ جنہوں نے بروقت ایکشن لیتے ہوئے اردگرد کے علاقے کی چھان بین شروع کروانے کے ساتھ ناکہ بندی بھی کروا دی تھی۔ ضروری پوچھ گچھ اور زبان بندی کی سخت تاکید کے بعد تمام اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز کو واپس لاہور کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا۔ صرف کالج کی پرنسپل' وائس پرنسپل' چند ایک سینئر ٹیچرز اور میڈم نزہت وہاں رک گئی تھیں۔ میڈیا والوں کو اس نازک معاملے سے دور رکھنے کے لیے پرنسپل صاحبہ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا' تب کہیں جا کے وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئی تھیں۔

نائمہ کے والدین بھی اسلام آباد پہنچ گئے تھے۔ لیکن بشریٰ کے گھر والوں سے رابطہ کرنے میں وہ اگلی صبح تک ناکام رہے تھے۔ کالج میں لکھوایا گیا اس کا فون نمبر غلط تھا۔

اس حقیقت کے سامنے آتے ہی اسلام آباد پولیس نے لاہور پولیس سے رابطہ کرتے ہوئے بشریٰ نامی اس

لڑکی کے گھر جا کے ساری صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے کہا تھا۔

لیکن جب پولیس کالج سے اس کا ایڈریس لے کے مطلوبہ جگہ پہ پہنچی تو پتا چلا کہ وہ ایڈریس بھی غلط تھا۔

اس انکشاف نے جہاں سب کو چونکا دیا تھا وہیں احسان فاروق اور نائمہ کے گھر والے دل تھام کے رہ گئے تھے۔ ان کے لیے تو یہ تصور ہی سوہان روح تھا کہ ان کی بیٹیاں کسی حادثے کا شکار نہیں بلکہ شاید اغوا کی گئی تھیں۔

بشریٰ کی تلاش سارا دن جاری رہی تھی لیکن کہیں کوئی سراغ نہ ملا تھا۔

وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اور ان تینوں لڑکیوں کے ساتھ درحقیقت کیا ہوا تھا؟ ان میں سے کسی بھی سوال کا فی الحال کوئی جواب سامنے نہ آسکا تھا۔



انابیہ نے دھیرے دھیرے اپنی بوجھل آنکھیں کھولیں تو نظریں سیدھی چھت سے ہوتی ہوئی سامنے دیوار سے جا ٹکرائیں۔ لیکن وہ کتنی ہی دیر چت لیٹی ماؤف دماغ اور خالی نظروں سے اپنے سامنے دیکھے گئی۔

لیکن جوں ہی ذہن بیدار ہونے لگا' آنکھوں میں بھی پہچان کے رنگ واضح ہونے لگے۔ اجنبی در و دیوار کا احساس آنکھوں کے رستے ذہن تک پہنچا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

خوف زدہ نظروں سے اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے اس نے خود پہ پڑا کمبل ہٹاتے ہوئے تیزی سے اٹھنا چاہا تھا۔ لیکن ذہن پہ چھایا غبار اتنا کثیف تھا کہ وہ اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کی کوشش میں بری طرح لڑکھڑا گئی تھی۔

سر کو تھامتے ہوئے وہ اگلے ہی پل بیڈ پہ واپس بیٹھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ دکھتے سر کو دباتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنی آنکھیں ایک لمحے کو بند کی تھیں اور پورا واقعہ اپنی جزئیات سمیت اس کے ذہن کی اسکرین پہ روشن ہو گیا تھا۔

ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولتے ہوئے اس نے وحشت بھری نظروں سے اپنے اردگرد دیکھا تھا۔

"میں۔ میں تو وہاں بارش میں بشریٰ اور نائمہ کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ پھر یہ؟ یہ بھلا کون سی جگہ ہے؟" تیز ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ اس نے اس پر تعیش کمرے کو دیکھا تھا۔ تب ہی اسے اپنے وجود کا پیچھے سے جکڑے جانا اور کسی کا اس کے منہ پہ کپڑا رکھنا یاد آیا تھا۔ اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔

"تو کیا۔ م۔ مجھے۔ اغ۔ اغوا کر لیا گیا ہے؟" بے جان ہوتے وجود کے ساتھ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے چاروں طرف بے یقینی سے دیکھا تھا۔

"میں۔ میں اغوا ہو گئی ہوں؟ نن۔ نہیں نہیں!" نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ دیوانہ وار اٹھ کے دروازے کی جانب دوڑی تھی۔ پاگلوں کی طرح ہینڈل گھماتے ہوئے اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اسے بند پا کے بری طرح پیٹ ڈالا تھا۔

"کھولو! دروازہ کھولو۔ خدا کے لیے دروازہ کھولو پلیز۔ ہائے میرے اللہ! یہ... یہ کیا ہو گیا میرے ساتھ!" دونوں ہاتھوں سے ہینڈل تھامے وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی زمین پہ گرتی چلی گئی تھی۔



تھکا ہارا وہ جس وقت گھر لوٹا' گھڑی رات کے دو بجا رہی تھی۔ سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا تھا' سوائے پورچ اور لان کے' جس کی لائٹس اس کے لیے کھلی رہنے دی گئی تھیں۔

گاڑی کھڑی کر کے وہ چوکیدار کو تمام بتیاں بند کرنے کی ہدایت دیتا اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ لاؤنج کے داخلی دروازے کو لاک کر کے وہ اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ گھڑی' موبائل' والٹ نکال کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے وہ بیڈ پہ بیٹھ کر جوتے اتار رہا تھا' جب اس کا موبائل دھیمے سُروں میں بجنے لگا تھا۔ ایک نظر گھڑی

پہ ڈالتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کے موبائل اٹھاتے ہوئے اسکرین کی جانب دیکھا تھا جہاں نیازی صاحب کا نام جگمگاتا دیکھ کے وہ یکدم الرٹ ہو گیا تھا۔

"السلام علیکم سر!" فون کان سے لگاتے ہوئے وہ مستعد لہجے میں بولا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ آواز سے تو نہیں لگ رہا کہ تم سو رہے تھے۔ لیکن پھر بھی پوچھ لیتا ہوں میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" نیازی صاحب نے اپنے مخصوص شگفتہ لہجے میں استفسار کیا تو تیمور کے لب دھیرے سے مسکرا دیے۔

"ناٹ ایٹ آل سر۔ ان فیکٹ میں ابھی گھر آیا ہوں۔ آپ سنائیں سب خیریت تو ہے؟"

"ہاں خیریت ہی ہے۔ بس تمہیں ایک ضروری بات بتانا تھی۔" وہ سنجیدگی سے بولے تو تیمور کے چہرے پہ بھی سنجیدگی در آئی۔

"جی سر!"

"ایسا ہے کہ کل لاہور کے ایک گرلز کالج کی ٹیچرز اور اسٹوڈنٹس ٹرپ پہ یہاں آئی تھیں۔ ان کا اسٹے (قیام) شہر سے باہر خواجہ صاحب کے ریسٹ ہاؤس میں تھا۔ لیکن شام میں وہاں سے دو اسٹوڈنٹس اور ایک ٹیچر اچانک کہیں غائب ہو گئیں۔ پرنسپل نے پولیس کو کال کیا' جنہوں نے آنے کے بعد اردگرد کے علاقے کی چھان بین بھی کی اور شہر سے باہر جانے والے راستوں کی ناکہ بندی بھی کروا دی' لیکن تینوں کا کہیں پتا نہیں چلا۔ خواجہ صاحب چونکہ پرنسپل کے رشتے دار تھے اس لیے دونوں نے مل ملا کے بات کو میڈیا تک نہیں پہنچنے دیا۔

لیکن پھر پتا چلا کہ ان میں سے ایک اسٹوڈنٹ جو حال ہی میں ٹرانسفر ہو کے اس کالج میں آئی تھی' اس کا نام اور ایڈریس دونوں غلط تھے۔ اس بات کے سامنے آتے ہی آج سارا دن لاہور پولیس اس لڑکی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ پھر رات تقریباً گیارہ بجے مجھے آئی جی صاحب کی لاہور سے کال آئی۔ انہوں نے

مجھے ساری بات بتاتے ہوئے اس معاملے کو اپنے طور پر دیکھنے کے لیے کہا۔ میں نے انہیں تو نہیں بتایا لیکن ان کی بات سن کے مجھے تمہاری بتائی ہوئی تفصیل یاد آئی تھی۔ تم نے اس دن بتایا تھا نا کہ اس گروہ کے ایجنٹ گرلز کالجز اور وومن ہاسٹلز کے اندر تک گھسے ہوئے ہیں؟"

"جی سر!"

"تو بس مجھے لگتا ہے اس لڑکی کا تعلق اسی گروہ سے ہے۔ اور یہ ان ہی کا کام ہے۔ تم کیا کہتے ہو؟" انہوں نے تیمور کی رائے جاننا چاہی۔

"میں بھی آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ یہ ان ہی کا کام لگتا ہے۔" اس نے نیازی صاحب کی تائید کی۔

"پھر اب کیا کیا جائے؟" انہوں نے سوال کیا۔

"آپ مجھے دو دن دیں' میں پتا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" تیمور نے پرسوچ انداز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم دیکھ لو۔ ویسے تم لوگوں کا پلان آف ایکشن تو تیار ہے نا؟"

"جی سر! ہم کل آکر اسے آپ سے ڈسکس کرنے والے تھے۔ لیکن اب اس نئے مسئلے کی وجہ سے ہمیں چند دن مزید رکنا پڑے گا۔" تیمور نے انہیں مطلع کیا تو اجمل نیازی تشویش سے بولے۔

"یہ تاخیر تمہارے لیے کوئی مسئلہ تو نہیں کھڑا کردے گی؟ میرا مطلب ہے اتنی محنت پر کہیں پانی نہ پھر جائے۔"

"نو سر! آپ بے فکر رہیں۔ کیس پوری طرح سے میرے ہاتھ میں ہے۔" تیمور مطمئن سا بولا تو اجمل صاحب بھی پرسکون ہوگئے۔

"ویٹس گڈ۔ چلو پھر جیسے ہی کوئی بات پتا چلے تو مجھے انفارم کرنا۔"

"جی سر۔۔۔ او کے۔ اللہ حافظ!" الوداعی کلمات کہتے ہوئے تیمور فون بند کرتا اس ساری بات پہ از سر نو غور کرتے ہوئے اپنے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا؟" احسان صاحب کی بات پہ فون کان سے لگائے کھڑی مومنہ کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔ رنگ یک لخت لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹا! اب تک جو بھی ثبوت سامنے آئے ہیں اس سے تو یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ انابیہ اور اس بچی نائمہ کو اغوا کیا گیا ہے۔ اور وہ لڑکی بشریٰ ان کے اس اغوا میں ملوث ہے۔" احسان صاحب دل گرفتی سے بولے تو مومنہ تڑپ اٹھی۔

"لیکن آپ نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" اس کے آنسوؤں میں شدت در آئی۔

"اس لیے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ محض مفروضوں کو تم تک پہنچا کر میں تمہیں مزید پریشان کروں۔ لیکن جب آج بھی سارا دن لاہور میں پولیس کو اس لڑکی' بشریٰ کے بارے میں کوئی سراغ نہ مل سکا تو یہاں ایس پی صاحب نے ہمیں صاف کہہ دیا کہ یہ کسی حادثے کا کیس نہیں بلکہ اغوا کا کیس ہے۔" احسان فاروق بوجھل لہجے میں بولے تو مومنہ کے لیے مزید اپنی ٹانگوں پہ کھڑے رہنا ممکن نہ رہا۔ زار و قطار روتے ہوئے وہ پاس پڑے کاؤچ پہ گر سی گئی۔

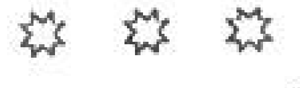
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا۔ ہماری بیبہ اغوا۔۔۔ یا اللہ! ہم کیا کریں گے۔ یہ۔ یہ کیا ہوگیا بابا!" بے ربط جملوں کے درمیان انہیں پکارتی وہ دھاڑیں مار مار کر رو پڑی تو دوسری جانب احسان صاحب کی اپنی آنکھیں بھی چھلک اٹھیں۔

"چپ ہو جاؤ بیٹا۔ چپ ہو جاؤ۔ بچوں نے تمہیں یوں روتے دیکھا تو پریشان ہو جائیں گے۔"

"کیسے چپ ہو جاؤں بابا؟ ہم سب تو مر جائیں گے اگر بیبہ نہ ملی۔ آپ۔ آپ پلیز اسے کہیں سے بھی ڈھونڈ کر لے آئیں نا۔ اپنے کسی دوست' جان پہچان والے کسی سے بات کریں۔ کچھ کریں بابا' نہیں تو میرا دل بند ہو جائے گا!" دہشت زدہ سی ہو کر بولتی وہ آخر میں پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تو احسان فاروق سے مزید اس کا تڑپنا برداشت نہ ہو سکا۔

ریسیور واپس رکھتے ہوئے انہوں نے شدید بے بسی کے عالم میں دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا تھا۔

"یا اللہ! میرے بڑھاپے پہ رحم فرمانا' میری بچی کی جان اور عصمت کی حفاظت فرمانا میرے مولا' نہیں تو میں مر جاؤں گا' مر جاؤں گا!" زار و قطار روتے ہوئے انہوں نے دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کو پکارا تھا۔



سارا دن گزر گیا تھا۔ اسے بھوکے پیاسے' روتے اور چلاتے ہوئے لیکن کسی نے دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ یوں جیسے اس کے اردگرد کوئی ذی نفس موجود نہ ہو۔ اب تو انابیہ کی ہمت اور گلا بھی جواب دے گئے تھے۔ رو رو کے آنکھیں اتنی سوج گئی تھیں کہ کھولنا محال ہو رہا تھا۔

دبیز قالین پہ گری وہ نڈھال سی ٹانگوں کے گرد بازو لیے گھٹنوں پر پیشانی ٹکائے ہوئے تھی۔ شل ہوتا دماغ اس پل عجیب سوئی جاگی سی کیفیت کا شکار ہو رہا تھا۔ جب گھڑی کی ٹک ٹک کے درمیان ایک "ٹک" اور ہوا تھا۔ مگر اس کی سماعتوں نے اسے محسوس نہیں کیا تھا۔

لیکن جوں ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اس نے ماہی بے آب کی طرح تڑپ کر سر اٹھایا تھا اور اپنے سامنے دو مردوں اور ایک عورت کو پا کے اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا۔

"ک۔ک۔ کون ہو تم لوگ؟ اور مجھ۔ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" خوف زدہ نظروں سے ان کی جانب تکتے ہوئے اس نے سہمے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسے جواب دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ بلکہ وہ تینوں ہی خاموش کھڑے تولتی نظروں سے اس کا جائزہ لیتے رہے تھے۔

ان کی آرپار ہوتی نگاہوں نے انابیہ کے خوف میں اضافہ کرتے ہوئے اسے خود میں سمٹنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ تب ہی قیمتی لباس اور زیورات سے سجی سامنے کھڑی اس عورت کے وجود میں حرکت ہوئی تھی اور انابیہ کی ڈری سہمی نظریں لحظہ بہ لحظہ اپنی جانب آتی اس عورت پہ جم گئی تھیں' جو اس کے بے حد قریب آکے رک گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنے ہیروں اور موتیوں سے سجے ہاتھ میں پکڑے نفیس سے پرس کو کھول کے اس میں سے ہزار ہزار کے کئی نوٹ نکالے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہیں انابیہ کے سر پہ سے وار کر پیچھے کھڑے آدمیوں میں سے ایک کے ہاتھ پہ رکھ دیا تھا۔ وہ اس عنایت پہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

"مان گئے عماد جان! یہ تو واقعی ہیرا ہے ہیرا!" اس نے مسکراتے ہوئے جھک کر انابیہ کی ٹھوڑی چھونا چاہی تو وہ جو اب تک اس کی حرکت پہ حیران پریشان بت بنی بیٹھی تھی' غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے رخ پھیر گئی۔ مگر وہ عورت اس کی حرکت کا برا مانے بنا یونہی مسکراتی ہوئی سیدھی ہوتی اس لڑکے کی جانب پلٹ گئی تھی۔

"ایسا کرو' اس دوسری لڑکی کو آگے روانہ کردو اور جہانگیر سے کہہ دو کہ خانم نے اسے اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔" وہ اس لڑکے سے مخاطب ہوئی تو انابیہ کا خوف وحشت میں بدل گیا۔ اس عورت کا انداز' لباس ہر چیز چیخ چیخ کر جس بات کا اعلان کر رہی تھی' اسے سوچ کر ہی خون اس کی رگوں میں منجمد ہونے لگا تھا۔ یہ کن لوگوں کے درمیان آپھنسی تھی وہ۔ بے اختیار اسے اپنے پیٹ میں گرہیں سی پڑتی محسوس ہوئی تھیں جبکہ آنکھیں مارے وحشت کے اس عورت کی پشت پہ جم گئی تھیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے خانم! لیکن جہانگیر صاحب نے کہا ہے کہ آگے لڑکیوں کی زیادہ ضرورت ہے۔"

"اس کی ضرورت صرف دھندا ہے چاہے وہاں ہو یا یہاں۔ اس لیے جیسا کہا ہے ویسا کرو۔" اس کی بات کے جواب میں وہ قدرے رعب سے بولی تو سامنے کھڑے لڑکے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جبکہ لفظ "دھندا" کوڑے کی صورت انابیہ کے وجود پہ برس کر اسے چلانے پر مجبور کر گیا۔

"خبردار! جو تم میں سے کسی نے مجھ پہ غلط نگاہ بھی ڈالنے کی کوشش کی۔ میں تم لوگوں کی آنکھیں نوچ لوں گی۔ سمجھے!" پھر کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے وہ بے خوفی سے انگلی اٹھاتے ہوئے بولی تو فیروزہ کے چہرے پہ اک طنزیہ مسکراہٹ در آئی۔

"تمہارا یہ نڈر انداز اچھا لگا۔ لیکن کیا ہے میری جان! کہ تمہارا یہ حوصلہ اور ہمت تمہیں پہلے ہی کافی مہنگا پڑ چکا ہے۔ اس لیے اپنی مشکلات میں مزید اضافہ مت کرو۔ فیروزہ نے تو اچھے اچھوں کے کس بل نکال دیے ہیں۔ پھر تم تو بہت دھان پان سی گڑیا ہو میری جان!" ہاتھ بڑھا کے اس کے چہرے پہ بکھری لٹیں نرمی سے اس کے کان کے پیچھے اڑستے ہوئے وہ انتہائی سرد نظروں سے انابیہ کو گھورتے ہوئے بولی تھی۔

لیکن انابیہ نے اس کی دھمکی کو خاطر میں لائے بنا ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میں اپنی جان دے دوں گی۔ مگر تمہیں تمہارے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔" بھرائی ہوئی آواز میں وہ بے اختیار چلا اٹھی تھی۔

"چلو تو تم اپنی جان دینے کی تیاری کرو اور میں اپنے ارادوں کو تکمیل تک پہنچانے کا بندوبست کرتی ہوں۔ دیکھتے ہیں، کس کی ہار ہوتی ہے۔" وہ اک تمسخرانہ مسکراہٹ اس کی جانب اچھالتی، دروازے کی طرف بڑھ گئی تو قدرے فاصلے پہ کھڑا وہ لڑکا بھی طنزیہ ہنکارا بھرتا اس کے پیچھے نکل کر دروازہ لاک کر گیا۔

اور انابیہ احسان جو اب تک خود کو بہت مشکل سے سنبھالے ہوئے تھی، بھربھری ریت کی مانند زمین پہ گرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دستک دے کے کوئی اندر چلا آیا تھا اور تیمور جو بریف کیس پہ جھکا فائلز چیک کر رہا تھا، صبح صبح اپنے سامنے ماہین ضیا کو پا کے کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مگر اپنے تاثرات اس نے چہرے پہ نہیں آنے دیے تھے۔

"ہیلو، کیسے ہو؟" خوشگوار سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے وہ اس کے قریب چلی آئی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ، صبح صبح کیسے آنا ہوا؟" وہ ہاتھ میں پکڑی فائل پلٹ کے بریف کیس میں رکھتے ہوئے بولا تو ماہین اس کی چوڑی پشت کو میٹھی میٹھی نظروں سے تکتے ہوئے بولی۔

"تمہارے لیے۔" اس کے جواب پہ تیمور نے رخ موڑ کے دایاں ابرو اچکاتے ہوئے سنجیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ یک لخت گڑبڑا سی گئی۔ "میرا مطلب ہے تمہارے لیے اسپیشل ناشتا بنا کر لائی ہوں۔۔۔۔"

"ناشتا؟ اور وہ بھی تم بنا کر لائی ہو؟ خیر تو ہے، یہ آج تم نے کچن کو کیسے رونق بخش دی؟" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔

"بس یونہی دل کر رہا تھا۔" وہ چاہ کر بھی "تمہارے لیے کچھ خاص کرنے کو" کا اضافہ نہیں کر سکی تھی۔ حالانکہ وہ اچھی خاصی بولڈ اور پراعتماد لڑکی تھی۔ بات کرنے سے پہلے سوچنا اس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ نہ ہی ان کا لائف اسٹائل سوچنے اور تولنے کے گرد گھومتا تھا۔ لیکن تیمور کا مزاج اور خاص کر حالات کا تقاضا اسے اس کے سامنے سنبھل کر رہنے پر مجبور کرتے تھے۔ اگر جو پھپھو (تیمور کی ممی) کی سپورٹ نہ ہوتی تو وہ نجانے کب کی اس محاذ پر ہار مان چکی ہوتی۔ لیکن ایک اس کی شیریں پھپھو اور دوسرے اس کے پاپا، جو ہر حال میں یہ رشتہ جوڑنا چاہتے تھے۔ باوجود اس کے کہ تیمور کو اول روز سے یہ پرپوزل قبول نہ تھا اور اب تو وہ سرے سے شادی سے ہی انکاری تھا، مگر پھر بھی یہ دونوں بہن بھائی کسی طور بھی اس خیال کو نہ اپنے دل سے نکالنے کے لیے تیار نہ تھے اور نہ ہی ماہین کو حوصلہ ہارنے دیتے تھے۔ جبکہ خود ماہین کو بھی کسی طرح یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہ آ رہی تھی۔ تیمور کی ذات پچھلے چار سال سے جس خول میں مقید تھی، اس پہ کوئی اسم کام کرتا کم از کم اسے تو نظر نہیں آ رہا تھا۔

"چلو ڈیٹس گڈ۔ لیکن تم نے خواہ مخواہ زحمت کی۔ تمہیں معلوم تو ہے کہ میں صبح ناشتے میں سوائے جوس کے اور کچھ نہیں لیتا۔" وہ بریف کیس بند کر تا پلٹ کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا تو ماہین کے جذبات پہ اوس سی گر گئی۔

"ہاں، وہ تو ٹھیک ہے، لیکن کبھی کبھی تو روٹین چینج کی جا ہی سکتی ہے۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی تو تیمور آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو دیکھتے ہوئے متاسف سا ہو گیا۔

نجانے کیوں ممی اور ماموں اس اچھی سی لڑکی کی زندگی اور ذہن دونوں خراب کرنے پہ تلے ہوئے تھے۔ حالانکہ ممی اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ وہ ماہین تو کیا کسی بھی لڑکی سے شادی کے لیے تیار نہیں۔ لیکن وہ نجانے کس آس پہ یہ سب کر رہی تھیں اور تیمور جو ماں سے پہلے ہی شرمندہ تھا، انہیں کھل کر کبھی نہیں بتا سکا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے پچھلے غلط فیصلے کے پچھتاوے سے نکل نہیں پایا تھا۔ پھر بھلا وہ کس کی زندگی کو اپنی ذات کے ادھورے پن کی نذر کر کے نئے پچھتاووں اور شرمندگی کو کیسے خرید سکتا تھا؟ وہ جانتا تھا کہ اصولاً "اب اسے اپنی ماں کی دلی خواہش کا احترام کرنا چاہیے کہ وہ اب اس کا حق رکھتی تھیں، لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو ختم ہو چکا تھا۔ مر چکا تھا۔ جس میں کسی کو بھی دینے کے لیے کچھ نہ بچا تھا اور یہ اس جیسے کھرے بندے کے نزدیک آنے والی کے ساتھ بہت بڑی زیادتی تھی، جس کا کم از کم وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"روٹین چینج کی جا سکتی ہے لیکن فطرت نہیں۔ اور ماہین! میری یہ فطرت ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا، کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ تم میری بہت اچھی کزن ہو۔ اس لیے میری تم سے ریکویسٹ ہے کہ تم اپنی زندگی کا کوئی بہتر اور اچھا فیصلہ کر لو، میں حقیقتاً" تمہارے تو کیا کسی بھی لڑکی کے قابل نہیں۔" دھیرے دھیرے بولتا وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تو ماہین کی بے یقین آنکھیں اس کے وجیہہ چہرے پہ جم سی گئیں۔

تیمور نے آج پہلی بار اپنا انکار واشگاف الفاظ میں اس کے سامنے بیان کیا تھا اور آج پہلی ہی بار ماہین ضیاء کو اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا تھا کہ اس کے لیے اس شخص کو کھونا آسان نہ تھا۔

اس کے کٹیلے لفظوں کی دھار دل کو زخمی کرنے لگی تو بے اختیار ماہین کی آنکھیں بھر آئیں۔ جنہیں دیکھ کر قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی تیمور کو اپنا آپ اس کا مجرم لگنے لگا۔ بے اختیار ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے ماہین کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ آہستگی سے اس کا ہاتھ جھٹکتی، پلٹ کر تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھ گئی اور پیچھے کھڑا بے بس سا تیمور فقط لب بھینچ کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

دوسرا دن شروع ہو چکا تھا، لیکن کوئی معجزہ رونما نہیں ہوا تھا۔ لڑکیوں کا کہیں کوئی سراغ نہ مل سکا تھا۔ احسان صاحب سخت پریشانی کے عالم میں وہیں اسلام آباد میں تھے۔ ساری زندگی ایک استاد کی حیثیت سے جو نیک نامی اور عزت کمائی تھی، وہ انہیں بدنامی کے شعلوں کی نذر ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چاہ کر بھی کسی سے کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ بیٹی جیسا نازک اور حساس معاملہ تھا، وہ بھلا کس منہ سے کسی اپنے یا پرائے سے مدد طلب کرتے؟ وہ تو پرنسپل صاحبہ اور خواجہ صاحب کے بھی بے حد شکر گزار تھے جنہوں نے اپنا سارا اثر ورسوخ لگاتے ہوئے بات کو میڈیا والوں کے ہاتھ لگنے سے بچا لیا تھا۔ ورنہ تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتے۔

ادھر لاہور میں تنہا مومنہ کی جان پہ بنی ہوئی تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد احسان صاحب نے مومنہ سے مشورہ کر کے اپنے بڑے بھائی سے فون پہ بات کی تھی اور انہیں روتے ہوئے مکمل خاموشی کے کتنے ہی واسطے دے کر فوراً" پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ سب سے زیادہ پریشانی انہیں انابیہ کے سسرال کی جانب سے تھی۔ ڈاکٹر عمر سے اس کی منگنی ہوئے ابھی محض دو ماہ ہی ہوئے تھے۔

وہ پہلے ہی ایک بیٹی کے اجڑنے کا غم جھیل چکے

تھے' ایسے میں دوسری کی بربادی اور بدنامی وہ شاید کسی طور برداشت نہ کرپاتے۔

☆ ☆ ☆

اسے اس خوبصورت قید خانے میں قید ہوئے کتنے گھنٹے گزر چکے تھے' اتابیہ کو اندازہ نہ تھا۔ لیکن کل رات اس کی زندگی کی بھیانک ترین رات بن کے گزری تھی۔

گھنگھروؤں اور سازوں کی آواز تلے وہ ساری رات چیخیں مار مار کے روتی رہی تھی اور اپنے رب کو مدد کے لیے پکارتی رہی تھی۔ دیوانہ وار اٹھ کر اس نے کتنی ہی بار کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ لیکن نہ تو فرار کی کوئی راہ سجھائی دی تھی اور نہ ہی کوئی ایسی چیز دکھائی دی تھی جسے اپنے اندر تک اتار کر وہ اس گھٹیا عورت سے لگی شرط ہی جیت جاتی۔ اسی وحشت کے عالم میں اس نے ملازمہ کے لائے ہوئے کھانے کو اٹھا کر دور پھینک دیا تھا۔

خدا خدا کرکے اس اذیت ناک رات کا اختتام ہوا تو وہ نڈھال سی وضو کرکے اپنے رب کے حضور سجدے میں گر گئی تھی۔ گڑگڑاتے ہوئے اس نے اپنے لیے غیب سے مدد مانگی تھی اور پھر یونہی روتے اور دعائیں مانگتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی' اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

☆ ☆ ☆

"خانم! اس کا جلد از جلد کوئی نہ کوئی بندوبست کریں۔ پورے شہر کی پولیس حرکت میں آئی ہوئی ہے۔ مت پوچھیں ہم نے کس مشکل سے بشریٰ اور نائمہ کو کراچی کے لیے روانہ کیا ہے۔" اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں گونجتی مردانہ آواز اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی پیدا کرگئی۔ دم سادھے اس نے بامشکل تمام بند پلکوں کو جنبش سے روکا تھا۔ اور سوتی بن کر ان کی گفتگو سننے لگی تھی۔

"جانتی ہوں۔ اسی لیے سوچ رہی ہوں کہ آج رات ہی اس کا کام تمام کردوں۔ ایک بار پر کٹ گئے تو خود ہی کہیں جانے کے قابل نہیں رہے گی۔" فیروزہ کی سرد آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اتابیہ کے اندر طوفان برپا ہوگیا۔

"نن نہیں۔ یااللہ! مجھے موت دے دے' اس پامالی سے بہتر ہے کہ تو مجھے اس دنیا سے اٹھالے میرے مولا!"

"تم ایسا کرو کہ نوری سے کہو کہ وہ حسنی صاحب کو فون کرکے میری طرف سے آج کی خاص محفل میں بطور مہمان خصوصی مدعو کرے۔ مجھے یقین ہے یہ رئیس زادہ ہی اس ہیرے کی صحیح قیمت ادا کرسکے گا۔" فیروزہ کا مسکراتا لہجہ اتابیہ کے جسم کا سارا خون نچوڑ لے گیا تھا۔ ذلت و رسوائی تلوار بن کے اس کے سر پہ لٹک رہی تھی اور کوئی جائے پناہ دور تک نظر نہیں آرہی تھی۔

"میرے خیال میں آپ اس سے خود بات کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اتنی موٹی آسامی سے لاپروائی برتنا ٹھیک نہیں۔" وہی مردانہ آواز ایک بار پھر ابھری۔

"ہوں۔۔۔ ٹھیک کہہ رہے ہو۔" جواباً" فیروزہ کی پرسوچ آواز آئی تو اتابیہ کے ہاتھوں میں نمی اتر آئی۔ "چلو میں جاکے فون کرتی ہوں۔ تم ایسا کرو کہ بے حد شان دار محفل کا اہتمام کرو۔ حسنی خود تو پیتا نہیں لیکن باقی سب کے لیے اے۔ ون قسم کے برانڈ منگوانا۔" وہ شاید اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"بہتر۔ ویسے کتنی عجیب بات ہے نا خانم کہ اس حسنی کو شباب کا تو شوق ہے لیکن شراب کا نہیں۔" اس آدمی نے حیرت بھری آواز میں کہا تو فیروزہ ہنس دی۔

"اب تک تو شباب کو بھی دور دور سے ہی دیکھتا رہا ہے۔ عجیب مغرور بندہ ہے۔ آج دیکھتی ہوں اس پری وش کی تاب کیسے لاتا ہے۔" وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے شاید دروازے کی جانب بڑھے تھے' کیونکہ ان کی آوازیں قدرے دور ہوگئی تھیں۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی تو اتابیہ نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے وحشت بھری نظروں سے اپنے اردگرد دیکھا تھا اور خود کو ہر طرح سے بے دست و پاپاکے ایک بار پھر زارو قطار رونا شروع کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

آفس میں مختلف کام نپٹاتے ہوئے تیمور کے ذہن میں مسلسل ایک کھچڑی سی پک رہی تھی۔ اس نے نیازی صاحب سے کہہ تو دیا تھا کہ وہ غائب ہونے والی لڑکیوں کے بارے میں پتا لگوانے کی کوشش کرے گا' لیکن اب کوئی مناسب اور کارگر قسم کا لائحہ عمل اسے سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اس سلسلے میں باری سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن تب ہی ایک چونکا دینے والی بات ہوئی تھی اور اس کی مشہور زمانہ چھٹی حس نے اسے الرٹ کردیا تھا کہ ہو نہ ہو اس کا تعلق ان لڑکیوں سے ہے۔

دل ہی دل میں اپنے اندازے کے درست ہونے کی دعائیں کرتے ہوئے وہ چند ایک ضروری کام نپٹاتا' اٹھ کر نیازی صاحب کے کمرے کی طرف چلا آیا تھا۔ اسے ان لڑکیوں کا بائیوڈیٹا بمع تصاویر کے فوری مطلوب تھا۔ لیکن آگے نیازی صاحب کو نہ پاکے وہ سخت بدمزہ ہوا تھا۔ وہ آج دوپہر سے ایک میٹنگ کے سلسلے میں پی ایم صاحب کے آفس گئے ہوئے تھے۔ ان کی واپسی کا کچھ پتا نہ تھا۔

ان کی غیر موجودگی نے اس کا آسان ہوتا کام ایک بار پھر خاصا مشکل بنا دیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے پاس وقت نہ تھا' اس لیے اس نے سب کچھ اللہ پہ چھوڑتے ہوئے اپنی عقل کے سہارے ان انجان لڑکیوں کا سراغ لگانے کی ٹھانی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ جب سے یہاں آئی تھی' رزق کا ایک دانہ بھی اس کے منہ میں نہیں گیا تھا۔ اس پہ مستزاد ذہنی دباؤ اور دن رات کا رونا۔ وہ اتنی نقاہت محسوس کررہی تھی کہ سر اٹھانا محال ہوگیا تھا۔ جبکہ اسے اپنی حفاظت کے لیے ہمت اور طاقت کی ضرورت تھی۔ اس حقیقت کا احساس ہوتے ہی اس نے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیتے ہوئے ملازمہ کا لایا ہوا کھانا خاموشی سے کھالیا تھا۔

اسے یوں چپ چاپ کھانا کھاتے دیکھ کے ملازمہ کے چہرے پہ اک طنزیہ مسکراہٹ در آئی تھی اور وہ اس بات کی اطلاع خوشی خوشی خانم کو دینے چل پڑی تھی۔

کھانا کھا کے نڈھال ہوتے وجود میں کچھ طاقت آئی تو گرتے ہوئے حوصلے بھی نئے سرے سے بلند ہوگئے۔ منہ ہاتھ دھو کے وہ اپنے بال سمیٹتی کمرے میں چلی آئی تھی اور پھر اس نے پورے کمرے کا از سر نو جائزہ لینا شروع کیا تھا۔

کھڑکی پہ پڑے پردے ہٹاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر بڑے سے سلائیڈنگ شیشے کے پار دیکھا تھا جہاں ایک دو فٹ کے فاصلے سے سامنے لوہے کا سرخ پینٹ شدہ اونچا سا شٹر اس طرح سے لگا ہوا تھا کہ اس کے درمیان موجود درزوں میں سے روشنی اور ہوا تو اندر آسکتی تھی' لیکن باہر دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ اور چونکہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا تو اتابیہ کے لیے یہ اندازہ لگانا بھی ممکن نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور اردگرد کیا ہے۔ حالانکہ کمرے کی بناوٹ اور آرائش بالکل جدید طرز کی تھی جسے دیکھ کر با آسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ کمرہ کسی اچھے خاصے بڑے گھر کا حصہ تھا۔ ایسے میں کھڑکی کے آگے یہ بڑا سا عجیب شٹر یقینا" حفاظت کے لیے لگایا گیا تھا اور اس کو پار کرنا ناممکن تھا۔

بے بس نظروں سے اسے دیکھتی وہ پلٹ کر ایک بار پھر کمرے کے وسط میں آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کی بے حد پریشان نظریں گھڑی کی طرف اٹھیں تو دل دھک سے رہ گیا۔ شام کے چھ بجنے کو تھے اور اسے اس جہنم سے نجات حاصل کرنے کی کوئی راہ نہیں ملی تھی۔

لب کاٹتے ہوئے اس نے بے چینی سے اپنے اردگرد دیکھا تو نگاہیں بے اختیار سامنے سجے کرسٹل پیس سے جا ٹکرائیں۔ یک لخت ایک خیال کوندے

کی مانند لپک کر اس کی مایوس آنکھوں میں چمک سی بھر گیا۔ یہ سوچ اسے پہلے کیوں نہیں آئی تھی؟ اسے یہاں سے تو ہر قیمت پہ فرار چاہیے تھا' پھر چاہے جسم ساتھ جاتا یا یہیں مٹی کے بے جان ڈھیر میں تبدیل ہو جاتا۔ اسے پروا نہ تھی۔

تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس نے ایک بڑا سا کرسٹل کا خالی گلدان اٹھا کر پوری قوت سے سامنے دیوار پہ دے مارا تھا۔ اگلے ہی پل گلدان زوردار چھناکے کے ساتھ کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔

سرعت سے آگے بڑھ کے اس نے ایک بے حد نوکیلا ٹکڑا اٹھا لیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ اس ٹکڑے کی نوک اس کی کلائی کو چھوتی کمرے کا دروازہ اچانک کھلا تھا اور اپنے دھیان میں ملازمہ کے ہمراہ اس کی آرائش کا سامان لاتی' فیروزہ بائی کی آنکھیں ایک لحظے کو نا سمجھی کے عالم میں انابیہ کے وجود پہ جم سی گئی تھیں۔ ادھر انابیہ نے بھی اس اچانک افتاد پہ گھبرا کے آنے والے کی جانب دیکھا تو دھک سے رہ گئی اور اس کی لحظے بھر کی یہی چوک فیروزہ کو موقع دے گئی۔

چیل کی طرح اڑتے ہوئے اس نے جھپٹ کر انابیہ کا ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے ایک جھٹکے سے وہ نوکدار کانچ اس کے ہاتھ سے لیا تھا اور دوسرے ہی لمحے پوری طاقت سے تھپڑ اس کے منہ پہ کھینچ مارا تھا۔

"کمینی' الو کی پٹھی! مجھ سے مقابلہ کرے گی!" کے بعد دیگرے فیروزہ نے دو اور تھپڑ اسے مارے تو نڈھال سی انابیہ دور جا گری۔

"میں نے تجھ سے کہا تھا کہ اپنی مشکلات میں اضافے کی غلطی مت کرنا! اب دیکھ میں تیرا کیا حال کرتی ہوں۔" خون آشام نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے وہ بت بنی ملازمہ کی جانب پلٹی۔ تو بری طرح ہانپتی ہوئی انابیہ کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔

"زینت! تو اب اس کمرے میں ہی رک اور نو بجے تک اسے تیار کر دینا اور اگر جو اس نے زیادہ چوں چراں کی تو اسے اتنی مار لگانا کہ یہ ہلنے کے قابل نہ رہے۔"

سخت لہجے میں ہدایت دیتی وہ اک کڑی نظر انابیہ پہ ڈالتی ہوئی تیز قدموں سے باہر نکل کے دروازہ لاک کر گئی تو قالین پہ گری ہوئی انابیہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

☼ ☼ ☼

حسنی کی گاڑی اس بڑے سے بنگلے کے پورچ میں آکر رکی تو فیروزہ ہمیشہ کی طرح استقبال کو باہر آکھڑی ہوئی۔

"خوش آمدید۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کا دیدار تو نصیب ہوا۔ ہم سے کوئی غلطی ہو گئی تھی سرکار' جو کچھ دنوں سے تشریف نہیں لائے؟" اس کے گاڑی سے اترتے ہی فیروزہ تپاک سے آگے بڑھی تو حسنی کی ساحر آنکھوں میں بے نیازی اتر آئی۔

"بس ذرا مصروفیت تھی۔ تم سناؤ' آج ایسی کون سی خاص بات ہے' جو ہمیں یہاں فون کر کے مدعو کیا؟" وہ ایک اچٹتی نظر پورچ میں کھڑی گاڑیوں پہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"وجہ بھی پتا چل جائے گی سرکار! آپ اندر تشریف تو لائیں۔" وہ معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے بولی تو حسنی اس کے ساتھ چل دیا۔ جہاں بڑے سے ہال میں شہر کی بہت سی جانی مانی ہستیاں پہلے سے موجود تھیں۔

"دیکھ لیجیے سب مہمان موجود ہیں' لیکن آپ کے انتظار میں ابھی تک محفل نہیں شروع کروائی۔" فیروزہ اس کے لیے لگوائی گئی خاص نشست کے پاس رکتے ہوئے بولی تو وہ کوئی جواب دیے بنا شان بے نیازی سے وہاں براجمان ہو گیا۔ اس کی تمام تر بے نیازی کے باوجود فیروزہ کے چہرے پہ کھیلتی مسکراہٹ میں کمی واقع نہ ہوئی تھی۔

"اجازت ہے؟" اس نے جھکتے ہوئے پوچھا تو حسنی نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جس کے بعد محفل کا باقاعدہ آغاز وہاں کی ماہر رقاصہ ستارہ کے رقص سے ہوا۔

اس کی ہوش ربا اداؤں نے جلد ہی وہاں موجود سب ہی مردوں کو خود سے بھی بیگانہ کر دیا تھا لیکن حسنی کی نظریں اس پہ جمنے کے بجائے انتہائی غیر دلچسپی کے عالم میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ یوں جیسے اسے سامنے ہوتے تماشے سے کوئی غرض نہ ہو۔

ستارہ کے ساتھ اب دو تین اور لڑکیاں شامل رقص ہو چکی تھیں۔ شباب کے ساتھ شراب کا دور بھی جاری تھا۔ سازوں کی آواز' حاضرین محفل کا شور ہر چیز گزرتے لمحوں کے ساتھ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ناچنے والیاں اس کے اردگرد منڈلانے کے بعد اس کی عدم دلچسپی محسوس کرتے ہوئے دوسروں کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔

اس کے تیور دیکھتے ہوئے فیروزہ کچھ سوچتی ہوئی اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی تھی۔ اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ ہال کے انتہائی سرے پہ واقع زینے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس کے انداز ایک لمحے کو حسنی کو الجھا گئے تھے' لیکن وہ بنا کوئی سوال کیے خاموشی سے اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا تھا۔

سیڑھیوں کے اختتام پہ وہ دائیں جانب موجود راہ داری میں مڑ گئی تھی اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی سب سے آخری کمرے کے سامنے رکتے ہوئے حسنی کی طرف پلٹی تھی۔

"آپ پوچھ رہے تھے نا کہ آج ایسی کون سی خاص بات ہے جو میں نے آپ کو فون کر کے مدعو کیا؟" اس نے معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے کہا تو حسنی چونک گیا۔ اس کا چونکنا فیروزہ کو اندر ہی اندر لطف دے گیا۔ وہ اس کی اسی بے نیازی میں تو شگاف ڈالنا چاہتی تھی۔

"ہاں!" وہ الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو فیروزہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"تو پھر دل تھام کے رکھیے گا سرکار! میں آپ کی خدمت میں وہ ہیرا پیش کرنے لگی ہوں جو میں نے صرف اور صرف آپ کے لیے سنبھال کر رکھا ہے اس یقین کے ساتھ کہ صرف آپ ہی اس کے صحیح قدر دان ثابت ہو سکتے ہیں۔"

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ذو معنی انداز میں بولی تو اتنی دیر میں پہلی بار حسنی کے لبوں پہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اتنا یقین ہے آپ کو اپنے ہیرے پہ کہ وہ حسنی مرتضیٰ کو اپنے قدر دانوں میں شامل کر لے گا؟" اس نے استہزائیہ انداز میں بھویں اچکائیں تو فیروزہ قدرے گڑبڑا گئی۔ عجیب مغرور انسان تھا' بات کو کہاں سے کہاں لے گیا تھا۔

"یقین نہ سہی امید تو ہے۔ آیئے تشریف لایئے۔" وہ لاک کھول کر اندر داخل ہوئی تو انابیہ جو پہلے ہی دروازے کے پار سے فیروزہ کے ساتھ کسی مرد کے باتیں کرنے کی آواز سن کے مارے وحشت کے دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔ تڑپ کے اپنا چہرہ گھٹنوں کے گرد لپٹے بازوؤں میں چھپا گئی۔ زینت بہت زور زبردستی کے باوجود صرف اس کے کپڑے بدلوانے میں ہی کامیاب ہو سکی تھی۔

اس کے اندر داخل ہونے پہ زینت نے مسکرا کر سلام کیا تو حسنی کی کھوجتی نگاہیں اطراف کا جائزہ لیتی سامنے دیوار کے ساتھ لگے وجود پہ آکر ٹھہر گئیں۔ اس کا انداز یک لخت اسے چونکا گیا۔ یہ یقیناً" فیروزہ کے ہاتھ لگا کوئی نیا شکار تھا۔

"اس کی تیاری مکمل نہیں ہوئی؟" اس کے لمبے بالوں کو یونہی الجھا ہوا دیکھ کے فیروزہ نے ایک کڑی نظر زینت پہ ڈالی تو وہ گھبرا گئی۔

"نہیں۔ خانم! بہت مشکل سے بس کپڑے ہی تبدیل کیے ہیں۔" اس کی بات پہ حسنی دھیرے سے مسکرا دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ اگر یہ واقعی ہیرا ہے تو ان باتوں سے اس کی چمک میں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ کیوں فیروزہ؟" حسنی نے ایک جتاتی ہوئی نظر فیروزہ پہ ڈالی تو وہ دل ہی دل میں کلستی ہوئی بظاہر اعتماد سے مسکرا دی۔

"بالکل صحیح کہا۔ اس کے حسن کو واقعی ان مصنوعی سہاروں کی ضرورت نہیں۔" وہ پلٹ کے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی انابیہ کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

قدرے جھکتے ہوئے اس نے جونہی انابیہ کے بازو کو چھوا اس کی چیخوں نے کمرے کے در و دیوار ہلا ڈالے۔

"چھوڑو۔ چھوڑ دو مجھے۔ چھوڑ دو!" ایک جھٹکے سے چہرہ اٹھاتے ہوئے وہ دیوانہ وار روتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ اس کی مزاحمت دیکھتے ہوئے زینت تیزی سے فیروزہ کی مدد کو لپکی تو اس کا دھان پان سا وجود ان دونوں عورتوں کے پیچھے چھپ گیا۔ لیکن اس کی آواز حسنی مرتضیٰ کا سارا ارتکاز ساری توجہ اپنی جانب مبذول کروا کے اسے ایک لمحے کو الجھا گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچ پاتا' وہ دونوں اسے قابو کر کے گھسیٹتی ہوئی حسنی کے سامنے لے آئیں۔ اور وہ جو ابھی اپنی پہلی ہی الجھن سے نکل نہیں پایا تھا' انابیہ احسان کو اپنے سامنے پا کے ساکت کھڑا رہ گیا۔ جو سختی سے آنکھیں میچے سسک رہی تھی۔

"کیسی حضور! کیسی لگی؟" اس کی نظروں کو ایک ٹک انابیہ کے چہرے پہ مرکوز پا کے فیروزہ نے فاتحانہ انداز میں حسنی کی جانب دیکھا تو وہ بامشکل تمام خود پہ قابو پاتے ہوئے دھیرے سے مسکرا دیا۔

"بہت خوب۔ مان گئے فیروزہ! جواب نہیں تمہارا!" اس نے دھیرے سے انابیہ کے گال پہ نقش انگلیوں کے نشان کو چھوا تو اس نے تڑپ کے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے موجود چہرے کو چند لمحے آنسوؤں سے بھری پتھرائی ہوئی نظروں سے تکنے کے بعد وہ گویا سانس لینا بھول گئی۔

"مہربانی' نوازش۔" فیروزہ کی باچھیں یہاں سے وہاں تک کھل گئیں۔

"یہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے ہم چند گھنٹوں کے لیے سراہ سکیں۔" وہ اس کی بے یقین آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک ایک لفظ پہ زور دیتا ہوا عجیب سرد سے لہجے میں بولا۔

انابیہ کی ساکت آنکھوں سے آنسو قطرہ قطرہ بہہ نکلے۔ جنہیں بے تاثر نظروں سے تکتا وہ فیروزہ کی جانب دیکھنے لگا۔

"کیا قیمت ہے اس کی؟" مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اس نے انابیہ کو سر تک پا دیکھا تو اس کی آنکھوں اور مسکراہٹ سے چھلکتا تمسخر انابیہ احسان کو لب بھینچے آنکھیں بند کرنے پہ مجبور کر گیا۔ اس شخص کی ذات کا یہ تاریک پہلو بھی ہو سکتا تھا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ بے یقینی اتنی شدید تھی کہ اس کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔ جس پہ فیروزہ حیرت سے اسے دیکھتی' قدرے سکون سے حسنی کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

"پانچ لاکھ وہ بھی صرف آپ کے لیے۔"

"بس پانچ!" حسنی کی طنزیہ ہنسی انابیہ کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اس نے آنکھیں میچے اپنی سسکی کا گلا گھونٹنے کو سختی سے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ تو انمول ہے۔ تم یہ آٹھ لاکھ رکھو' اتنی قیمت تو ہونی چاہیے بے چاری کی۔" وہ ایک نظر اس کی برستی آنکھوں پہ ڈالتے ہوئے بولا تو فیروزہ کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹ سی گئیں۔

"اور ہاں' اسے میرے ساتھ بھیجنے کی تیاری کرو۔ پانچ منٹ تمہیں میرا منیجر کر جائے گا۔" وہ اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے پلٹنے کو تھا جب انابیہ نے اپنی لہو رنگ آنکھیں کھول کے ایک سلگتی ہوئی نظر اس کے چہرے پہ ڈالی تھی۔ اپنے اندر بھڑک اٹھنے والے نفرت کے شعلوں کو چھپانے کی اس نے رتی برابر کوشش نہ کی تھی۔

اس کی آنکھوں سے برستی چنگاریوں کو حسنی مرتضیٰ نے چند لمحے خاموشی سے دیکھا تھا اور پھر لب بھینچے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم سر!" نیازی صاحب کے فون اٹھاتے ہی تیمور نے سکھ کا سانس لیا۔

"وعلیکم السلام' کیسے ہو تیمور؟"

"فائن سر! میں دراصل آپ سے شام سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا' لیکن چونکہ آپ کا فون آف تھا' اس لیے میرا کام تھوڑا مشکل ہو گیا۔ ایکچوئلی مجھے آپ سے ان اغوا ہونے والی دونوں لڑکیوں کی ڈیٹیلز چاہیے تھیں۔ لیکن چونکہ اس وقت یہ ممکن نہیں اس لیے کیا آپ مجھے ابھی صرف ان کے نام بتا سکتے ہیں؟" وہ قدرے عجلت میں بولا تو نیازی صاحب اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"ہاں ہاں' کیوں نہیں۔ ایک منٹ رکو۔" وہ اسے ہولڈ کروا گئے تو تیمور نے بے چینی سے کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھا۔

"ہاں تیمور! ان لڑکیوں کے نام ہیں انابیہ احسان اور نائمہ شفیق۔" اور دوسری جانب موجود تیمور نے زیر لب نام دہراتے ہوئے اک گہری سانس لی۔

"اوکے سر۔ سر! اب مجھے آپ سے ایک کام کی اجازت چاہیے۔"

"کس کام کی؟" نیازی صاحب نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں سر! کہ ہم نے ابھی تک آپ سے اپنا پلان آف ایکشن ڈسکس نہیں کیا۔ لیکن اگر آپ کو مجھ پہ بھروسا ہے تو میں چاہوں گا کہ آپ مجھے ہمارے پہلے ٹارگٹ پہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر ریڈ کی اجازت دے دیں۔" اس نے اپنا مدعا بیان کیا تو نیازی صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"اور ان لڑکیوں کا کیا بنے گا؟"

"سر مجھے یقین ہے کہ اگر ان لڑکیوں کے اغوا میں اسی گروہ کا ہاتھ ہے تو یہ ریڈ اس کیس میں بھی فیصلہ کن ثابت ہو گی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا تو نیازی صاحب کے چہرے پہ اطمینان در آیا۔

"ٹھیک ہے پھر گو آہیڈ۔"

"تھینک یو سر۔" تیمور نے مسکراتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا اور پھر فوری طور پہ باری کو فون کر کے اس نے ساری بات بتا کے پلان "اے" پہ عمل در آمد کرنے کے لیے کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آٹھ لاکھ! فیروزہ کے تو مارے خوشی کے پیر زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے۔

اس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ زینت کے سر پہ کھڑے ہو کے انابیہ کی تیاری مکمل کروائی تھی اور اس کی دہائیوں کے باوجود بالآخر اسے آدھے گھنٹے کے اندر اندر حسنی کی گاڑی میں بٹھا کے دم لیا تھا۔

اس کے گاڑی میں سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے بٹن دبایا اور تمام دروازوں کو آٹومیٹکلی لاک کر دیا تھا اور اگلے ہی لمحے گاڑی تیزی سے کھلے گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔

"دروازہ کھولو! میں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" بری طرح روتے ہوئے انابیہ دروازہ کھولنے کی کوشش میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی جبکہ اگلی سیٹ پہ براجمان حسنی نے ایک بار بھی پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"تم۔ تم سنتے کیوں نہیں ہو ذلیل' منافق انسان!" چلاتے ہوئے اس نے یک لخت حسنی کا بازو نوچ ڈالا تو حسنی ضبط جواب دے گیا۔

لب بھینچے اس نے پلٹ کے انابیہ کی کلائی کو ایک جھٹکے سے اپنی گرفت میں لیا تو جہاں انابیہ کی سانس ایک پل کو رک گئی وہیں کتنی ہی چوڑیاں ٹوٹ کر اس کی کلائی میں چبھ گئیں۔

"کیونکہ میں تمہاری آواز تک نہیں سننا چاہتا انابیہ احسان!" شعلے برساتی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑے وہ پوری قوت سے دھاڑا تو ایک لمحے کو گاڑی میں موت کا سناٹا چھا گیا۔

انابیہ کی منجمد آنکھوں سے خوف قطروں کی صورت چہرے پہ بہنے لگا تو مارے ضبط کے حسنی کی کنپٹی کی رگ ابھر آئی۔ ایک جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑتے ہوئے وہ سیدھا ہوا تو انابیہ پیچھے سیٹ سے جا ٹکرائی۔ بے اختیار اس کی نظریں اپنی کلائی کی جانب اٹھی تھیں جہاں خون کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔

"جبار! اس سیکٹر سے نکل کے مین روڈ پہ گاڑی روک دینا۔" بامشکل تمام خود پہ قابو پاتے ہوئے اس

نے ڈرائیور کو ہدایت دی تو اس نے جلدی سے اثبات میں سرہلا دیا۔

چند لمحوں بعد اس نے گاڑی مین روڈ پہ لاتے ہوئے ایک سائیڈ پہ کھڑی کردی تو حسنی ڈیش بورڈ پہ پڑا موبائل اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

اسے فون کان سے لگاتا دیکھ کے انابیہ کا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ ”کہیں یہ اس عورت کو تو فون نہیں کرنے لگا؟“ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اس کی پشت پہ جمائے انابیہ نے خوف زدہ ہو کے سوچا تھا۔

”ہیلو‘ ہاں باری! میں لڑکی کو لے کے وہاں سے نکل چکا ہوں۔ تم شاہد اور سفیان کے علاوہ باقی سب سے کہو کہ وہ بنگلے کی پچھلی سائیڈ سے اندر کود کے اسے اپنے گھیرے میں لے لیں۔ جبکہ تم میرے منیجر بن کے ان دونوں کے ساتھ مین گیٹ سے اندر جاؤ اور ہال میں داخل ہو کے سب کو اپنے کنٹرول میں لے لو۔ میں تب تک باقی فورس کے ساتھ وہاں پہنچتا ہوں۔“ تیمور منہاج کو فون پہ بات کرتا سن کے پیچھے بیٹھی انابیہ احسان کا منہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

”تو کیا یہ سب ڈراما تھا؟ کیا تیمور کا ان برے لوگوں سے کوئی تعلق نہ تھا؟ وہ۔وہ لٹیرا نہیں بلکہ محافظ تھا؟“ سنسناتے ہوئے دماغ میں سوال اڈے چلے آرہے تھے وہ اس حد تک بے یقین تھی کہ اس کی آنکھیں آنسو بہانا بھلا کے ایک ٹک تیمور پہ جمی تھیں جو بغور دوسری طرف کی بات سن رہا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن خیال رکھنا کہ وہاں سے کوئی بھی آدمی نکلنے نہ پائے۔ اور اس دوسری لڑکی نائمہ کو بھی تلاش کرنا ہے۔“ اس دوران سامنے سے ایک گاڑی آکے ان کے قریب رکی تو تیمور فون کان سے لگائے عجلت میں باہر نکل گیا۔

انابیہ دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی جو اب گاڑی سے باہر آنے والے پانچ چھ سادہ کپڑوں میں ملبوس آدمیوں کو ہدایت دینے کے ساتھ ساتھ فون پہ بھی بات کر رہا تھا۔

”کیوں میں اتنی جلدی اس سے بدگمان ہوگئی؟ کیوں میں نے ایک پل کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ بھلا تیمور بھی کبھی اس درجہ مکروہ کام کرسکتا ہے؟“ اس پہ نگاہیں جمائے دکھ اور ملال دھیرے دھیرے انابیہ کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا تو یک لخت سامنے کا منظر دھندلا گیا۔ اپنی سوچ اور اپنے الفاظ پہ اسے رہ رہ کے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ کیا آشنائی کا یہی تقاضا تھا؟

آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر باہر دیکھا تھا‘ جہاں اب وہ ان سب کے ساتھ دوسری گاڑی میں سوار ہو رہا تھا اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ تب ہی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے ڈرائیور کا سیل بجنے لگا تھا۔

”جی سر!“ فون کان سے لگاتے ہوئے وہ مستعدی سے بولا تو انابیہ پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

”بہتر۔“ دوسری جانب کی بات سننے کے بعد اس نے فقط ایک لفظ جواب میں کہہ کر فون بند کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی تو انابیہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

”ہم کہاں جارہے ہیں بھائی؟“

”بڑے صاحب کے گھر بی بی! تیمور صاحب نے اس وقت آپ کو آفس لے جانے سے منع کیا ہے۔“ اور انابیہ احسان پہ گھڑوں پانی آگرا تھا۔

”میں نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں؟“ تاسف سے بے آواز آنسو بہاتے ہوئے اس نے دھیرے سے اپنی کلائی کو چھوا تھا جہاں خون جم گیا تھا۔



نیازی صاحب کو تیمور مطلع کرچکا تھا۔ اس لیے جس وقت ڈرائیور انابیہ کو لے کے ان کے گھر پہنچا وہ بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔

مشفق لب و لہجے والے اجمل نیازی سے مل کے انابیہ کے دل کو بے حد ڈھارس ملی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لیے گیسٹ روم میں چلے آئے تھے۔ اسے فریش ہوجانے کا کہہ کر وہ خود کمرے سے باہر چلے گئے تھے ان کے جانے کے بعد انابیہ نے جیولری اتار کر ایک طرف پھینکی تھی اور جاکے اچھی طرح سے منہ دھویا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹے تو ان کے ساتھ ان کی بیگم اور پیچھے ٹرالی گھسیٹ کے لاتا ملازم بھی تھا۔

”السلام علیکم آنٹی!“ نیازی صاحب کے تعارف کروانے پہ انابیہ نے دھیرے سے بوجھل پلکیں اٹھاتے ہوئے بیگم نیازی کو سلام کیا تو وہ جو اس کے مقابل کھڑی حیران پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں‘ پریشانی سے بولیں۔

”آپ۔ آپ احسان فاروق کی بیٹی ہو؟“

”ج۔جی آنٹی!“ ہکلاتے ہوئے اس نے اب کے غور سے سامنے کھڑی خاتون کا چہرہ دیکھا تو دل یک لخت ڈوب گیا۔ یہ۔ یہ تو غالباً ”عمر“ کی اسلام آباد والی خالہ تھیں۔ وہ چونکہ ان سے فقط اپنی منگنی کے روز ملی تھی۔ اس لیے فوراً ”انہیں پہچان نہیں پائی تھی۔ اس پہ مستزاد اس کی ابتر ذہنی حالت۔

”آپ۔ آپ....“

”میں عمر کی خالہ ہوں۔“ اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر وہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولیں تو انابیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ ابھی وہ ایک مشکل سے نکلی نہیں تھی کہ دوسری مشکل اسے نگلنے کو تیار کھڑی تھی جبکہ نیازی صاحب اس عجیب و غریب اتفاق پہ ساکت کھڑے رہ گئے۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے تو رفعت بیگم کو ساری بات بتا کے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے‘ تاکہ اس بے چاری لڑکی کو اپنائیت کا احساس دلا کر اس کی ہمت بندھائی جاسکے۔ لیکن یکایک اس ”بے چاری“ سے ان کی اتنی قریبی رشتے داری نکل آئے گی‘ انہوں نے سوچا نہ تھا۔

ماحول پہ چھائی عجیب سی خاموشی اور بیوی کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے بالآخر اجمل صاحب نے ہی گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

”آؤ۔ آؤ بیٹا! پہلے کچھ کھالو۔“ انہوں نے ٹرالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو رفعت بیگم کی سرد نگاہوں سے خائف ہوتی انابیہ بامشکل تمام تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

”نن۔ نہیں انکل! مجھے بھوک نہیں۔“ اور اس سے پہلے کہ اجمل صاحب اصرار کرتے‘ رفعت کی آواز نے ان دونوں کو ایک لمحے کے لیے ساکت کردیا۔

”کتنے دن ہوئے ہیں تمہیں اغوا ہوئے؟“

”رفعت! یہ تم....“ اجمل صاحب ایک نظر انابیہ کے فق ہوتے چہرے پر ڈالتے ہوئے بولے تو رفعت بیگم ان کی طرف پلٹتے ہوئے تیز لہجے میں بولیں۔

”پلیز اجمل! یہ میرے بھانجے کی زندگی اور ہمارے خاندان کی عزت کا سوال ہے۔“

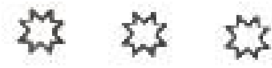
ان کے اکھڑے تیور انابیہ کے دل کو چھلنی کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ڈھیروں آنسو بھرلائے تھے۔ ”یا اللہ! اتنی کڑی آزمائش۔ میں اپنی پاکیزگی کا یقین کیسے اور کس کس کو دلاؤں گی؟“ نچلا لب دانتوں تلے دبائے‘ آنے والی ذلت کا اسے اب احساس ہوا تھا۔ ورنہ اب سے کچھ دیر پہلے تک تو اسے صرف اپنی عزت بچانے کا غم کھائے جارہا تھا۔ لیکن رفعت نیازی کے فقط دو جملوں نے ہی اسے یہ باور کروا دیا تھا کہ وہ اپنی عزت بچا کے بھی بچا نہیں پائی تھی۔ اور وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی آزمائش ختم ہوگئی۔ خود کو اذیت کے ایک نئے اور بدنامی کے شاید کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے کے روبرو پا کے بھونچکی کھڑی رہ گئی تھی۔

”ٹھیک ہے لیکن یہ کوئی وقت نہیں ان باتوں کا۔ بچی بے چاری پہلے ہی نجانے کن حالات سے گزر کر آئی ہے۔ اوپر سے تمہارے فضول سوال جواب۔ تم اگر اسے دلاسا نہیں دے سکتیں تو پلیز مزید پریشان بھی مت کرو۔“ اسے روتا دیکھ کے اجمل صاحب غصے سے بولے تو رفعت ایک کڑی نظر روتی ہوئی انابیہ پہ ڈالتی پلٹ کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

”حوصلے سے کام لو بیٹا۔ مجھے اگر پتا ہوتا کہ تم عمر کی منگیتر ہو تو میں رفعت کو یہ بات بتانے کی غلطی کبھی نہ کرتا۔“

شرمندہ سے اجمل صاحب نے آگے بڑھ کے روتی ہوئی انابیہ کے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ

چھپائے زمین پہ دو زانو گرتی چلی گئی۔

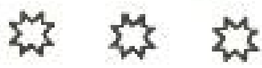


رات ساڑھے تین بجے تیمور نے کال کر کے نیازی صاحب کو آپریشن کامیاب ہونے کی نوید دی تو وہ اسی وقت آفس جانے کے لیے نکل گئے۔

عورتوں کی اسمگلنگ اور ڈرگز کے کاروبار میں ملوث اس گینگ کی انویسٹی گیشن اور اس سلسلے میں ہونے والی یہ ریڈ مخفی تھی، سو تمام ملزمان کو نامعلوم مقام پہ منتقل کر کے تیمور اپنے بندوں کے ساتھ جس وقت آفس پہنچا صبح کے ساڑھے چار بج چکے تھے۔ چونکہ فیروزہ نامی عورت کے اس عشرت کدے سے گرفتار ہونے والوں میں چند ایک مایہ ناز ہستیاں بھی تھیں، سو نیازی صاحب نے تیمور کے مشورے کے بعد ان بڑی مچھلیوں کی گرفتاری کی اطلاع، کال کر کے افسران بالا کے گوش گزار کر دی تھی۔

انابیہ کی وہاں سے بازیابی کو البتہ چھپا لیا گیا تھا۔ کیونکہ اسی طرح مخفی کیس اور ریڈ کی خبر اسلام آباد پولیس کو بھی ہو جاتی، جن کے پاس انابیہ اور نائمہ کے اغوا کی رپورٹ درج تھی۔

چونکہ اچانک غائب ہونے والی ان لڑکیوں کا کیس نیازی صاحب کے پاس آئی جی صاحب کی ریفرنس سے آیا تھا۔ اس لیے انہوں نے آئی جی صاحب کو لاہور فون کر کے دو میں سے ایک لڑکی کے بازیاب ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے اس معاملے میں رازداری برقرار رکھنے کے لیے کہا تھا۔ باقی پوری تفصیلات بتانے سے انہوں نے صاف معذرت کرتے ہوئے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ اسلام آباد پولیس کو ان سے رابطہ کرنے کے لیے کہیں۔ اس بات کو مخفی رکھنا ان کی ڈیوٹی بھی تھا اور اب تو ان کے خاندان والوں کی عزت کا سوال بھی بن چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انابیہ کو تھانے جانا پڑے اور یہ تب ہی ممکن ہو سکتا تھا جب ان جیسی اثر و رسوخ والی شخصیت اس سارے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیتی۔



ساری کارروائی نپٹا کر تیمور کو گھر پہنچتے تک صبح کے سات بج گئے تھے۔ وہ کل صبح کا نکلا آج صبح لوٹا تھا۔ تھکاوٹ اس کے روم روم سے عیاں ہو رہی تھی۔ جسم سے زیادہ ذہن نڈھال اور پراگندہ ہو رہا تھا۔ مگر جس وقت وہ شاور لے کے بیڈ پہ لیٹا تو آنکھوں میں نیند کے بجائے کل کا دن ایک بار پھر اپنی پوری جزئیات سمیت آن ٹھہرا تھا۔

کل صبح تک اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ چار سال بعد یوں اچانک انابیہ احسان اس کے روبرو آکھڑی ہوگی۔ یا یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ اتنی غلط جگہ پر اور ایسے برے حال میں اس سے ملاقات کے بارے میں تو تیمور نے کبھی گمان بھی نہ کیا تھا۔ اسے تو اب یہ سوچ کر بھی وحشت ہو رہی تھی کہ اگر اس وقت وہ وہاں نہ ہوتا تو فیروزہ کسی اور شخص سے انابیہ کا سودا طے کر دیتی اور انابیہ کی زندگی ہمیشہ کے لیے برباد ہو جاتی۔

بے شک یہ مشیت ایزدی ہی تھی جو حالات از خود ایسا موڑ لیتے گئے کہ وہ بروقت وہاں پہنچ کر انابیہ کی عزت بچانے کا وسیلہ بن گیا۔ شاید یہ اس کے اتنے ماہ کی بے غرض محنت اور نیک نیتی کا انعام تھا جو وہ ان مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے، حسنی مرتضیٰ بن کر کر رہا تھا۔

اس دوران نہ اس نے دن دیکھا تھا اور نہ رات، نہ اپنے مال کی پروا کی تھی اور نہ راز افشا ہو جانے کی صورت میں اپنے انجام کی فکر۔

اس پہ اگر کوئی دھن سوار تھی تو صرف ان ناسوروں کو معاشرے سے اکھاڑ پھینکنے کی، جو ایک طرف تو منشیات جیسا زہر نوجوانوں کی رگوں میں اتار کر گھروں کے گھر اجاڑ رہے تھے اور دوسری طرف لوگوں کی عزتوں سے کھیل کر زندگی بھر کی رسوائی ان کا مقدر بنا رہے تھے۔

ان لوگوں کے خلاف اس نے دو ماہ میں تنکا تنکا کر کے اہم ثبوت اکٹھے کیے تھے۔ اپنے طور پہ اب وہ

اپنے پہلے ٹارگٹ ’فیروزہ نامی طوائف‘ جو شہر کے ایک پوش علاقے میں بڑے سے بنگلے میں رہائش پذیر تھی اور جو اس گروہ کے اہم رکن ملک جہانگیر کے لیے کام کرتی تھی ‘اس پہ ہاتھ ڈالنے کے لیے تیار تھا۔ جب نیازی صاحب نے اسے لاہور کی دو لڑکیوں کے بارے میں سراغ لگانے کے لیے کہا تھا‘ ان کے بارے میں یہی خدشہ تھا کہ شاید انہیں بھی اسی گروہ نے اغوا کیا ہے۔ اس نئے مسئلے کی وجہ سے اسے اپنی کارروائی روکنی پڑ گئی تھی۔

نیازی صاحب سے دو دن کا وقت لیتے ہوئے وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ کس طرح اس خدشے کی تصدیق کی جائے کہ آیا ان لڑکیوں کو ان ہی لوگوں نے اغوا کیا تھا یا نہیں ‘لیکن بہت سوچ بچار کے بعد بھی اس کے ذہن میں کوئی جامع منصوبہ نہیں آسکا تھا۔ اپنی اس مشکل کو باری کے ساتھ ڈسکس کرنے کا سوچتے ہوئے وہ اسے بلوانے ہی والا تھا جب فیروزہ کی غیر متوقع فون کال نے اسے چونکا دیا تھا۔ اسے ایک خاص محفل میں مہمان خصوصی کی دعوت دیتے ہوئے ‘اس نے آنے کی خاص تاکید کے بعد فون بند کر دیا تھا۔

فیروزہ کے انداز سے تیمور کو یہ سمجھنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی کہ یہ خاص محفل کسی خاص مقصد کے لیے ہی سجائی جا رہی تھی اور چونکہ وہ خاص مقصد ہاتھ آنے والی دو نئی لڑکیاں بھی ہو سکتا تھا ‘اس لیے اس نے نیازی صاحب سے ان لڑکیوں کے بارے میں مکمل معلومات اور ان کی تصاویر لینی چاہی تھیں۔ مگر انہیں آفس میں نہ پا کے وہ سخت بدمزہ ہوا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے پاس انتظار کرنے کے لیے وقت نہ تھا ‘اس لیے وہ اس سارے معاملے کو اللہ کے بعد اپنی عقل کے سہارے کھوجنے کا فیصلہ کرتے ہوئے شام ڈھلنے کے بعد فیروزہ بائی کے بنگلے پہ جا پہنچا تھا۔

اس کے پہنچنے پہ وہاں وہی معمول کا تماشا شروع ہو گیا تھا۔ جس سے اسے کوئی غرض نہ تھی۔ اپنے ذہن کو چوکس رکھتے ہوئے اس کی نگاہیں مسلسل اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کوئی چھوٹی سی بھی غیر معمولی بات اس کی مدد کا سبب بن سکتی تھی۔ مگر جب کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی اسے کوئی سراغ نہ مل سکا تو بے چینی اس کا احاطہ کرنے لگی۔

دل ہی دل میں کسی مضبوط بہانے کا سہارا لے کر پورے گھر کا ایک جائزہ لینے کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ کیا کرے جب فیروزہ اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی تھی۔ اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی تو تیمور الجھا الجھا سا اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کسی لڑکی کا سودا کرنا چاہ رہی تھی۔

فیروزہ کی بات سن کے تیمور پوری طرح الرٹ ہو گیا تھا۔ اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہونے پہ اس کی چوکس نظروں نے اردگرد کا جائزہ لیا تھا اور تب ہی اس کی نگاہوں کی زد میں سامنے دیوار سے لگا ایک وجود آیا تھا۔ جو سہمے ہوئے انداز میں گھٹنوں میں چہرہ چھپائے رو رہا تھا۔

اس کی پشت پہ بکھرے الجھے ہوئے لمبے بال ‘قالین پہ گرا ہوا دوپٹا ‘اس کا خوف زدہ انداز اور اس کا رونا ہر بات سے تیمور کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی کہ ہو نہ ہو یہ ان اغوا شدہ لڑکیوں میں سے ہی کوئی ایک تھی۔ وہ اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا جب فیروزہ کے ہاتھ لگانے پہ وہ خوف زدہ ہو کے چلائی تھی۔ اس کی آواز پہ ایک پل کے لیے تیمور کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا تھا۔ اس لڑکی کی چیخ و پکار میں اسے انابیہ کی آواز سنائی دی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے اس عجیب و غریب خیال کو جھٹک پاتا ‘ان دونوں عورتوں نے اس لڑکی کو پکڑ کر اس کے روبرو لا کھڑا کیا تھا اور تیمور کے پیروں تلے سے گویا زمین نکل گئی تھی۔

آنکھیں بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی سر بازار آ کھڑی ہونے والی وہ لڑکی کوئی اور نہیں انابیہ احسان تھی ‘جسے کبھی تیمور منہاج نے ٹوٹ کر چاہا تھا اور جو اسے بڑی بے دردی سے چھوڑ گئی تھی۔ لیکن جسے وہ آج تک چاہ کر بھی نہ تو کبھی چھوڑ پایا تھا اور نہ ہی اپنی زندگی سے نکال سکا تھا۔

اس کے پھول سے نازک چہرے پہ ثبت انگلیوں کے نشان دیکھ کر اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ان ہاتھوں کو توڑ دے جنہوں نے اس پہ ہاتھ اٹھایا تھا۔ لیکن اس کی ایک چھوٹی سی بھی جذباتی غلطی انابیہ کو ہمیشہ کے لیے پاتال میں دھکیل سکتی تھی۔ یہی سوچ کے اس نے بامشکل تمام خود پہ قابو پایا تھا لیکن اپنے ہاتھ سے اس کے دکھتے ہوئے چہرے کو سہلانے سے روک نہ سکا تھا۔

اس کی اس حرکت پہ انابیہ نے تڑپ کے آنکھیں کھولی تھیں اور چند بے یقین لمحوں کے بعد وہ بھی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔

نظروں کا تصادم تیمور کو ایک جھٹکے سے ٹرانس کی اس کیفیت سے نکال لایا تھا جو انابیہ کو اپنے سامنے پا کے اسے خود پہ طاری ہوتا محسوس ہوا تھا۔

آن واحد میں اس کے اندر کی گھٹن اور درد نے اس کے ہر احساس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور وہ اس پہ اپنی کھولن نکالنے سے باز نہ رہ سکا تھا۔

اس کا ہر ہر نشتر انابیہ کی رنگت مارے اذیت کے فق کیے دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے برستے آنسوؤں میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ لیکن اس پل تیمور کو اس سے کوئی ہمدردی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اسے تڑپانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ اس کی تیاری کا حکم دے کے وہ خود باہر چلا آیا تھا۔ جہاں نیازی صاحب سے فون پہ اغوا شدہ لڑکیوں کے ناموں کی تصدیق کے بعد اس نے اچانک ریڈ کی اجازت طلب کی تھی۔ باری کو ساری بات بتا کے وہ خود انابیہ کو آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہاں سے لے کر نکلا تھا۔

اس وقت انابیہ کا رونا ‘اس کا مچلنا تیمور پہ کوئی اثر نہیں کر رہا تھا۔ مگر اب وہ لمحے یاد کر کے اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ گاڑی میں اس پہ چلاتے ہوئے جس طرح اس نے طیش کے عالم میں اس کی کلائی جکڑی تھی ‘اسے کتنی ہی چوڑیاں اپنے ہاتھ کے دباؤ سے ٹوٹتی محسوس ہوئی تھیں۔ مگر اس وقت اسے ان کی پروا نہیں

طعا ”پرواہ نہیں

کی تھی ‘مگر اب ان ٹوٹی چوڑیوں کی چبھن اسے اپنے دل میں محسوس ہو رہی تھی۔

انابیہ کی آنسوؤں میں ڈوبی ہراساں آنکھیں تیمور کے اندر ہلچل مچانے لگیں تو وہ بے کل سا اٹھ بیٹھا۔

”میں نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں؟“ جھنجلاتے ہوئے اس نے مکا بیڈ پہ مارتے ہوئے اپنی آنکھیں سختی سے میچ لی تھیں۔ کیا آشنائی کا یہی تقاضا تھا؟



شیریں بیگم ہال میں بیٹھی معمول کے مطابق گرین ٹی پیتے ہوئے اخبار کی سرخیاں دیکھ رہی تھیں۔ ملازم ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھے ‘جو ہر روز تیمور اور منہاج صاحب کی جوگنگ سے واپسی پہ لگتا تھا۔ لیکن آج چونکہ صرف منہاج صاحب جوگنگ کے لیے گئے تھے اس لیے اس وقت شیریں بیگم کو صرف ان ہی کا انتظار تھا۔

ان کے استفسار پہ چوکیدار انہیں تیمور کی صبح سات بجے کے قریب واپسی کے متعلق بتا چکا تھا۔ وہ کل ساری رات کسی آپریشن میں مصروف رہا تھا اور پیچھے ان کی جان سولی پہ لٹکی رہی تھی۔

وہ اس کے لیے رات بھر اتنی پریشان رہی تھیں کہ اپنا دن بھر کا سارا غصہ اور خفگی بھی بھلا بیٹھی تھیں۔ ورنہ کل جس طرح ماہین بنا کچھ کہے سنے روتی ہوئی ان کے گھر سے گئی تھی اور بعد میں جو کچھ ان کے علم میں آیا تھا ‘اس نے ان کا خون کھولا کے رکھ دیا تھا۔ نجانے کیوں یہ لڑکا خود کو برباد کرنے پہ تلا ہوا تھا وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے پیچھے جو کسی طور اس کے لائق نہ تھی۔ دل ہی دل میں اس معاملے کو ہر حال میں آر یا پار لگانے کا فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے اس بحث کو تیمور کے اٹھنے تک موقوف کر دیا تھا۔ لیکن منہاج صاحب سے اس بات کا ذکر وہ رات کو ہی کر چکی تھیں۔ اور اب ایک بار پھر انہیں اس سلسلے میں یاددہانی کروانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

چائے ختم کر کے وہ اخبار ایک طرف رکھتی اٹھ کر

کھڑی ہونے کو تھیں، جب سیڑھیوں سے تیار ہوئے تیمور کو اترتا دیکھ کے وہ چونک گئی تھیں۔

"یہ تم کہاں جا رہے ہو؟" انہوں نے الجھ کر تیمور کا چہرہ دیکھا۔

"آفس۔" وہ کف بند کرتا ان کے قریب چلا آیا تو شیریں بیگم کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"کل کے گئے تم ابھی سات بجے واپس آئے ہو اور ابھی نو بھی نہیں بجے کہ تم پھر واپس جا رہے ہو۔" وہ خفگی سے بولیں۔ ان کی بات پہ تیمور بے اختیار اک گہری سانس لے کے رہ گیا۔ وہ اب انہیں کیا بتاتا کہ اس کا مضطرب دل اور منتشر ذہن کیسے اسے بے کل کیے ہوئے تھے اور وہ اس بے کلی اور پریشانی سے فرار حاصل کرنے کو ہی اپنے کمرے کی تنہائی سے بھاگ آیا تھا۔

"بس ممی! کچھ ضروری کام ہے۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"بھاڑ میں گیا وہ ضروری کام، یہ کوئی جاب ہوئی۔ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام۔ تم اتنی فضول جاب چھوڑ کے اپنا بزنس کیوں نہیں سنبھالتے؟" وہ اسے غصے سے دیکھتے ہوئے بولیں تو تیمور اس بلاوجہ کی بحث سے اکتا گیا۔

"پلیز ممی! میں نے سی ایس ایس پاپا کے بزنس کو سنبھالنے کے لیے نہیں کیا۔"

"ہونہہ! تم نے تو کچھ بھی ہمارے لیے نہیں کیا نہ پہلے پڑھائی اور نہ اب شادی۔" وہ تلخی سے کہتی نگاہوں کا زاویہ بدل گئیں تو تیمور ٹھٹک کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا، جہاں غصے کے ساتھ ساتھ خفگی بھی موجود تھی۔

"کیا بات ہے، آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟"

"شکر ہے، تمہیں ماں کا غصہ نظر تو آیا۔" انہوں نے استہزائیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو تیمور انہیں بے بس نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔

"کل تم نے کیا سوچ کے ماہین کو اتنی بڑی بات کہی؟ تمہیں پتا ہے وہ سارا دن روتی رہی ہے۔" تیوری چڑھائے انہوں نے فہمائشی نظروں سے تیمور کی جانب دیکھا۔

"ساری زندگی رونے سے بہتر ہے کہ وہ ایک ہی بار رولے۔" وہ ماں کی خفگی کی پروا کیے بنا سپاٹ لہجے میں بولا تو شیریں بیگم کے غصے میں اضافہ ہو گیا۔

"تیمور!"

"پلیز ممی! بہت ہو گئی یہ آنکھ مچولی۔ میں مزید یہ تماشا برداشت نہیں کر سکتا۔ میں آپ کو بارہا کہہ چکا ہوں کہ مجھے ماہین تو کیا کسی بھی لڑکی سے شادی نہیں کرنی۔ پھر آپ اور ماموں کیوں اس لڑکی کی زندگی خراب کرنے پہ تلے ہوئے ہیں۔"

وہ حقیقتاً "اس ماہین نامی ٹنٹے سے تنگ آچکا تھا۔ اس پہ مستزاد اس کی ذہنی کیفیت۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ ہمیشہ کی طرح ماں کے سامنے خاموش ہو جاتا، لیکن اس وقت تو وہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔

"ہم جو کر رہے ہیں سوچ سمجھ کے کر رہے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تم کس خوشی میں اپنی زندگی خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو؟ اس لڑکی کے پیچھے جس نے نہ تمہاری محبت کی قدر کی اور نہ تم سے جڑے رشتوں کو اہم جانا چلو ہمیں تو چھوڑو۔ اس ضدی اور مغرور لڑکی نے تو تمہارے کہے کو بھی کچھ نہ جانا۔ یاد ہے وہ وقت جب تم نے کتنی آس سے اسے سمجھانا چاہا تھا۔ سب کچھ بھلا کے اسے منانا چاہا تھا۔ اور وہ کتنی بے حسی سے تمہاری ذات کو روکر کے آگے بڑھ گئی تھی۔ اس نے تو آج تک پلٹ کے نہیں دیکھا پھر تم کیوں اب تک وہیں کھڑے ہو؟ کیوں اپنی زندگی کو آگے بڑھانا نہیں چاہتے؟"

غصے سے اسے دیکھتے ہوئے وہ بولتی چلی گئیں تو لب بھینچے کھڑا تیمور یک لخت چلا اٹھا۔

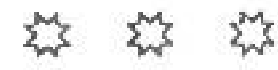
"کیونکہ میں نے اس سے محبت کی تھی اور محبت میں مقابلے بازی نہیں ہوتی۔ میں کچھ نہیں بھولا ہوں۔ نہ اپنا رد کیا جانا اور نہ ہی اپنے مان کا ٹوٹنا۔ مجھے اس کا دیا ہر زخم یاد ہے۔ لیکن میرا دل اب مر چکا ہے۔ میرے جذبات سرد ہو چکے ہیں اور میں اس مردہ دل

کے ساتھ کسی دوسری لڑکی کو نہیں اپنا سکتا۔ میری زندگی میں پہلے ہی بہت پچھتاوے ہیں ممی! پلیز ان میں مزید اضافے کا سامان مت کریں۔"

بولتے بولتے اس کی آواز درد کے احساس تلے دب کے مدھم ہو گئی تو اس کے اس درجہ شدید رد عمل پہ گنگ کھڑی شیریں بیگم اس کے سرخ ہوئے چہرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں، تیمور تیزی سے پلٹتے ہوئے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ مگر وہاں منہاج مرتضیٰ کے ساتھ اپنی بہن ثمو اور بھانجے محب کو دیکھ کے وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کے قریب سے نکلتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔

اور ثمو جو پہلے ہی بھائی کی بات سن کے بے حد مغموم ہو گئی تھی تیمور کو یوں بنا کچھ کہے سنے آگے بڑھتا دیکھ کے اسے اپنا دل عجیب سے بوجھ تلے دبتا محسوس ہوا تھا۔



انابیہ نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی تھی۔ پے در پے لگنے والے جھٹکوں نے دل و دماغ کی عجیب حالت کر ڈالی تھی۔ آنکھیں خود بہ خود کبھی برسنے لگتیں اور کبھی ماضی اور حال کی بھول بھلیوں میں کھو کے کسی غیر مرئی نقطے پر جم جاتیں۔ سینے پہ وسوسوں اور پریشانیوں کے سانپ پھن پھیلائے اس کے وجود میں ہر لحہ اپنا زہر اتار رہے تھے۔ اس درجہ اذیت بھرا کڑا وقت شاید ہی کبھی اس پہ آیا ہو، لیکن وہ اتنی بے بس تھی کہ چاہ کر بھی خود کو اس سزا سے نجات نہیں دلا سکتی تھی۔ اس کی ذات یکایک حالات اور زمانے کے رحم و کرم پہ آپڑی تھی جواب اس کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کر سکتا تھا اور اسے اف تک کرنے کی اجازت نہ تھی کہ وہ ایک اغوا شدہ لڑکی تھی۔ جس کی پاک دامنی کی گواہی دینے کے لیے کوئی معجزہ رونما نہیں ہونے والا تھا اور خود اس کی بات پہ کسی کو یقین نہیں آنا تھا۔ شاید اس کے اپنوں کو بھی نہیں۔

اپنوں کا خیال آتے ہی اس کی آنکھیں ایک بار پھر زار و قطار برسنے لگی تھیں۔ پتا نہیں اس عرصے میں ان پہ کیا گزری تھی۔ اس کے بابا نے تنہا نجانے کیا کچھ جھیلا تھا۔ کیسے کیسے سوالوں کا سامنا کیا تھا؟ وہ جتنا سوچ رہی تھی اسے اتنا ہی خود سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جو اپنے باپ کے لیے اس عمر میں رسوائی کا سامان بن گئی تھی۔ پہلے بھی صرف اس کی وجہ سے اس کی ماں ان لوگوں کو روتا چھوڑ گئی تھیں۔

ابھی تو وہ اپنی وجہ سے ہونے والے اس پہلے ناقابل تلافی نقصان کی بھرپائی نہیں کر پائی تھی کہ وہ یہ دوسرا ناقابل برداشت غم اپنے بابا کو دے بیٹھی تھی۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا ہوا تو؟ اور اس تو کے آگے انابیہ کو اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی برستی آنکھوں میں یک لخت ڈر پھیل گیا تھا۔

گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے وہ دیوانہ وار اٹھ کر باہر کی جانب بھاگی تھی۔ اسے ابھی اور اسی وقت اپنے گھر جانا تھا۔ دوڑتے قدموں سے راہداری عبور کرتی وہ اس انیکسی نما چھوٹے سے پورشن کا داخلی دروازہ دھکیلتی برآمدے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ سامنے سے آتے شخص سے بری طرح ٹکرا گئی تھی۔ لیکن اس پہلے کہ وہ نیچے گرتی دو مشفق بازوؤں نے اسے نرمی سے تھام لیا تھا۔

"انابیہ میری بچی۔" نظریں اٹھانے پہ جو چہرہ اسے نظر آیا تھا، وہ اسے پیارے بابا کا تھا۔

"بابا، بابا جان!" چیخ مارتے ہوئے وہ ان سے لپٹ گئی تھی اور پھر اس کے آنسوؤں اور چیخوں نے جیسے در و دیوار کو ہلا ڈالا تھا۔ احسان فاروق کے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ وہ مسلسل اس کا سر چومے جا رہے تھے۔

باپ بیٹی کے اس ملاپ پہ وہاں موجود محسن فاروق اور اجمل نیازی دونوں کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔



تیمور کو کتنی دیر ہو گئی تھی بے مقصد سڑکوں پہ

گاڑی دوڑاتے ہوئے، مگر دل و دماغ اب بھی کسی ایک سمت میں سوچنے سے قاصر تھے۔ لامتناہی سوچوں کا ایک سلسلہ تھا جو ماضی اور حال کے گرد گھوم گھوم کے اس کے دماغ کو اتنا الجھا گیا تھا کہ اس کی خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا چاہ رہا ہے، کیوں اتنا بے کل ہو رہا ہے؟

ایسے میں جب اس کے پیر بالآخر تھک کر بریک پہ پڑے تو وہ جیسے خود میں لوٹ آیا۔ لیکن اگلے ہی پل اسے شدید قسم کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ نیازی صاحب کے گھر کے باہر کھڑا تھا۔

نچلا لب دانتوں تلے دبائے وہ کتنی ہی دیر ایک ٹک سامنے موجود سیاہ گیٹ کو دیکھتا رہا تھا اور پھر جیسے اک ٹرانس کی کیفیت میں وہ دروازہ کھول کے باہر نکل آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیسے آپ کا شکر ادا کروں۔ آپ نے مجھ پہ جو احسان کیا ہے، میں اس کا بدل مر کے بھی نہیں دے سکتا۔" وہ تینوں اجمل نیازی کے ہمراہ ڈائننگ ٹیبل پہ ناشتے کے لیے بیٹھے تھے، لیکن احسان صاحب اور انابیہ نے سوائے ایک ایک کپ چائے کے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

احسان فاروق تو مارے خوشی اور تشکر کے ہر چیز بھولے بیٹھے تھے۔ اجمل صاحب نے نہ صرف ان کی بیٹی کو بازیاب کروایا تھا۔ بلکہ اسے تھانے جانے کی اذیت سے بھی بچالیا تھا۔ لیکن انابیہ کا دھیان مسلسل رفعت بیگم کی طرف تھا، جنہوں نے اب تک اپنے کمرے سے باہر جھانکنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ ان کے کل رات کے تیور اسے اندر ہی اندر ہولائے دے رہے تھے۔ وہ اب کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں انابیہ سوچ سوچ کے پریشان ہو رہی تھی۔

"پلیز احسان صاحب! اب اگر آپ نے مزید ایک بار بھی میرا شکریہ ادا کیا ناں تو میں سخت ناراض ہو جاؤں گا۔ ویسے بھی آپ کے اس شکریہ کا اصل حق دار میں نہیں بلکہ ہمارا ایک بہت ہونہار اور قابل آفیسر ہے۔ جس نے صحیح معنوں میں اپنی جان پہ کھیل کے نہ صرف انابیہ کو بچایا ہے بلکہ اس گروہ کے بہت سے اہم بندوں کو گرفتار بھی کروایا ہے۔" نیازی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تو انابیہ کی آنکھوں کے آگے تیمور کا چہرہ گھوم گیا۔ خود سے نگاہیں چراتے ہوئے اس نے بے اختیار ٹھنڈی ہوتی چائے کا کپ اٹھا کے لبوں سے لگالیا۔

"جزاک اللہ۔ اللہ تعالیٰ اسے صحت و تندرستی کے ساتھ ڈھیروں کامیابیوں سے نوازے۔ آپ مجھے اس سے ضرور ملوائیے گا۔" احسان صاحب اس ان دیکھے فرشتے کے حق میں دعائیں کرتے ہوئے بولے۔

"ضرور۔ آپ میرے ساتھ آفس چلیے گا، میں وہاں آپ کی اس سے ملاقات....."

"السلام علیکم سر۔" نیازی صاحب کی بات ابھی منہ میں تھی کہ ملازم کی معیت میں اندر آتے تیمور کے سلام نے سب کو دروازے کی جانب دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا اور احسان فاروق جو اپنے دھیان میں آنے والے کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔ اپنی جگہ پہ ساکت رہ گئے تھے۔

"آؤ، آؤ تیمور! بڑی لمبی عمر ہے تمہاری۔ میں ابھی احسان صاحب کو تمہارے ہی بارے میں بتا رہا تھا۔" مسکراتے ہوئے انہوں نے اٹھ کر تیمور کا استقبال کیا جو خود بھی احسان صاحب کو اپنے روبرو پا کے ایک لمحے کو جھجک گیا تھا۔

"احسان صاحب! یہ ہے ہمارا ہونہار اور قابل آفیسر تیمور، جس نے انابیہ بیٹی کو بازیاب کروایا ہے۔" انہوں نے فخر سے تیمور کے شانے کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے احسان صاحب سے متعارف کروایا تو وہ ایک نظر بیٹی کے جھکے چہرے پہ ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں اٹھتا دیکھ کے تیمور نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔

"جیتے رہو، خوش رہو بیٹا۔ اللہ تمہیں بہت سی کامیابیوں سے نوازے۔" آنکھوں میں اداسی لیے انہوں نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کے اس کا شانہ تھپتھپایا تو تیمور کی نظریں بے اختیار جھک گئیں۔ محسن فاروق سے سلام دعا کے بعد وہ یہاں سے نکلنے کا کوئی بہانا ڈھونڈ رہا تھا جب نیازی صاحب اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

"آؤ ینگ مین! ہمارے ساتھ ناشتا کرو۔"

"نو سر! تھینک یو، میں ناشتا کر چکا ہوں۔" وہ ایک نظر انابیہ کی جھکی پلکوں پہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"چلو پھر ایک ایک کپ کافی کا ہو جائے۔ ہم بھی ناشتے سے فارغ ہو چکے ہیں۔" وہ دوستانہ لہجے میں کہتے انابیہ کی جانب پلٹے۔ "انابیہ بیٹا!"

"جی انکل!" وہ چونکتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی تو نظریں بے اختیار اجمل صاحب کے ساتھ کھڑے تیمور کی نظروں سے جا ٹکرائیں۔ جو ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد غیر محسوس انداز میں رخ موڑ گیا۔ اس کا یوں رخ موڑنا نا بھی انابیہ کے دل میں اک سوئی سی چبھو گیا۔

"بیٹا! آپ کو کافی بنانا آتی ہے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو بس پھر بیٹا! ہم سب کے لیے شان دار سی کافی تیار کرو۔ کیونکہ آپ کی آنٹی سو رہی ہیں اور اس ناصر کے ہاتھ کی کافی پینے سے بہتر ہے کہ ہم گرم کڑوا پانی ہی لیں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے شگفتگی سے بولے تو انابیہ کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ اپنی چھب دکھلا کے غائب ہو گئی۔

ناصر کو بلوا کے انابیہ کو کچن میں لے جانے کا کہہ کے وہ سب ڈائننگ روم سے ملحقہ ڈرائنگ روم میں چلے آئے تھے۔

اپنے اندر شور مچاتی ڈھیروں سوچوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے انابیہ نے کافی تیار کی تھی اور پھر کپ ٹرے میں رکھے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ڈرائنگ روم کی طرف چلی آئی تھی۔ جہاں اب موضوع گفتگو ملک کے موجودہ سنگین حالات تھے۔

سب بریوں کو کافی سرو کرنے کے بعد وہ تیمور کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے انابیہ پہ اک نگاہ غلط ڈالے بنا کپ اٹھا لیا۔ اس کی بے نیازی پہ وہ ایک خاموش نظر اسی پہ ڈالتی پلٹ گئی تو تیمور کی بے چین نگاہیں بے اختیاری کے عالم میں اس کی پشت پہ جا ٹھہری تھیں۔ دل میں موجود کسک اسے اپنے سامنے پا کے بڑھنے لگی تھی۔

اپنے اضطراب کو چھپانے کے لیے اس نے گرم کافی کا بڑا سا گھونٹ لیا تھا اور اگلے ہی لمحے ٹھٹک کر اس کی نظریں اپنے کپ کی طرف اٹھی تھیں۔ پیالی میں بلیک کافی بغیر شکر کے موجود تھی۔ اس کی پسند کے عین مطابق۔ میکانکی انداز میں اس نے دوسرے کپوں کی طرف دیکھا تھا' جہاں دودھ والی کافی تھی اور تیمور کے لیے اپنے دھواں دھواں ہوتے دل کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

کس حق سے اس نے تیمور کی پسند ناپسند کو یاد رکھا تھا جب وہ خود تیمور کی ذات کو ہی فراموش کر بیٹھی تھی۔

سلگتی آنکھوں سے اس نے دروازے کی جانب دیکھا تھا جہاں سے انابیہ باہر نکلی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جا کر اس بے حس لڑکی کو جھنجھوڑ کے رکھ دے۔ جس نے اسے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

ہاتھ میں پکڑا کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے وہ لب بھینچے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"یہ تم کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہو؟" محسن فاروق کی بات سنتے اجمل صاحب نے حیرت سے تیمور کی جانب دیکھا تو وہ بمشکل تمام خود پہ قابو پاتے ہوئے بولا۔

"سر! وہ ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ اس لیے مجھے اجازت دیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے چلے جانا' لیکن کافی تو ختم کر کے جاؤ۔"

"نو سر! مجھے دیر ہو جائے گی۔" ان کے اصرار پہ اس نے شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے آگے بڑھ کے احسان صاحب سے ہاتھ ملانا چاہا تو انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے تیمور کو گلے سے لگا لیا۔ جو شفقت کے اس اظہار پہ حیران رہ گیا تھا۔

"بہت شکریہ تیمور! میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔" وہ اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے بھیگی ہوئی دھیمی آواز میں بولے تو تیمور کو اپنے حلق میں پھندا سا پڑتا محسوس ہوا۔

"یہ تو میرا فرض تھا سر۔" اپنے جذبات پہ قابو پاتے ہوئے وہ ان سے الگ ہوا تو احسان صاحب کا ہاتھ اس کے شانے پہ آ ٹھہرا۔

"سلامت رہو' اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

ان کی دعا پہ بے اختیار ایک پھیکی سی مسکراہٹ تیمور کے لبوں کا احاطہ کر گئی تھی۔ احسان صاحب سے دعائیں لینے کے بعد وہ محسن فاروق اور نیازی صاحب سے مل کر دروازے کی طرف بڑھا تھا' لیکن سامنے رفعت بیگم کے ساتھ ایک عورت اور ایک لڑکے کو ایستادہ پا کے وہ بے اختیار رک گیا تھا۔

"ارے آپ لوگ؟ آپ لوگ کب آئے؟" اس سے پہلے کہ تیمور' رفعت بیگم کو سلام کرتا' نیازی صاحب کی حیران پریشان سی آواز نے اسے ان کی طرف دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

نیازی صاحب کے چہرے سے پریشانی واضح طور پہ جھلک رہی تھی' بلکہ صرف ان ہی کے نہیں محسن فاروق کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جبکہ احسان صاحب کی تو کاٹو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت دیکھ کے وہ خود بھی بری طرح الجھ گیا تھا۔

"ابھی آئے ہیں۔ حالانکہ میں نے تو رات کو ہی فون کر دیا تھا۔" سینے پہ بازو لپیٹے رفعت بیگم کاٹ دار مسکراہٹ لبوں پہ سجائے بظاہر نارمل لہجے میں بولیں تو اجمل نیازی کے لب مارے غصے کے بھنچ گئے۔

ان کے تیوروں پہ ایک استہزائیہ نظر ڈالتے ہوئے وہ تیمور کی جانب پلٹی تھیں۔

"کیسے ہو تیمور؟" اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بنا وہ پیچھے کھڑی خاتون سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ "آپا! یہ ہے ناں وہ آفیسر جس نے آپریشن کر کے انابیہ کو بازیاب کروایا ہے۔" ان کی بات پہ اس خاتون نے ایک نظر تیمور پہ ڈالتے ہوئے سامنے کھڑے احسان فاروق کی جانب دیکھا تھا۔ جبکہ اس لڑکے کی پیشانی پہ یک لخت بل سے نمودار ہو گئے تھے۔

"اور تیمور! یہ ہے میرا بھانجا عمر اور یہ ہیں میری بڑی بہن۔ عمر اور انابیہ کی منگنی ہو چکی ہے' اسی لیے میں نے انہیں یہاں بلایا ہے تاکہ اپنی بہو سے مل لیں۔" رس ٹپکاتے لہجے میں انہوں نے آنے والوں کا تعارف بظاہر تیمور سے کرواتے ہوئے در پردہ سامنے کھڑے تینوں حضرات کو سنایا تھا۔

اس حقیقت سے بے خبر کہ ان کے اس تعارف نے تیمور منہاج کے دھڑکتے دل کو ایک پل کے لیے ساکت کر ڈالا تھا۔

شل ہوتے دماغ کے ساتھ اس نے خالی آنکھوں سے سامنے کھڑے لڑکے کی جانب دیکھا تھا جس کا دھیان پوری طرح احسان صاحب کی طرف تھا۔ لیکن جس پر سے تیمور کا دھیان اب شاید ساری زندگی ہٹنے والا نہ تھا۔ کیونکہ یہ وہ چہرہ تھا جسے اس کی محبت نے اس پہ فوقیت دی تھی۔ جو انابیہ احسان کا آج اور آنے والا کل تھا اور وہ اس کا بیتا ہوا کل۔ جس کی کوئی وقعت' کوئی حیثیت نہ تھی۔ جو محض ماضی کا ایک حصہ تھا۔ ایسا حصہ جسے انابیہ احسان نے فراموش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ اور وہ......

بے اختیار اسے چند گھنٹے پیشتر اپنی ماں سے ہونے والی تلخ کلامی یاد آئی تھی اور اس کے لب سختی سے بھنچ گئے تھے۔

"پلیز ایکسکیوز می۔" مزید کچھ کہے سنے بنا وہ سرد لہجے میں کہتے ہوئے سرعت سے ان کے قریب سے نکلتا باہر چلا آیا تھا۔

اس کے اندر برپا طوفان نے اتنا شور مچا رکھا تھا کہ سے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

تیز قدموں سے راہداری عبور کرتے ہوئے وہ اس [illegible] جب برآمدے میں ہلر سے لگے وجود نے اس کے بڑھتے قدموں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

عین اسی لمحے چپ چاپ آنسو بہاتی۔ انابیہ نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھائی تھیں اور خود سے چند فٹ کے فاصلے پہ کھڑے تیمور کی سنہری آنکھوں سے نگاہیں ہٹانا بھول گئی تھی۔ جو اس پل لہو رنگ ہو رہی تھیں۔

اس کے یہ تیور انابیہ نے آج سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت کے باعث سرخ ہو رہا تھا۔ لب سختی سے اس طرح ایک دوسرے میں پیوست تھے کہ جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ جبکہ ہاتھ مٹھیوں کی صورت بھنچے ہوئے تھے۔

اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ جس کی تپش سے انابیہ کو اپنا آپ جلتا محسوس ہوا تھا۔

"تو وہ جان گیا تھا کہ عمر سے اس کا کیا تعلق ہے۔"

متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے یہ احساس بڑی شدت سے اس کے اندر جاگا تھا اور انابیہ کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا تھا۔ حالانکہ وہ کسی طور نہ تو اس کے آگے جواب دہ تھی اور نہ ہی اس کی پابند۔ مگر پھر بھی اس کے لیے مزید ان آنکھوں میں دیکھنا ممکن نہ رہا تھا۔

اسے یوں نظریں چراتا دیکھ کے تیمور کا دل چاہا تھا کہ وہ انابیہ احسان کو بے نقط سنائے' اتنی کہ وہ اس کی نفرت کے احساس سے نیلی ہو جائے۔ مگر اب وہ اس پہ اپنا کوئی احساس ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کوئی بھی نہیں!

پاس پڑے گملے کو زوردار ٹھوکر لگاتے ہوئے وہ اک قہر رسائی نگاہ اس کے جھٹکے سے اوپر اٹھنے والے زرد چہرے پہ ڈالتا ہوا تیز قدموں سے اس کے قریب سے نکلتا چلا گیا تھا اور پیچھے کھڑی انابیہ' جو پہلے ہی اس سے اپنی گزشتہ روز کی بدگمانی پہ معافی مانگنے کے لیے بے چین تھی' پھپھک کے رو پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

وقت کی عدالت میں

زندگی کی صورت میں
جو میرے ہاتھوں میں
اک سوالنامہ ہے
کس نے یہ بنایا ہے؟
کس لیے بنایا ہے؟
کچھ سمجھ میں آیا ہے؟
زندگی کے پرچے کے
سب سوال لازم ہیں
سب سوال مشکل ہیں

اغوا شدہ اور گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا معاشرہ دونوں سے ایک سا سلوک کرنے کا عادی ہے۔ حالانکہ ایک مظلوم ہوتی ہے اور دوسری ظالم۔ ایک ہمدردی ' پیار اور نرمی کی مستحق ہوتی ہے اور دوسری سزا اور نفرت کی لیکن ہمارے ہاں دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا جبکہ جتنی توجہ اور سہارے کی ضرورت ایک اغوا شدہ بے گناہ لڑکی کو ہوتی ہے اتنی تو شاید کسی کو بھی نہیں ہوتی۔

اس پہ آنے والی سختی کو ہمارے بدصورت رویے مزید سخت بنا دیتے ہیں۔ اتنا کہ بعض اوقات تو زندہ رہنا مشکل لگنے لگتا ہے اور مرنا آسان۔

اور یہی انابیہ کے ساتھ ہوا تھا۔ جس کی زبان حالات نے تالو سے لگا چھوڑی تھی۔

عمر اور اس کی والدہ نے نہ تو احسان فاروق کی کسی منت سماجت پر کان دھرے تھے اور نہ ہی انابیہ کے آنسوؤں پر یقین۔ انہوں نے صرف فیصلہ سنایا تھا اور بس!

احسان صاحب کی نیکی ' سچائی اور شرافت اور انابیہ کی اچھائی ' جس کے وہ لوگ کل تک خود گن گاتے پھرتے تھے یکایک بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا جو راتوں رات ان کی زندگی بھر کی کمائی ہوئی عزت پہ لگا دیا گیا تھا اور جسے مٹانے کے لیے اگر انابیہ اپنا خون بھی بہا دیتی تو کوئی یقین کرنے والا نہ تھا کہ اس کا خون بھی اس کی ذلت کی طرح بے مول ہو چکا تھا۔

واپسی کا سارا راستہ جامد سناٹے کے ساتھ کٹا تھا۔ وہ اپنے باپ سے نگاہیں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ جن کے اترے ہوئے زرد چہرے پہ زمانے بھر کی تھکن آن ٹھہری تھی۔ آنکھوں کی سرخی ان کے ضبط کی گواہ تھی اور لبوں پہ لگی چپ کی مہران کی لامتناہی سوچوں کی غماز۔

ان کی یہ حالت ہر ہر لمحہ انابیہ کے وجود پہ کوڑے بن کر برستی رہی تھی۔ وہ خود کو ان کا مجرم سمجھ رہی تھی ' جس کی وجہ سے ان کی خوشیاں ' سکون اور عزت ایک بار پھر تار تار ہو کے رہ گئی تھی۔ اس کے لیے خود کو معاف کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔

بہن کی محبت بھری آغوش میں سماتے ہوئے وہ ٹوٹ کر اپنے ہر نقصان پہ روئی تھی.... اتنا کہ حوصلوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ مومنہ کے بازوؤں میں ہی جھول گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دل کی وحشتیں جب حد سے سوا ہو جائیں تو کہیں جائے پناہ نہیں ملتی۔ کوئی آواز ' کوئی چہرہ باعث سکون نہیں بنتا ' حتیٰ کہ خود اپنا وجود بھی ناقابل برداشت بوجھ کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ کچھ یہی عالم تیمور منہاج کے بے چین دل کا بھی تھا۔

نیازی صاحب کے گھر سے نکل کے وہ سارا دن سڑکوں کی خاک چھانتا رہا تھا ' لیکن دل میں کروٹیں لیتا درد کسی طور کم نہیں ہوا تھا۔ اپنے جذبوں کی بے قدری ' اپنی ذات کی نفی اور اپنے وقت کی بربادی نے اسے احساس زیاں میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ جتنا سوچ رہا تھا ' اسے اتنا ہی خود پہ اور اپنی فضول محبت پہ افسوس ہو رہا تھا ' جس نے ایک خود غرض اور ضدی لڑکی کے پیچھے نہ صرف اپنا دل برباد کر لیا تھا بلکہ اپنے ماں باپ کو بھی تکلیف پہنچائی تھی۔

در حقیقت انابیہ احسان اس درجہ محبت اور وفا کے قابل ہی نہیں تھی [illegible] سمجھنے میں بہت وقت لگ گیا تھا۔

مگر اب اس حقیقت کے سمجھ میں آ جانے کے بعد وہ مزید ایک لمحہ اس بے مہر کی یاد میں ضائع کرنے والا نہ تھا پھر چاہے اس کا دل اس کے اس فیصلے کو قبول کرتا یا نہیں ' اس نے بھی آگے بڑھنے کی ٹھان لی تھی۔

خود سے ایک طویل جنگ لڑنے کے بعد وہ تھکا ہارا جس وقت گھر لوٹا ' سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد وہ اندر جانے کے بجائے لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پہ نڈھال سا آ کر گر گیا تھا۔

سر کرسی کی پشت پہ ٹکاتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنی جلتی ہوئی آنکھیں موند لی تھیں اور تب ہی پلر کے ساتھ کھڑی ' خاموش آنسو بہاتی انابیہ کا چہرہ اس کی بند پلکوں تلے آ سمایا تھا۔

نچلا لب دانتوں تلے دبائے اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا تھا۔ لیکن یادیں ایک بار پھر اس کے دامن سے لپٹنے لگی تھیں۔

وحشت زدہ سا ہو کر وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھا تھا۔

اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ اپنے کمرے کا دروازہ دھکیل کے اندر چلا آیا تھا اور پھر بنا رکے دیوار گیر الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

سرعت سے الماری کھول کر ' اس نے اندر موجود سیف کو ان لاک کرتے ہوئے سنبھال کر ایک طرف رکھا گلابی لفافہ نکالا تھا۔

سیف اور الماری یونہی کھلی چھوڑ کے وہ لب بھینچے سائیڈ ٹیبل کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ ایک جھٹکے سے دراز کھینچتے ہوئے اس نے اندر پڑا لائٹر اٹھا کر شعلہ جلایا تھا اور پھر کتنی ہی دیر اسے خالی نظروں سے دیکھنے کے بعد ہاتھ میں پکڑے لفافے کے ایک کونے سے چھو دیا تھا۔

اگلے ہی پل آگ لفافے کو نگلنے لگی تھی اور تیمور کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں بھینچ دیا ہو۔

تڑپ کر اس نے لفافے کو زور زور سے دائیں بائیں ہلاتے ہوئے منہ سے بھی پھونکیں ماری تھیں۔ جس کے نتیجے میں آگ فوراً" ہی بجھ گئی تھی۔ لیکن لفافے کا وہ کونا جل کر سیاہ ہو گیا تھا۔

شدید دکھ کی کیفیت میں گھرے ہوئے اس نے سرخ آنکھوں میں درد کے ڈورے لیے ' اس کونے کو دیکھا تھا ' جس میں سے دھواں ایک لکیر کی صورت نکل کر ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔

وہ کیسے اس تحریر کو جلا سکتا تھا جو کبھی اس کے لیے مژدہ جاں فزا بن کے آئی تھی۔

شکستہ سے انداز میں بیڈ پہ گرتے ہوئے اس نے لفافے میں موجود پرچا نکال کر کھولا تھا اور وہ موتیوں سے الفاظ ایک بار پھر اس کے سامنے بکھر گئے تھے۔

بے اختیاری کے عالم میں اس کی نظریں ' کتنی ہی بار پڑھے گئے اس پیغام پہ ایک بار پھر پھسلنے لگی تھیں۔ لیکن آخری سطر تک پہنچتے پہنچتے ساری تحریر دھندلا گئی تھی۔ سارا منظر ڈبڈبا گیا تھا اور ذہن چار سال پیچھے چلا گیا تھا۔

☼ ☼

(دوسرا اور آخری حصہ آئندہ ماہ)

سائرہ رضا

یار وفا کرو

"پتا نہیں میں کیوں ہر سال یہ خوب صورت رات برباد کرنے کے لیے تمہارے ساتھ یہاں آجاتا ہوں۔" گورے چٹے بلکہ لال سرخ رنگت والے بٹ صاحب نے حسب معمول بیس منٹ کی خاموشی سے اکتا کر اپنا مخصوص جملہ کہا۔

"اور گوتم بدھ کی طرح دھونی رما کر نہ جانے کون سا گیان حاصل کرتے ہو' جو چالیس برس سے مکمل نہیں ہوا۔"

یہ بھی جانا پہچانا جملہ تھا' میاں صاحب کے لیے' سو ان کا انہماک کم نہ ہوا۔

وہ سنگی بینچ پر ایستادہ ڈوبتے سورج کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔ دن کی تیز روشنی میں سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا کہاں ممکن ہوتا ہے۔ سورج اپنے جوبن کے نشے میں گستاخی کے مرتکب کی آنکھوں میں مرچیں بھر دیتا ہے' مگر اس وقت وہ ڈوب رہا تھا۔ زرد' سرخ' نڈھال' اس کی ساری کرنیں سمندر پی چکا تھا اور اس کی لہروں میں اب مستی تھی۔

میاں صاحب رخصتی پر مائل اسی سورج سے ہم کلام تھے۔ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے تھے۔ سورج کا فسوں دم توڑ چکا تھا۔ مگر پتا نہیں کیوں ان کی آنکھوں میں چبھن تھی اور پلکیں جھپک کر آنسوؤں کو پچھاڑنے کی کوشش بٹ صاحب کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔ قصداً" خفا زدہ سے لہجے میں انہیں ٹوکا۔ حال میں واپس لانے کی کوشش۔۔۔

میاں صاحب نے چونک کر بٹ صاحب کا چہرہ دیکھا۔ جہاں لاپروائی' بے زاری چھائی تھی' وہ بچوں کی طرح منہ بسور کر گردوپیش کو دیکھتے تھے۔ (لیکن حقیقت میں بٹ صاحب نے میاں صاحب کی آنکھوں میں تیرتے دکھ' پچھتاوں' بیتے برسوں کے نوحوں سے آنکھ بچائی تھی۔)

معنی خیز خاموشی دونوں کے تن من کو پھونکنے ہٹ دھرمی سے بینچ کے گرد طواف کرنے لگی' بتدریج بڑھتی تپش۔۔۔ حسب عادت بٹ صاحب ہی پہلے بولے۔

"سو آج تم نے اس ڈوبتے سورج سے کیا سبق سیکھا؟"

"کچھ بھی نہیں' جو خود ڈوب رہا ہو' وہ کسی کو کیا تلقین کر سکتا ہے۔" میاں صاحب نے ٹھنڈی سانس بھری۔

دھیرے دھیرے پگھلتا سورج' زبان پر دھری مکھن کی ڈلی بن گیا اور غیر محسوس طریقے سے سمندر نے اسے ہڑپ کر لیا۔ اپنے کارنامے پر نازاں لہریں مست ہو کر سفر کرتی تھیں۔

"تم حسب معمول مایوسی پھیلانے بیٹھے ہو۔ پتا نہیں میں کیوں تمہارے ساتھ آجاتا ہوں۔ بس اس مرجانے کو تکتے رہنا۔ تمہیں یہ گول گپے' یہ چٹ پٹی چاٹ' یہ دہی بڑے آخر نظر کیوں نہیں آتے؟"

"اور میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم پریگننٹ عورتوں کی طرح ان چیزوں کو دیکھ کر کیوں رال ٹپکاتے ہو۔ یہ مٹکے جیسا پیٹ پہلے ہی شے میں مبتلا کرتا ہوا ہے مگر خدا کے بندے ان چنگیزی مونچھوں کی لاج رکھو۔" بٹ صاحب کو کھٹی مسالا دال کی پڑیا بنواتے دیکھ کر میاں صاحب بھنا گئے تھے۔

بٹ صاحب نے گویا لوٹ پوٹ ہو کر قہقہہ لگایا۔ ان کا مشکیزہ لپک لپک کر ہلتا تھا۔

"یہ تم سوتنوں کی طرح مجھ سے جلنا کب چھوڑو گے؟"

"کون کہے گا بٹ صاحب جانے مانے حکیم خانوادے کے آخری حکیم ہیں۔۔۔ آخری اس لیے کہ تمہارا بیٹا ڈاکٹر ہے اور حکیم و ڈاکٹر ایک دوسرے کا الٹ ہوتے ہیں' سمجھے جناب محترم حکیم یعقوب بٹ۔۔۔ ہونہہ!" میاں صاحب نے آگ لگانی چاہی' مگر آگے بٹ صاحب کا لال چہرہ فلک شگاف قہقہے کے باعث انار بن گیا' ہاہاہا۔

"بات یہ ہے کہ می ایں (میاں) دراصل میں نے اس چیز کو سمجھ لیا ہے کہ میں ان چیزوں کو کھاؤں یا نہ کھاؤں' جینا مجھے اتنا ہی ہے جتنا کہ لکھ دیا گیا' تو پھر پرہیز کے نام پر دل کیوں ماروں' دیر ہی سے سہی عقل آگئی تو بھی جی نہ جلایا کر۔۔۔ لے کھا کے دیکھ۔" بڑی بے تکلفی سے پڑیا ان کے چہرے کے آگے کر دی۔

"اونہوں۔۔۔" وہ کتراتے ہوئے پیچھے ہوئے۔

بٹ صاحب نے شانے اچکاتے ہوئے خود ہی پھکا بھر لیا۔

"اب یہ کون سی کتاب کھول لی ہے تو نے ساحل پر نیو ایر نائٹ پر آکر۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔" آگے ہو کر سرورق کو دیکھا۔

"اشفاق کی زاویہ۔۔۔ او میرے مالک۔۔۔" وہ اپنے چند بال نوچنے لگے' "یہ وقت اس ٹھنڈی لہر جیسی کتاب پڑھنے کا نہیں' سکون' شانتی۔۔۔ ہونہہ یہ وقت ہے ون ویلنگ کا۔۔۔ ناچنے' جھومنے' گانے کا اور تو۔۔۔ ارے میرے مالک! تیری وجہ سے میں چالیس سال سے اتنی ہی اداس سڑی ہوئی نیو ایر نائٹ مناتا ہوں۔ او تیرا قصور نہیں' میں ہی مومن نہیں جو ہر بار ایک ہی سوراخ سے۔۔۔ ہائے۔"

"یہ بہت معنی آفرین کتاب ہے' بٹ۔۔۔ میاں سعادت امتیاز کا لہجہ کھویا کھویا تھا۔ "بہت معنی خیز' اسرار۔۔۔ بھید کھولتی کتاب۔"

"او میں اپنی زندگی میں ایک ہی معنی آفرین کتاب کو جانتا ہوں اور وہ ہے "فیروز اللغات" اس سے زیادہ معنی اور کس میں ہوں گے' بلکہ اس میں تو ہر چیز کے معنی ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ تو وہ بچوں کے پڑھنے کے قابل بھی نہیں لگتی' اب جیسے اس دن۔۔۔" بٹ صاحب لاپروائی سے کہتے ہوئے ٹوہ لینے کے انداز میں جھکے' دھیرے سے کچھ کہا۔



"مجھے یقین ہے، بٹ یقین ہے، بٹ تم ایسے ہی جملوں کے معنی ڈھونڈنے کے لیے لغت کھولتے ہو۔" میاں صاحب کو پہلے غصہ آیا۔ پھر بٹ کے جملے کو ری کال کیا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی آرکی۔ مگر سر جھٹکتے ہوئے کتاب کھول لی۔

"یہ ٹوٹے انسان کو جوڑنے والی کتاب ہے، بے یقینی کا شکار لوگوں کے لیے ڈھارس، متزلزل ایمان والوں کو تیقن دینے والی کتاب ہے۔ الفاظ، جملے، نقطے، ڈاٹ اور کامے تک سیکھ دیتے ہیں۔ سمجھ کو نکھارتے ہیں۔ یہ کتاب ذہن کے کینوس کو وسیع کرتی ہے۔ آپ کو دور تک نظر آنے لگتا ہے۔ کچھ کرنے پر آمادہ کرتی اکساتی ہوئی کتاب کہ سب ہوسکتا ہے، ڈپریشن کی حالت میں آرام دے۔"

"اوئے سعادت! تو کہاں تک دیکھنا چاہتا ہے۔ ساحل پر بیٹھا ہے، سمندر اور آسمان کے سروں تک دیکھ رہا ہے۔ پھر بھی حسرتیں نہیں مٹتیں تیری... جا شاباشے چاند پہ چڑھ جا... مگر تیرے جیسے شہدے کی حسرتیں پھر بھی نہیں ختم ہوتی... دور دیکھنے کی خواہش... ہونہہ... اور یہ تجھے ہر سال نیو ایئر نائٹ پر ہی کیوں ڈپریشن کے دورے پڑتے ہیں۔ تو کچی ہانڈی کی طرح ٹھیکری ٹھیکری زمین پر جا گرتا ہے۔ ناشکرا نہ ہوئے تے۔" بٹ صاحب کی جان جل کر خاک ہوگئی گویا۔

"میں خود احتسابی کے لیے یہاں آکر بیٹھتا ہوں۔ کیا کھویا... کیا پایا... حاصل وصول کی جمع تفریق کرنے... تمہیں یاد ہے ہم پہلی بار یہاں کب آئے تھے اور کیوں آئے تھے؟"

بٹ صاحب کے چہرے پر سایہ سا گزرا۔ وہ دال والے کاغذ کو جھاڑ کر کشتی بنا رہے تھے۔ ایک لاپروا بے فکر، ریٹائرڈ شخص کا سا روپ۔

18 دسمبر 1971ء بروز ہفتہ بوقت ڈیڑھ... دن کا ڈیڑھ بجا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تھی می ایں (میاں)... گھڑی کی سوئیوں کا کام بڑھتے رہنا ہے۔ جبکہ... حقیقت میں 18 دسمبر کو ساری قوم کے لیے بارہ بج گئے تھے۔"

میاں صاحب سعادت نے ٹھنڈی سانس لی۔ بٹ صاحب صرف لاپروا نظر آنے کی اداکاری کرتے تھے۔ مگر انہیں سب یاد تھا۔ ان کی یادداشت میاں سعادت سے زیادہ تیز تھی۔ مگر وہ خود سے اظہار کرنے والی فطرت نہیں رکھتے تھے۔

جبکہ میاں سعادت اپنے ذاتی اسکول کے پرنسپل تھے۔ بول بول کر ٹٹول کر باریک بینی سے بھڑاس نکالنے والے۔

"میاں سعادت! تم خود اذیتی کا شکار ہو یار... بڑی مشکل سے جمتے کھرنڈ کو اپنے ہاتھوں نوچتے تمہیں نہ جانے کیا سکھ ملتا ہے۔"

"یہ زخم نہیں ہیں، ناسور ہیں۔ وائے دس کولا ویری ڈی... جیسے ناقابل فہم گانے پر ناچیے یہ نوجوان جانتے ہوں گے؟ کہ آج سے چالیس برس پہلے دو نوجوان اس سمندر سے زیادہ بھرے دل کے ساتھ "آؤ بچو سیر کرائیں تم کو پاکستان کی" دھن کا نوحہ پڑھتے تھے۔

اور اب ہمارا یہ حال ہے کہ ہم کسی کو ایسی آفر نہیں کرسکتے۔ کس چیز کی سیر کروائیں، کراچی سے کے پی کے تک... اب کوئی چیز سیر کے قابل نہیں ہے۔ سیر گاہیں... صرف کلینڈروں تک محدود رہ گئی ہیں۔"

پرنسپل صاحب کی آنکھیں غم واندوہ سے مردہ لگ رہی تھیں۔ حکیم صاحب بہت دیر تک کچھ بول ہی نہ سکے۔ مگر پھر انہیں خود ہی اپنے غم سے ابھرنا تھا۔ سال کی یہ آخری رات دونوں کو یادوں کے سمندر میں غوطے دیتی تھی اور دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا بنے ابھرنے کی کوشش کرتے تھے۔

"آؤ دیکھیں، وہ لڑکا آج کیا بنا رہا ہے۔" وہ دونوں سی ویو پر تھے۔ سرِ شام ہی ساحل پر رونق ہوجاتی تھی۔ پانی کے اندر کھڑی ریڑھیاں، چاٹ، گول گپے، برگر، پیٹز، سینڈوچز... بھٹے بھونتے پٹھان کی ریڑھی سے اٹھتی خوشبو، ننگے پیر پانی میں کھڑے لوگ ہر شے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ گھوڑے اور اونٹ سجے بنے بچوں کو للچاتے ہوئے پانی سے بچ بچ کر چلتے تھے، کہیں سے باربی کیو کی خوشبو اشتہا بڑھاتی، تو کہیں باؤنڈری وال کے ساتھ مچھلی والے جیٹ پٹی مچھلی تل تل کر بڑے تھال میں سجاتے متوجہ کرنے کی کوشش، دیکھ بھی لو، سونگھ تو رہے ہو۔

آئس کریم اور کولڈ ڈرنک، تمہارے پھونک سے بھرنے والے کھلونے، جلتی بجھتی لائٹیں، بلبلے بناتے بچے، بلکہ بڑے بھی... ریڑھیوں پر اپنے ذاتی ڈیک ہوتے جس کا موڈ ہو نزدیک چلا جائے کچھ جیب ڈھیلی کرے، پیٹ کی بھوک بھی مٹائے اور روح کی بھی۔

کچھ من چلے پلاسٹک کی کرسیاں کرائے پر لے کر زیادہ سے زیادہ آگے جاکر رکھ کے بیٹھ جاتے کہ ہم جمے رہیں گے۔ لہریں جتنی بھی منہ زور ہوں گی۔

(نوجوانوں کے عزم وہمت کا مظاہرہ اب یہیں تک محدود رہ گیا ہے۔)

جھٹ پٹ تصاویر بنا کر دینے والوں کا دھندا موبائل فونز نے کب کا چوپٹ کردیا۔

ہر کسی کے پاس فون ہے، جس وقت جتنے مرضی پوز پہ پوز، کچھ خود پسند اپنے ہی فون سے خود ہی اپنے پوز لیتے ہوئے مزے اٹھاتے۔ فون دور... فون نزدیک، دایاں گال اور بایاں گال اوپر تھوڑے بال، کھچ...

مگر جھٹ پٹ کیمرے والے پھر بھی فوٹو البم کھول کے دکھاتے، گلے میں کیمرہ لٹکائے لوگوں کو متوجہ کرتے تھے۔ شاید آمدنی ہوتی ہو، پتا نہیں۔

باؤنڈری وال کے اندر والے فٹ پاتھ پر سیپیوں سے بنی چیزیں بیچنے والوں کی دکان داری تھی۔ ہار، بندے، کی چین، ٹشو پیپر بکس، تصویروں کے لیے فریم، تاج محل اور کشتی، اللہ، محمد کے نام کے طغرے اور آیت قرآنی...

آنے والے کچھ نہ کچھ تو خرید ہی لیتے یادگار کے طور... دس روپے سے ہزار روپے تک کے آئٹمز... رونق، خوشی، ہوا، نمی ٹھنڈ، پیروں سے ٹکراتی منہ بند، کچھ ٹوٹی پھوٹی سیپیاں، ساحل کی ریت پر بھاگنے والی سیپیوں کی تڑتڑ کبھی سنائی نہیں دے سکتی۔ لائف گارڈ والے کی سیٹیاں... آگے مت جانا، خطرہ ہے... پانی گہرا ہے، لہروں میں کرنٹ ہے، بلو واٹر آئی ہوئی ہیں، ڈنک مار دیتی ہیں، سی ی ی ی...

اور ان سب سے پرے لہروں سے بچ کر ریت سے مجسمے بناتا وہ سلونا نوجوان۔

اس نے ریت پر چھوٹی لکڑیاں ٹھوکیں اور ایک رسے کی مدد سے دائرہ بنا دیا۔ حد بندی۔ اب کوئی اندر نہیں آسکتا۔ مگر وہ خود اندر پھاوڑا لے کر ریت کو کھود رہا ہے۔ وہ لکڑی کے چھوٹے ٹکڑے سے کرنڈی کا کام لیتا ہے۔

وہ جل پری بناتا ہے، مزار قائد، تاج، محل، دھوپ سینکتا مرد جو ساحل پر چت لیٹا ہے، قائداعظم، اہرام مصر اور سب کچھ...

میاں صاحب اور بٹ صاحب اکثر اس کا فن دیکھنے سی ویو آجاتے، وہ دوپہر سے آکر محنت شروع کرتا اور شام کو اپنی فخریہ پیش کش کے ہمراہ ریت کے بنائے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے شان بے نیازی سے بیٹھ جاتا۔

"میں نے اپنا کام کردیا، کرسکتا ہے ایسا کوئی دوسرا تو لے آؤ۔"

وہ لوگوں کے اشتیاق بھرے چہروں کو، تجسس کو بے یقینی کو دیکھتا ہے، "اب بھی داد نہ دو گے، تو کب دو گے۔"

یہ قوم داد دینے میں اتنی دیر کیوں کردیتی ہے۔

"تمہیں پتا ہے بٹ! آسٹریلیا میں ایک شخص نے ریت پر اتنا بڑا شاہکار بنایا کہ اسے مکمل طور پر فوکس کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر کا سہارا لینا پڑا، جبکہ ہمارے ہاں...؟"

"پہلے بھی بتا چکا ہے یار!" بٹ صاحب کا سارا دھیان اس لڑکے کی جانب تھا۔ وہ گردوپیش سے بے گانہ اپنی دھن میں لگا ہے۔ اس کے گرد ہجوم بڑھ جائے یا گھٹ جائے وہ متوجہ نہیں ہوتا، پروا نہیں کرتا۔

وہ فن کا چور نہیں' اس کا ہنر خداداد ہے' سامنے ہے۔ وہ رات گئے تک نوک پلک سنوارتا ہے۔

اس کی محنت کا معاوضہ آپ بکس میں ڈال سکتے ہیں۔ کتنا۔۔۔ کتنا۔۔۔؟ اتنا جتنا آپ متاثر ہوئے ہوں۔ وہ کڑی دوپہر بے رحم سورج کے نیچے ننگے سر ریت میں لت پت ہاتھوں کے ساتھ بارہ بارہ گھنٹے محنت کر کے "حق حلال" کماتا ہے۔

"آخر یہ کتنا کما لیتا ہے؟" میاں صاحب ہمیشہ بٹ صاحب سے پوچھتے تھے جیسے وہ اس کے کیشیئر ہوں۔

"یہ تو دیکھنے والے کے ظرف اور "تسلیم" کی خو پر ہے' دیکھنے والا جتنا سحر زدہ ہوگا' اتنا ہی ہاتھ ڈھیلا کرے گا۔"

"دہشت گردی۔۔۔ کے خوف نے ہر چیز سے لطف اٹھا لیا ہے۔ سڑکیں کنٹینر لگا کر بند ہیں۔ دفعہ 144 نافذ ہے۔ اسلحے کی نمائش پر پابندی۔۔۔ مگر پھر بھی کرنے والے سب کریں گے۔" وہ دونوں آگے کی جانب بڑھنے لگے۔

"اس شہر کے حالات بہت خراب ہوگئے ہیں یار۔"

"ہوگئے یا کردیے گئے؟"

"پتا نہیں۔" میاں صاحب اٹھارہ کروڑ عوام کی طرح لاعلم تھے۔

"شہر کے نہیں' ملک کے حالات۔۔۔ تمہیں کون سی جگہ محفوظ و مامون نظر آتی ہے؟"

"ٹھیک ہے' ہر جگہ شر انگیزی ہے' مگر کراچی بندرگاہ ہے یار۔۔۔ تجارت کا گڑھ۔ محنت کرنے والا اس شہر میں بھوکا نہیں مر سکتا ہے۔ میری یادوں میں بہت رومانس ہے اس شہر کے حوالے سے۔ دھلی سڑکوں پر اولڈ کراچی میں بگھی میں تو تم اور ہم بھی گھومے ہیں۔"

"اور اب ان ہی سڑکوں پر رکشے چلتے ہیں۔ پرانے رکشے' سی این جی رکشے اور موٹر سائیکل رکشے۔" میاں سعادت استہزائیہ ہنسے۔

یعقوب بٹ نے اچنبھے سے میاں سعادت کا چہرہ دیکھا۔ میاں سعادت ریٹائرڈ فوجی تھے۔ ایک حادثے نے ان کی ٹانگ میں غیر محسوس سا لنگ پیدا کر دیا تھا۔ لنگ کو نوٹ کرنے کے لیے عمیق نگاہی کی ضرورت تھی۔ مگر حادثے کے شروع کے سال بہت تکلیف اور اذیت کے تھے۔ اسی سبب سے فوج سے نکلنے کے بعد وہ تقریباً" پینتیس برس سے ایک اسکول چلا رہے تھے۔ ان کا علم' زیرک نگاہی' سوچ کی وسعت' مشاہدے کی قوت عام انسانوں سے کہیں زیادہ تھی اور اس پر فطری حساسیت کا تڑکا۔

حکیم یعقوب بٹ بچپن کے جگری دوست تھے۔ تین سو چونسٹھ دن اپنے معمولات زندگی میں مگن رہنے والے وہ اس 65 ویں دن دل ہلکا کرنے کڑھنے' جلنے' ماتم منانے اکٹھے ہوتے تھے۔ ملکی و معاشرتی حالات کا جو عالم ہے اس پر تو اب ہر چینل پر بے لاگ تبصرہ ہوتا ہے' ہر وقت' ہر پل۔۔۔ مگر وہ سب اپنے الفاظ بیچنے والے لوگ ہیں۔ (چند مخلصوں کو چھوڑ)

جس موضوع پر چیخ چیخ کر عوام کو ہراساں کرنے ریٹنگ حاصل کرتے ہیں۔ آن ایر کی ریڈ لائٹ بجھتے ہی اسے بھول بھال جاتے ہیں۔

مگر ان دونوں کی باہم گفتگو نہ ریٹنگ کے لیے ہوتی' نہ ہائپ کری ایٹ کرنے کا ڈھکوسلہ' یہ تو گرد و پیش کے جلتے بلتے حالات سے سوختہ' جگر کو ڈھارس دینے کے سہارے ہوتے' ہم کیا تھے' ہمیں کیا ہونا چاہیے تھا' مگر ہم کیا ہوگئے۔

"مادیت پرستی کے اس دور میں ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے والا کوئی نہیں ہے۔ مگر ہر پکار پر اسے جھڑکنے کی ضرورت ہے' کبھی تسلی سے بیٹھ کر کم از کم سن ہی لیا جائے' عمل صوابدید پر ہے۔"

"اگر ہر انسان شخصی خود احتسابی کا جوہر حاصل کرلے تو معاشرہ ایسے سدھر جائے جیسے پھول کھلتے ہی خوشبو پھیل جاتی ہے۔"

"اب رکشے کیوں برے لگ رہے ہیں' آسان سستی کم ہو گئی [illegible]" [illegible] صاحب نے پوچھا۔

"رکشے برے نہیں لگتے یعقوب۔۔۔ مگر یہ موٹر سائیکل رکشے۔۔۔ کوئی تک ہے' ابھی جب الیکشن کیمپین چلیں گی تب یہ لوگ کہیں گے' آسان سستا روزگار فراہم کیا ہے۔ تمہیں پتا ہے انہیں چلانے والے لڑکے' ان میں سے اکثر کے شناختی کارڈ اور لائسنس تک نہیں ہوتے اور وہ بھی چھوڑو' نابالغ چھوکرے۔ آٹھ' دس بندوں کی زندگی سے کھیلنے کے لیے چابی گھماتے ڈرل لل کرتے روڈوں پر نکل پڑتے ہیں۔ تم کبھی فلائی اوورز پر چڑھ کر نیچے روڈ پر نگاہ ڈالو رکشے رکشے اور بس رکشے۔۔۔ لوگ چاند پر پہنچ گئے' بجلی کی رفتار سے تیز ٹرینیں بنا ڈالیں اور ہم نے اپنے نوجوانوں کو رکشوں کا تحفہ دے دیا۔"

سعادت صاحب کی آواز جوش سے اونچی ہوگئی۔

"ملک ترقی یافتہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور ہم ترقی پذیر سے بھی نیچے جارہے ہیں۔"

"لیکن!" بٹ صاحب اٹکے۔ "مجھے پھر بھی کوئی برائی نظر نہیں آتی' رزق حلال ہے' جفاکشی اور محنت۔۔۔"

"میں نے کب انکار کیا اس امر سے یعقوب! میں تو یہ کہہ رہا ہوں چیزوں کا ایک تناسب ہوتا ہے۔ ہانڈی بناتے وقت ہر مسالا ڈالنا ہوتا ہے' مگر پیمائش اور وزن کے حساب سے۔۔۔ کمی بیشی کا نتیجہ بدذائقہ۔۔۔ اسی طرح ہر شے اعتدال اور توازن مانگتی ہے۔ سڑکوں پر کاروں' بائیکس' ٹرک' مزدا' ٹیکسی' بسوں بلکہ ریڑھے گڈوں کا بھی ایک توازن ہونا ضروری ہے۔"

"سرکلر ریلوے جیسی رومانٹک سواری کو پہلے ہی دیوار میں چنوا چکے۔۔۔ کوئی باہر سے آئے گا تو کیا دیکھے گا۔ پھٹ پھٹ کرتے رکشے۔۔۔ اور اتنے زیادہ رکشے بے حد و حساب' ہر کس و ناکس کو بانٹ دیے گئے۔"

"میں سمجھ گیا ای ایس۔۔۔ سگنل بند ہو تو دو مزدا' تین بسیں' آٹھ کاریں' پندرہ بائیکس' پانچ ٹیکسیاں اور چار رکشے ہوں گے تو امتزاج بنے گا۔"

"میرے تمہارے جیسے بندے جلد سمجھ لیتے ہیں۔ مگر جن کا جاننا' سمجھنا' پرکھنا ضروری ہے۔ وہ اب بھی بے خبر ہیں اور رہیں گے۔"

"میں بہت دکھی اور پریشان ہوگیا ہوں ای ایس۔۔۔" بٹ صاحب نے بچوں جیسی خوف زدہ آواز نکالی۔

"ارے نہیں یار۔۔۔ دکھ اور پریشانی کی باتیں دوسری بہت ہیں۔ دل اتنا بھی چھوٹا نہ کر۔" میاں صاحب کو اپنے گولو مولو دوست سے بہت پیار تھا۔ پشت پر تھپکی دیتے ہوئے وہ آگے ہی آگے بڑھتے جارہے تھے۔

ساحل کی رونق بتدریج اضافے کی جانب مائل تھی۔ آتش بازی' پٹاخے' موسیقی' رقص کرتے نوجوان' ڈھول کی تھاپ دلوں کو گرماتی تھی۔ وہ ان سب سے نگاہیں چرائے بڑھتے جارہے تھے۔

دکھ کی بات تو یہ ہے کہ۔۔۔ جاوید چوہدری کہتا ہے۔

"امریکہ ہماری مدد نہ کرے تو ہم ڈیفالٹ ہوجائیں اور تمہیں پتا ہے ہار جانے والے مٹ رومنی نے انتخابی مہم میں پاکستان کے بارے میں کہا تھا۔" امریکہ' پاکستان کو طلاق نہیں دے سکتا۔"

"تو پاکستان خلع لے لے۔" بٹ صاحب کی نگاہیں جوس پر تھیں' انہیں پیاس محسوس ہونے لگی تھی۔ دسمبر کی اس آخری رات موسم بے حد سرد تھا۔ مگر مسلسل چلنے سے ان کے جسم میں خون کی گرمائش زیادہ تھی۔

"نیم حکیم بٹ صاحب۔۔۔! خلع کی پہلی شرط دستبرداری ہوتی ہے۔ ہر شے سے دستبرداری۔۔۔ یعنی۔۔۔ ڈیفالٹ۔۔۔ دراصل امریکہ حلق کی چھچھوندر ہے۔ نہ اگلنے لائق' نہ نگلنے والی۔"

"لیکن اب تو وہ کالے منہ والا اوباما جیت گیا ہے۔" بٹ صاحب اسٹرا سے لمبے لمبے گھونٹ کھینچتے ہوئے نوید سنا رہے تھے گویا۔۔۔ میاں سعادت نے اسٹرا جوس کے اندر ایسے گھونپا جیسے دشمنوں کے سینے میں بھالا اتارا ہو۔

"رنگ کے کالے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کا دل کالا ہے۔ پتا نہیں لوگوں کو اس میں کیا نظر آتا ہے۔ جیتتا ہی چلا گیا۔ تمہیں پتا ہے اس کی جیت کا اہم سبب

خواتین کے ووٹوں کا اکثریتی تناسب تھا۔ 45/55 کا فرق... تھا۔ اس بار بھی اوباما عورتوں کے زیادہ ووٹوں کے باعث ہی جیتا ہے۔"

بٹ صاحب نے بڑا گھونٹ حلق سے نیچے کیا اور ہنسی سے دہرے ہوگئے۔

"اس شدید ہنسی کا مطلب...؟" میاں سعادت انہیں گھورنے کھڑے ہوگئے۔

"اسی... لیے... عورتوں کو ناقص العقل مخلوق کہا جاتا ہے۔ ہاہاہا۔"

میاں سعادت نے انہیں بے حال ہوتے دیکھ کر بمشکل مسکراہٹ ضبط کی۔ "بس مل جائے مردوں کو عورتوں کی تذلیل کا موقع... ہونہہ..."

"عورتوں کے ووٹوں کی حقیقت اپنی جگہ... مگر اتنے شفاف نظام کے باجود ایک بات ذہن نشین کرلو' یہودی پالیسی میکر مل کر ہر شے پہلے ہی طے کرچکے ہوتے ہیں۔"

"یہ یہودی اتنے "یہودی" کیوں ہوتے ہیں۔ ان کی تو..." بٹ صاحب نے بھنا کر کہا اور ایک گرما گرم گالی کے ذریعے جیسے انتقام بھی لے لیا۔

"یہ گالی اسے ہی لگے گی جسے سمجھ میں آئے گی سمجھے۔" سعادت صاحب نے ہنسی روکی۔

"اوجامی ایں! میں نے یہ پیغام ہواؤں کے سپرد کیا ہے۔" بٹ صاحب نے ذرا جھوم تھوڑا سا بے قابو ہوکے کہا۔ میاں سعادت نے پہلی بار بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

"یار! انہیں کبھی ناکامی نہیں ہوگی۔ کیا یہ ہمیشہ انسانوں پر مسلط رہیں گے؟" بٹ صاحب سیدھے کھڑے ہوئے اور بہت معصومیت سے دریافت کیا۔

"نہیں... نہیں۔" سعادت صاحب نے تیزی سے نفی میں گردن ہلائی۔ وہ بٹ صاحب کو بھی تسلی دے رہے تھے اور شاید خود کو...

"جب فرعون نہ رہا' شداد' چنگیز و ہلاکو... تو آج کے خداؤں کو پائندگی کیسے حاصل ہوگی' ہاں یہ ہے کہ یہ بہت سوں کو لے کر مریں گے اور شاید اس وقت ہم نہ ہوں گے۔"

"اچھا۔ اوباما کی جیت پر لیاری والے کیوں ناچے۔ ایک معصوم نے تو یہ بھی کہا کہ اب لیاری کے حالات بہتر ہوجائیں گے۔"

"اسے عصبیت کہتے ہیں اور اچھی چیز ہے عصبیت اگر صحت مندانہ ہو تو... اپنی چیزوں پر' اپنے لوگوں پر فخر کرنا' اپنے اثاثے سنبھالنا' شرمانا' جھجکنا نہیں۔ کانگو کی دھن پر ناچنا کرس گیل کتنا اچھا لگتا ہے نا اور اگر یہی حرکت اپنا شاہد آفریدی کرے کہ وکٹ لیتے ہی یا چھکا مارتے ہی بلا چھوڑ ایک آدھ اسٹیپ خٹک ڈانس کا کرے... تو یہی قوم... اس کا وہ وہ مذاق اڑائے گی کہ بس..."

"ہاں! ہمیں کرس گیل ہی اچھا لگ سکتا ہے۔" بٹ صاحب نے اپنے انداز سے بات سمجھی اور اضافہ کیا۔

میاں سعادت دل کھول کر ہنسے۔

"تو تو صرف میسنا بنتا ہے' داڑھی ہے تیرے پیٹ میں۔" سعادت صاحب اسکول پرنسپل ہونے کے باعث تُو کا صیغہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ مگر اس بار بٹ صاحب پر ٹوٹ کے پیار آیا تھا۔

بٹ صاحب نے سر تسلیم خم کیا اور ہونٹ لٹکا کر اپنی معصومیت کا یقین دلایا۔

✡ ✡ ✡

"یہ خوشیاں نہیں ہیں' یہ بے حسی ہے۔ ایسا کون سا کارنامہ سرانجام دے دیا کہ ناچ ناچ کر خوشی کم ہونے ہی میں نہیں آتی۔ دکھ' صدمات' بین' آہوں آنسوؤں کے علاوہ یہ سال کیا دے کر گیا۔ کوئی ایک اچیومنٹ بھی نہیں... مگر ان کا بھی قصور نہیں' یہ بھی اپنے آپ کو بہلا رہے ہیں۔ ڈھارس دے رہے ہیں۔ جبکہ غم تو اتنے ہیں کہ شمار نہیں۔ دکھ اتنے کہ..."

"اور اس سال کا سب سے بڑا دکھ کیا ہے؟" بٹ صاحب اب تھک چکے تھے۔ وہ متلاشی نگاہوں سے بیٹھنے کے...

"تم تو بس ایک ہی دکھ پوچھتے ہو۔ مگر اب سر پر بال کم ہیں اور دکھوں کی گنتی زیادہ۔" سعادت صاحب کا لہجہ کرچی کرچی تھا۔

"اس شہر کے حالات بٹ...! میرا دل چھلنی کر رہے ہیں۔ آگ و خون کی ہولی... سیاست چمکاتے رہنما۔ اپنے مفادات کی...؟"

"سیاست کو مار گولی... یہ کون سا نیا ٹرینڈ چل نکلا ہے کہ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد اس ملک کے ختم ہوجانے 'ناکام ریاست' بن جانے کی پیش گوئی کردیتے ہیں۔ وڈے نجومی پنڈت... کہیں یہ اپنے غدار دل کی پکار تو نہیں ہوتی ہے؟ یا کسی کا پیام ڈھکے چھپے الفاظ میں پہنچاتے ہیں۔ جملہ پورا کرکے سانس لیتے ہیں۔ پانی کا گھونٹ پی کر کہتے ہیں۔ خدانخواستہ... میرے سامنے آجائیں نا تو زبان گدی سے کھینچ نکالوں... حرا... م... ہونہہ۔"

بٹ صاحب نے سعادت کو ٹوک کر بڑے عزم سے اپنی حب الوطنی اپنے انداز سے پیش کی۔

"یہ بھی ایک مشن ہے۔ ایک ہوتی ہے زرد صحافت بدبودار... مار آستینوں والی صحافت..." میاں سعادت جملہ ادھورا چھوڑ خاموش ہوگئے۔

سترہویں کا چاند عجب بے بسی کے عالم میں زمین کے باسیوں کو دیکھتا تھا۔ یہ ہلڑ بازی اس کی طبیعت پر گراں گزرتی تھی۔ وہ بادل کی اوٹ میں جاتا اور پھر کسی نوعمر دوشیزہ کی طرح پل بھر کو باہر منہ کرتا... زمین پر منظر ہنوز ہوتا تو دوبارہ چلمن پلٹا دیتا۔

اسے سال کے جانے اور نئے سال کے آنے سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ کوئی غم و خوشی نہیں۔ مگر وہ اشرف المخلوقات کہلانے والے جان دارں کا یہ روپ دیکھ کر نگاہیں چراتا تھا۔ فیملیز کی انجوائے منٹ سے پرے سیاہ گاڑیوں کے بند شیشوں کے پیچھے انسانیت غلاظت میں لتھڑی تھی۔ لہو و لعب کے دلدادہ... نیم تاریک گوشوں کی تلاش میں تھے۔ وہ دنیا سے چھپ جاتے تھے۔ مگر چاند بلندی پر تھا' اس کی نگاہ سب پر تھی۔

چودہ سو سال پہلے کسی بشر نے انگلی کے اشارے سے اسے دو ٹکڑے کردیا تھا۔ اس کے غرور کا بت چکنا چور ہوگیا تھا۔ وہ مطیع و فرماں بردار تھا۔

سو بدفعلیوں کو دیکھ کر بادل اوڑھ لیتا۔ چھپ جاتا... اس کی اداسی کی کوئی حد نہ تھی۔ وہ رات کی تاریکی کے اتنے جرائم کا گواہ بن چکا تھا کہ اب خود کو کسی سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ (گناہ کا شاہد بھی تو... گناہ گار... پتا نہیں؟)

"تمہیں پتا ہے وینا ملک نے قرآن با ترجمہ پڑھ رکھا ہے۔"

بٹ صاحب بہت دیر سے خاموش تھے۔ وہ کبھی لوگوں کو دیکھتے' کبھی آسمان کے چاند کو' کبھی لہروں کی بھگدڑ کو' میاں سعادت کے چہرے پر سالوں کا غم تھا۔ ماتھے کی لکیریں اور نظروں کا ارتکاز... اندرونی کشمکش اور یادیں... انہیں تکلیف میں مبتلا کررہی تھیں... بٹ صاحب نے بہت سوچ سمجھ کر جملہ کہا۔

"اس نے وہ ترجمہ لکھا بھی خود ہی ہوگا۔" چونکتے ہوئے سعادت صاحب نے جل کر کہا۔ "ہاہاہا... کیونکہ صحیح ترجمے پر سرسری نگاہ بھی رونگٹے کھڑے کردیتی ہے۔ یا تو آپ ہوش میں آجائیں گے یا پشیمانی میں ڈوب جائیں گے کہ اب تک کیا کرتے رہے' کیوں کرتے رہے۔" میاں صاحب کا لہجہ ایمان و عقیدے کی سچائی کا مظہر تھا۔ "یہ کوئی اور ہی ترجمہ ہوگا۔" ان کا انداز استہزائیہ تھا۔ "کسی منکر و منافق کے ہاتھ کا لکھا۔"

حکیم صاحب اب مطب صرف صبح میں کرتے تھے۔ شام سے جمائیاں لینے تک چینل پر چینل بدلنے کا شوق تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ یہ کس کا جملہ ہے... پاکستان لیلیٰ ہے اور میں اس کا مجنوں؟"

حکیم صاحب کا کسوٹی کھیلنے کا موڈ بن گیا۔ میاں صاحب اسکول کے بعد کتاب و رسائل سے شغف فرماتے تھے۔ نیوز چینلز کی نسبت اخبار بینی کا شوق تھا۔

”پتا نہیں‘ کس نے کہا ہے‘ مگر جو بھی ہے پتھر کھانے کو پھر تیار رہے۔“

”واہ... واہ...!“ بٹ صاحب جھوم جھوم گئے۔

”بھئی بہت خوب۔“

میاں سعادت بٹ صاحب کے جھومنے پر مدھم سا مسکرائے‘ مگر سائرن کی تیز آواز نے چہرہ دوبارہ سنجیدہ کردیا۔

”پولیس‘ رینجرز اور فوج اس طرح گلیوں‘ چوباروں کی نگرانی کے لیے گھومنا شروع کردے گی تو سرحدوں کی نگہبانی کے لیے کون بچے گا۔ سرحدیں کسی بھی ملک کا کنارہ ہوتی ہیں۔ جیسے دوپٹے کی چار کناریاں... آگ ہمیشہ پلو کے سرے کو پکڑتی ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے پورے میں پھیل جاتی ہے۔ اس ملک کے کناروں پر آگ بھڑکائی جاچکی ہے جو دھیرے دھیرے چار جانب سے بڑھ رہی ہے اور اگر ایسا ہی رہا تو... خدانخواستہ...“

سماعت کے لیے نازک اور برداشت کے لیے سخت کڑا یہ جملہ بٹ صاحب کے منہ سے نکلا تھا۔ میاں سعادت کے چہرے پر زخمی مسکراہٹ لپکی اور دم توڑ گئی۔

”ہماری اسلحہ ساز فیکٹریاں کے پی کے میں ہیں۔ مگر وہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی کارگر ہتھیار بنانے سے قاصر ہیں۔ پشت پر کھائی گولی اور اندھی گولی کا جواب نہیں دیا جاسکتا اور سرحد کے جفاکش سینہ تان کر لڑنے والی قوم ہیں۔ مگر افسوس ان کا اس بار کا دشمن بزدل‘ کانا اور بے رحم ہے۔ وہ انہیں ڈرانے‘ دھمکانے کے لیے ڈرون بھیج دیتا ہے۔ وہ اس اندھی گولی سے مرنا پسند کرلیتے ہیں۔ مگر اپنی جگہ چھوڑنے پر تیار نہیں... وہ جری ہیں۔ جو سینے پر گولی مارنا پسند کرتے ہیں‘ بلکہ سینے پر ہی گولی کھانا پسند کرتے ہیں۔“

”دشمن کمینہ اور دیدہ بینا سے محروم ہے۔ وہ سوچتا ہے ان اندھے واروں سے وہ انہیں پچھاڑ دے گا۔ مگر یہ ان کی بھول ہے۔ تمہیں پتا ہے پٹھان تھوڑا سرپھرا ہوتا ہے‘ جو سودا سر میں سما جائے۔“

میاں سعادت نے جملہ قصداً ”ادھورا چھوڑا“ وہ آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ پھر چہرہ پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔ ”اس کا سرپھراپن‘ غیرت اور بہادری کے ذریعے بھی نظر آجاتا ہے۔ اوپر ڈرون اڑ رہے ہیں۔ وہ نیچے کھیت میں ہل چلا رہا ہے۔ گردوپیش سے بے گانہ نمازیں ادا کررہا ہے۔ شادیاں کررہا ہے اور جنازے اٹھا رہا ہے۔“

”پٹھان ایک غیرت مند‘ بہادر‘ مہمان نواز قوم ہے۔“ بٹ صاحب بولے۔

”مہمان نوازی کو آکٹوپس جیسی مہنگائی نے نگل لیا۔ پٹھان نہیں‘ سارا پاکستان روٹی کو ترس رہا ہے۔ بہادری کو منہ چڑانے کے لیے ڈرون بھیج دیتے ہیں اور غیرت کا جنازہ پہلے عافیہ کو قید میں رکھ کر نکالا اور اب ملالہ پر حملہ کرکے۔“

”ایک بات یاد رکھو... سالوں بعد ایک دن یہ باتیں ضرور کھلیں گی‘ ملالہ پر حملہ اس کے نام نہاد خیرخواہوں ہی کی کارروائی نکلے گی۔ کیا تم بھول گئے‘ پاکستانی مرد کی فطرت‘ ایک قبائلی کی فطرت‘ بظاہر یہ عورتوں کے لیے سخت تنگ نظر دکھائی دیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ کبھی بازار‘ راستے‘ بس وغیرہ میں نوٹ کیا۔ کسی بھی زبان برادری کی عورت اگر کسی معاملے پر ان سے جھگڑے پر آمادہ ہوجائے تو یہ سر جھٹک کر جان چھڑانے کے انداز میں کہیں گے۔

”جاؤ ام عورت سے بات نہیں کرتا۔ ام مرد سے بات کرتا اے۔“ اور پھر بھی تمہیں لگتا ہے کہ ملالہ پر حملہ کسی پاکستانی یا مسلمان کا کام ہے‘ ناپسندیدگی اپنی جگہ‘ مگر بگل میں لپٹی بچی کو کوئی غیرت مند قبائلی خواہ افغانی... اس حال میں نہیں پہنچا سکتا کہ وہ بے حس و حرکت اسٹریچر پر پڑی ہو اور اس کے کھلے بالوں پر ساری دنیا کی نظریں ہوں۔ نہیں‘ نہیں یعقوب۔“

ٹوٹا لہجہ‘ یقین سے پر تھا وہ نفی میں گردن ہلاتے تھے۔ ”ہم میں لاکھ برائیاں سہی۔ مگر ہم عوام... ضمیر فروش حکمرانوں کو شامل نہیں کررہا‘ نہ سڑک چھاپ لفنگوں کو... مگر ہم بہنوں‘ بیٹیوں کے سر سے دوپٹا کھینچنے والی قوم ہرگز نہیں ہیں‘ نہ تھا“ نہیں ہیں۔ ہمیں تو چودہ سو سال پہلے فاروق اعظمؓ نے بتادیا تھا۔ عورتوں‘ بچوں‘ بوڑھوں‘ خانقاہوں میں عبادت کرتے راہبوں‘ کھڑی فصلوں‘ پھل دار درختوں کو جنگ کے جوش وانتقام سے پرے رکھنا۔“

سینے کے اندر دل جیسے کسی نے چبا ڈالا تھا۔ اتنی شدید تکلیف پہنچے تو آنکھ سے آنسو بہہ ہی جاتے ہیں۔ بٹ صاحب نے اپنی آستین سختی سے آنکھوں پر رگڑی۔

”ہماری معاشرتی ومذہبی‘ ثقافتی وشخصی خوبیاں اب صرف جماعت پنجم کی معاشرتی علوم کی کتاب میں رہ گئی ہیں۔ کچھ کو ہم نے فراموش کردیا‘ کچھ ہم سے چھین لی جارہی ہیں۔“

”سی ایس... تو ہر سال یہاں آکر خود بھی روتا ہے اور مجھے بھی رلاتا ہے۔“ بٹ صاحب نے بچوں کی طرح ٹنک کر کہا۔

”ہر انسان کو رونے کے لیے‘ خود احتسابی کے لیے ایک دن مقرر کرلینا چاہیے اور دن بھی نہ سہی... چند گھنٹے‘ چند پل ہی بہت ہیں۔ سو سال پہلے مرے پردادے کے ختم (برسی) پر رونا نہیں آتا۔ مگر بندہ دنیا دکھانے کو رونے والی شکل بنا کر تو بیٹھتا ہی ہے نا۔ میرا دل چاہتا ہے یعقوب! میں ان اچھل کود کرتے انسانوں والے گروہ اکٹھا کرلوں اور بتاؤں کہ...

پاکستان کیسے بنا‘ کیوں بنا... اور ہم اس کا کیا بنا رہے ہیں۔ ہم 65ء میں کتنے بہادر تھے اور 71ء میں کتنے بے وقوف بنادیے گئے۔ ہم ساتویں امریکی بحری بیڑے کا انتظار کرتے رہے۔ ہماری ایر فورس بہت کم تھی۔ جو تھی اسے بھی مکتی باہنی نے بھارت کے ساتھ مل کرنا کارہ بنادیا۔

ہمارے وائرلیس کو دشمن جام کردیتا تھا۔ ہم پر بہتان لگتے ہیں اور آج شیخ حسینہ واجد ہم سے معافی مانگنے کا کہتی ہے۔ کہنا آسان ہوتا ہے۔ بٹ! لیکن ہمارے پاس راشن نہیں تھا‘ نہ ایمبولینس‘ نہ کمک۔“

شدت ضبط سے سابقہ فوجی میاں سعادت کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔

”ہم بھارتی توپوں کے سامنے لاتوں اور مکوں سے لڑ رہے تھے۔“

بٹ صاحب کی ٹھوڑی گردن سے جا لگی تھی۔ ٹانگوں کی قینچی بنی سیدھی تھی۔ دونوں ہاتھ رانوں میں پھنسائے وہ سن رہے تھے۔ میاں سعادت حادثے کے باعث جنگ میں حصہ نہ لے سکے تھے۔ مگر اپنے کولیگ کے سنائے تمام واقعات انہیں ازبر تھے۔

”فوجی جنگ سے لوٹے تو دو صورتیں ہیں یا شہید یا غازی... فوجی ہار کر... آئے... خدا نہ کرے۔“

”دل دل پاکستان جاں جاں...“ بہت چھوٹے بچوں کا ایک گروہ پرچم لے کر اندھادھند بھاگ رہا تھا۔

بچوں کو ملی نغمے یاد نہیں ہیں۔ بٹ... وہ 14 اگست اور 6 ستمبر جیسے قومی دنوں پر بہادری جتانے کا ٹیبلو کرنا ہو تو... دبنگ خان بن جاتے ہیں۔ قومی دن کے موقع پر شیلا کی جوانی پر رقص کرتے ہیں۔ بارہ مہینوں میں بارہ طریقوں سے ...اور... اور بڈھے پاپے پرنسپل اور ٹیچر پرفارمنس پر تالیاں پیٹتے ہیں۔ کوئی نہیں ہے جو ان کو روکے۔ میرے لیے یہ بہت تکلیف کا موقع ہوتا ہے‘ کیا کوئی قانون پاس نہیں ہوسکتا کہ اسکولوں کو اسکول ہی رہنے دیا جائے۔ ڈانڈیا پر ناچتی نوعمر بچیاں...“

میاں سعادت غیرنصابی سرگرمیوں کی اہمیت سے واقف تھے۔ وہ تمام قومی دن‘ مشاہیر کے یوم پیدائش و وفات یاد رکھتے تھے اور انہیں منایا کرتے تھے۔ پورے قومی جذبے احترام کے ساتھ۔ جیسے ایک قومی فریضہ ہو۔

یار سی ایس! وہ ملی نغمہ تو سنانا ذرا... وہ جو تونے ٹیچر کو معطل کردیا تھا۔“

بٹ صاحب کو یاد آیا۔ میاں سعادت کا منہ بن گیا۔ قصہ بہت دلچسپ تھا‘ مگر بہت عبرت انگیز بھی...

14 اگست کی تیاریاں ہر بار ان کے اسکول میں بہت زور و شور سے ہوا کرتی تھیں۔ وہ خود سرپرستی

کرتے اور فائنل ریہرسل میں نوک پلک سنوارتے۔

اس وقت بھونچکے رہ گئے جب بھری کلاس کے بچے بہت خوب صورتی سے ہم آواز جھومتے ہوئے گا رہے تھے۔ ہاتھوں میں ہاتھ اور ہلتے سر۔

"کیوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیران' اے قائداعظم تیرا احسان۔"

"ہاں... آں" میاں سعادت کا اوپر کا سانس اوپر' نیچے کا نیچے۔

"یہ... یہ کیا پڑھ رہے ہیں ٹیچر؟" وہ کپکپاتی آواز لیے ٹیچر کی جانب گھومے۔

ذمہ دار ٹیچر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے نغمہ دہرایا۔

"کیوں دی ہمیں آزادی..."

"آ... پ..." میاں سعادت کے جسم سے جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتہ بھڑ گیا تھا۔ وہ اچھل اچھل کر نہ جانے کیا کہہ رہے تھے۔ پرنسپل نہ ہوتے تو شاید گالیاں دیتے۔ مگر حلق کے بل چلائے۔

"آوٹ... آئی سے آوٹ... ڈس مس کرو اس کو۔" وہ اپنے بال نوچتے تھے اور گال پیٹتے۔

دکھ کی بات یہ تھی کہ ہال میں موجود... آدھے لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے رہے۔ "غلطی کہاں ہوئی؟ کیا تھی؟... آہ۔"

☼ ☼ ☼

گھڑی کی سوئیوں نے بارہ کے ہندسے کو چھوا تو فضا پٹاخوں سے گونج اٹھی۔ فائرنگ' شور۔ پی پی پوں پاں ں ں... ہلڑبازی... تالیاں' رقص جنون...

وہ گزرے ماہ سال کا ماتم منا کے تھکے قدموں سے لوٹ آئے تھے۔ وہاں جہاں ریت کے مجسمے بنا تا لڑکا اپنے ریت کے آرام دہ صوفے پر شاہانہ انداز سے بیٹھا تھا۔ وہ سر اٹھا کر آسمان پر پھیلی آتش بازی کے رنگ دیکھ رہا تھا۔ اس کے بنائے مجسمے کی جل پری بڑے پرسکون انداز سے محو استراحت تھی۔ ریت کے بنائے مرد نے فقط انڈرویر پہن رکھا تھا۔ مگر اس کے مسلز اور چوڑے شانے اس کی قوت کو جتاتے تھے۔

حکیم یعقوب بٹ اور سابقہ فوجی' موجودہ پرنسپل میاں سعادت امتیاز ریت پر پھسکڑا مارے ان بے فکرے مجسموں کو تکتے تھے۔ وہ شاہکار تھے' بے عیب' انعام کے حق دار... پتا نہیں ان کا نام گنیز بک میں تھا کہ نہیں... سی ویو جیسے خوب صورت کنارے پر آباد شہر کراچی' بلکہ پوری دنیا سے انسان آیا کرتے تھے۔ کیا کسی نے سوچا کہ اس کا نام گنیز بک کے لیے تجویز کیا جانا چاہیے۔ ایک کوشش... ایک ارادہ...

صبح چار بجے تک جاری رہنے والا نئے سال کا جشن ختم ہو گیا۔ چاند کی چاندنی سے طاقت کھینچتی لہریں پیچھے سرکنے لگی تھیں۔ چاند نے بادل اوڑھ لیا۔ اسے جلدی تھی۔ زمین کے دوسرے سرے پر انسان اس کے منتظر تھے۔

گھوڑے والے' اونٹ والے' ریڑھی فروش سب خوب آمدنی بنا کر لوٹ چکے تھے اور یہ دو ستر سال کے بڈھے۔ خبطی وہیں بیٹھے تھے۔ سمندر پر لگائے بلب بجھا دیے گئے تھے۔

میاں صاحب خوش فہم ضرور تھے' مگر عقل کہتی تھی نئے سال سے کوئی اچھی امید نہ باندھنا۔

دکھ کی فصل بوئیں اور سکھ کے پھول پائیں... ایسا کبھی ہوتا نہیں۔ مگر وہ اس نئے سال کے پہلے سورج کی دھرتی پر پڑتی پہلی کرن کو دیکھ کر... اور دعا مانگ کر جانا چاہتے تھے۔

بٹ صاحب نے ریت کا اونچا سا ڈھیر جما کر گویا تکیہ بنایا۔ وہ اونگھ رہے تھے۔ میاں صاحب نے ان کی تقلید کی۔

اخباری رپورٹرز نئے سورج کو کیمرے میں قید کرنے کے لیے کیمرہ سنبھالے منتظر تھے۔

تب ہی مجسمہ ساز لڑکا اٹھ گیا۔ وہ رخت سفر باندھ رہا تھا۔ اس کی کل متاع پھاوڑا' چھینی ہمردال' رے اس نے سب سمیٹ لیا۔ وہ خوش تھا۔ مطمئن' اسے یقیناً "روز سے زیادہ آمدنی ہوئی تھی۔

میاں سعادت شفقت سے اسی کا تا نبے جیسا چہرہ دیکھ رہے تھے' وہ کڑی دوپہر میں سورج کی تپش سے بے نیاز کام کرتا تھا اور سورج نے اسے کبھی "رعایت" نہیں دی تھی۔

میاں سعادت یک دم چونکے' مجسمہ ساز لڑکے نے جاتے جاتے اپنے پھاوڑے کی مدد سے اپنے شاہکار فن پاروں کو دو ضربوں میں ہی ریت کے ڈھیر میں بدل دیا۔

چند لمحے پیشتر وہاں مرد و عورت تھے اور تاج محل... اور... مگر اب وہاں ریت کے بے ہنگم ڈھیر سے تھے۔ وہ ہکا بکا کھڑے ہو گئے۔

وہ کندھے پر تھیلا لٹکائے واپس جا رہا تھا۔ میاں سعادت پیچھے لپکنا چاہتے تھے۔

"یہ تم نے کیا کر دیا؟ یہ تم نے کیوں کر دیا... اب... کل..." مگر وہ دفعتاً" رک گئے۔ سوالوں کے جواب ان کے دل پر گویا وحی کی طرح اتر رہے تھے۔

"میں جھوٹا نہیں' میرا ہنر جھوٹ نہیں۔" وہ آگے چلتا جا رہا تھا۔

"میرے ہاتھ مضبوط ہیں اور میرے اوزار سلامت..." وہ سیدھی کمر سے سر اٹھائے چلتا تھا۔

"ہر گزرتا دن میرے ہنر کو جلا بخشتا ہے۔ نکھار اور تازگی... بے عیب ہنر... آ جائے کوئی اور دعوے دار' بس قدر دانو ! تم دعاؤں میں یاد رکھو... میرے یہ سخت کھردری جلد والے ہاتھ سلامت رہیں۔

"میں... میں کل پھر آؤں گا۔" وہ نظروں سے اتنی دور ہو گیا تھا کہ اب ایک ہیولہ سا رہ گیا تھا۔

"اور میں ہر روز آؤں گا۔"

"مجھے یہی ایک کام آتا ہے۔ میں اس ساحل کو نکھارنے کے لیے یہی کچھ کر سکتا ہوں۔ میں نے انہیں ڈھا دیا ہے' لیکن... لیکن میں کل ان سے زیادہ اچھے بناؤں گا' تم دیکھ لینا... بس دعا کرنا' میرے ہاتھ سلامت رہیں۔"

میاں سعادت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ بٹ صاحب کی جانب مڑے تھے۔

"تم مجھ سے پوچھ رہے تھے نا' اس سال کے ڈوبتے سورج سے میں نے کیا سبق سیکھا۔"

"..." بھر کے بدمزا ہوئے۔ "اور تم نے کہا تھا وہی چالیس سال پرانا منحوس جملہ "جو خود ڈوب رہا ہو' اس سے کیا سبق لینا۔"

"میں نے غلط کہا تھا بٹ!" میاں سعادت نے سر جھکا کر تسلیم کیا۔ "میں اتنے سالوں سے غلط ہی کہہ رہا تھا۔ تم مجھ سے دوبارہ وہ سوال کرو' میں تمہیں اس بار درست جواب دوں گا۔"

بٹ صاحب چاہتے ہوئے بیٹھ گئے۔ وہ ریت میں لت پت تھے۔ ریت کا تکیہ تھا۔

جان چھڑاتے انداز میں بولے۔

"ہاں بھئی ہی ایں! تم نے اس ڈوبتے سورج سے کیا سبق سیکھا؟"

"میں نے یہ سبق سیکھا کہ ڈوبنے سے پہلے جی بھر کر ہاتھ پیر مار لینے چاہئیں۔ پھر آپ پچھتاوے کی موت نہیں مرتے' آپ کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے۔"

"اچھا ٹھیک..." بٹ صاحب اپنا منہ' بال' ہاتھ سب جھاڑ رہے تھے۔ "اور یہ سبق آپ کو کس نے پڑھایا؟"

"اس نے... اس نے... اس مجسمہ ساز لڑکے نے۔" انگلی سے بہت دور اشارہ کیا۔ "اپنے ہنر پر یقین' توکل... ایمان... وہ اپنے اثاثے' جمع نہیں کرتا' انہیں توکل اور ہمت کے یقین سے ڈھا دیتا ہے۔ اگر ہم سب کا اپنی ذات پر اپنی حد تک ہی سہی اتنا اعتبار قائم ہو جائے تو پھر ہم کیسے ڈوب سکتے ہیں۔ بٹ..." عمر کی ستر بہاریں دیکھ لینے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی لینے کے بعد آج ملنے والا سبق...

"یارو دعا کرو میرے ہاتھ سلامت رہیں۔ تو میں اپنے حصے کی محنت سے اس ملک کے چراغ میں تیل ڈالنے کا بندوبست کرتا رہوں گا' بس۔

دعا کرو یارو میرے ہاتھ... میرے ہاتھ سلامت رہیں اور ہنر کو کسی بدخواہ کی نظر نہ لگے... بس... دعا کرو..."

☼

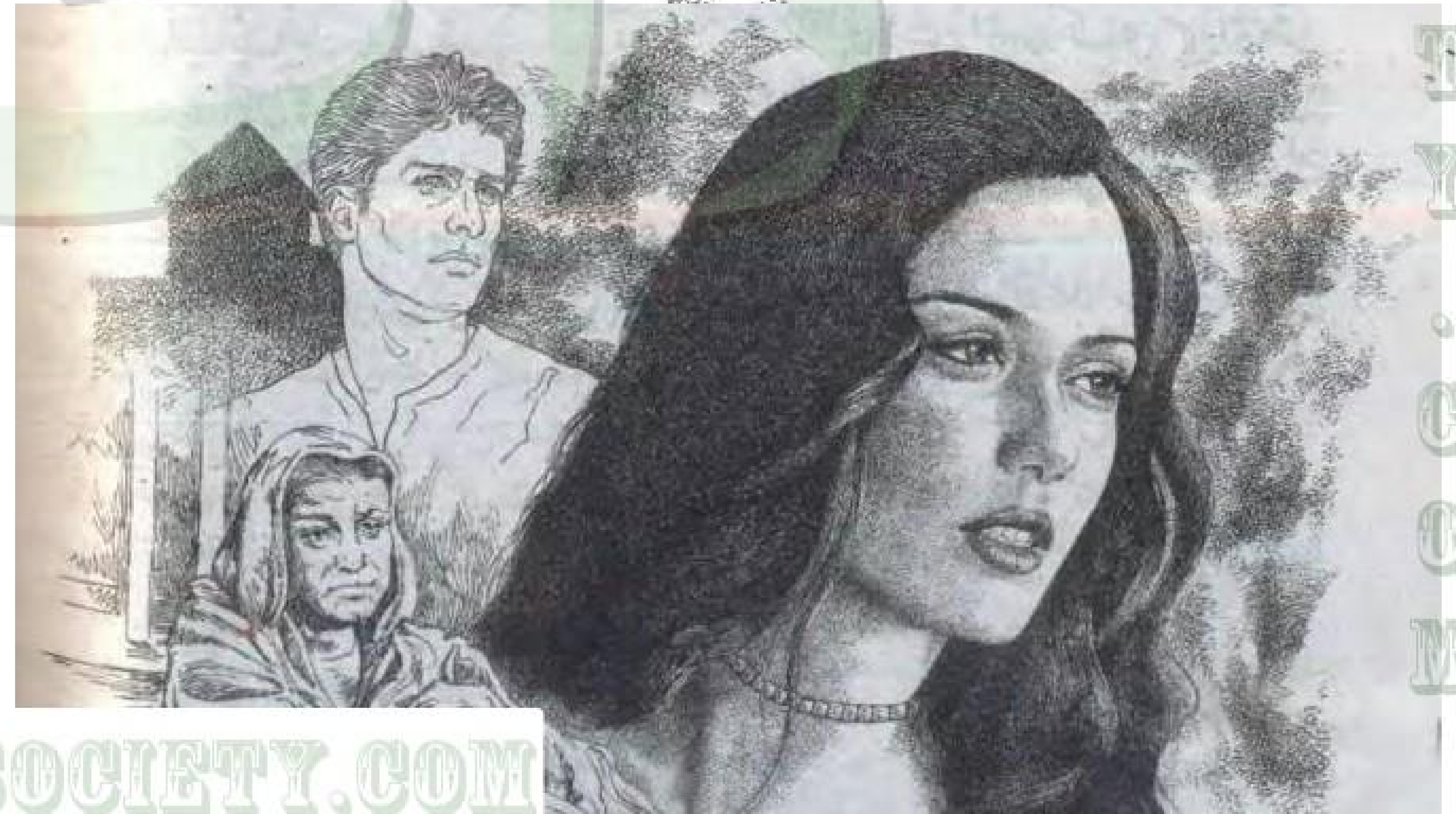
نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں' سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقبل بدمزاجی اور بدزبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی' خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ اس بات پر یاسمین اپنے جیٹھ' جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے' جب کہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایازاد' اجلال رازی سے ہوچکی ہے. جو اعلا تعلیم کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔ یاسمین' اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہوجاتی ہے اور اجلال سے منگنی بھی توڑ دیتی ہے۔ اجلال تعلیم مکمل کرکے واپس آتا ہے تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلتا ہے۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اجلال رازی اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے' مگر وہ خاصی روکھائی سے پیش آتی ہے' تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خودسر ہوتی جارہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ سارہ کا کزن سمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ مگر سارہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے



WWW.PAKSOCIETY.COM

رشتے کی بات کرنے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔

تاباں کا باپ بدلے میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تاباں سے اپنا راستہ الگ کرلیتا ہے۔ شمشیر تاجور کو اپنے ساتھ شہر لے آتا ہے۔ تاجور کو ٹی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے ہسپتال داخل کروا دیتا ہے۔

اریبہ' یاسمین کو شہباز درانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے مگر یاسمین جھوٹی کہانی سنا کر اسے مطمئن کردیتی ہے۔ ٹی بی کے مریض کی کیس ہسٹری تیار کرنے کے سلسلے میں اریبہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔

اجلال رازی اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز درانی کی نازیبا گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچا لیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہوتی ہے۔ شمشیر علی' توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلتا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ اریبہ ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے۔ اور مضطرب رہنے لگتی ہے۔

رازی' اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔

تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہوجاتی ہے۔ وہ رہا ہو کر دل گرفتہ سا اسپتال جا کر تاجور کا معلوم کرتا ہے مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں سے شمشیر اپنے گاؤں جاتا ہے مگر ابا کو تاجور کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ تاباں کی شادی ہو جاتی ہے۔ تاباں کو دیکھ کر شمشیر پچھتاتا ہے اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہتا ہے مگر تاباں منع کردیتی ہے۔

یاسمین' اریبہ کی جلد از جلد شادی کرنے کی فکر میں پڑ جاتی ہے مگر اریبہ دو ٹوک انداز میں منع کردیتی ہے۔ یاسمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو دعوت پر مدعو کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سا دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اریبہ مزید الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے۔ اجلال ' اریبہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک گریزاں ہوجاتا ہے۔

اجلال بے حد نادم ہوتا ہے۔ سارہ اسے سب کچھ بھولنے کا کہتی ہے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں سمیر سے بات کرتی ہے مگر اس کی طرف سے سخت جواب ملتا ہے۔ شمشیر کو اسپتال میں اریبہ نظر آجاتی ہے وہ اس سے شدید نفرت محسوس کرتا ہے اور کالج سے واپسی پر اسے اغوا کرلیتا ہے۔

اریبہ کے اغوا ہوجانے پر سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ اجلال ساجدہ بیگم سے کہہ دیتا ہے کہ اب وہ اریبہ سے شادی نہیں کرے گا۔ شمشیر' اریبہ سے تمیز سے پیش آتا ہے۔ کچھ دن بعد اریبہ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شمشیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

شمشیر علی کو اریبہ اچھی لگنے لگتی ہے۔ وہ اریبہ سے گریز کرنے لگا۔ شمشیر علی ــ اریبہ کو اپنا سیل فون دے دیتا ہے کہ وہ جس سے چاہے' رابطہ کرلے۔

اریبہ نے اجلال کو فون کیا' مگر اس نے سرد مہری سے بات کی تو اریبہ نے کچھ بتائے بغیر فون بند کردیا۔

شمشیر علی نے ابراہیم نامی بچے سے اسکیچنگ سیکھ کر تاجور کی تصویر بنائی تو اریبہ اسے دیکھ کر فوراً" پہچان گئی۔ اس نے شمشیر کو بتایا کہ اریبہ اس کے گھر میں حفاظت سے ہے۔ شمشیر اب اریبہ کو واپس پہنچانا چاہتا تھا' لیکن اریبہ نہیں چاہتی کہ کوئی شمشیر علی کو مجرم سمجھے۔ وہ ایک منصوبہ بناتی ہے۔ جس کے تحت شمشیر علی اسے اسپتال میں داخل کرا کے توصیف احمد کو اطلاع کردیتا ہے۔ توصیف احمد اس کے ساتھ اسپتال پہنچے اور اریبہ کو گھر لے آئے۔

اریبہ کو دیکھ کر اجلال کو محسوس ہوا کہ وہ اس کی محبت سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتا۔

۱۵

پندرہویں قسط

رات کے کھانے کے بعد اریبہ اپنے کمرے میں آئی تو اس کا سیل فون بج رہا تھا اور کیونکہ یہ نمبر ابھی صرف شمشیر علی کے پاس گیا تھا' اس لیے وہ یہی سمجھی کہ تاجور کے لیے بے قرار ہو کر اس نے فون کیا ہوگا' جب ہی فوراً" کال ریسیو کی تھی۔

"ہیلو.....!"

"کیسی ہو اریبہ.....؟" دوسری طرف اجلال رازی تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی اریبہ شش و پنج میں پڑ کر کچھ بول نہیں سکی۔

"ناراض ہو.....؟" رازی بہت محتاط انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"نہیں! میں سوچ رہی تھی' میرا یہ نیا نمبر تمہارے پاس کیسے آیا؟" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"شام میں سارہ سے لیا تھا۔ کیا نہیں لینا چاہیے تھا؟" رازی نے کہا تو وہ مطمئن ہو کر بات بدل گئی۔

"رازی! مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں اپنے گھر آگئی ہوں۔ ابھی تک خواب سا لگ رہا ہے۔"

"یہ خواب نہیں ہے اریبہ! اس سے پہلے جو گزرا اسے خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔" رازی کا لہجہ گمبھیر تھا جانے وہ تسلی دے رہا تھا یا وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکی۔

"پتا نہیں بھلا پاؤں گی کہ نہیں۔" وہ آزردگی میں گھر گئی۔

"سنو! تم کسی بات کو خود پر طاری مت کرو۔ کچھ دن آرام کرو' پھر اپنی نارمل روٹین پر آجاؤ۔" رازی نے اس کی ڈھارس بندھائی تو وہ پگھلنے لگی۔

"ایک بات بتاؤ رازی! اس تمام عرصے میں تم نے میرے بارے میں کتنا اور کیا کیا سوچا تھا؟"

"اس وقت میں صرف اتنا کہوں گا اریبہ! کہ ہر سوچ کے اختتام پر میرا دل چاہتا تھا کہ زمین آسمان ایک کردوں اور تمہیں کہیں سے ڈھونڈ نکالوں۔" رازی نے کہا تو وہ ڈوبتے دل کے ساتھ بولی۔

"زندہ یا مردہ؟"

"میری سانسیں چل رہی تھیں۔" رازی کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب ہوائیں تمہاری سانسوں کی مہک لیے آتی تھیں اور تمہاری سانسوں کے ساتھ میری سانسیں جڑی ہیں۔" رازی کی وضاحت پر وہ خاموش ہوگئی۔

"اریبہ! کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے؟" رازی نے پکار کر پوچھا۔

"ہے بھی اور نہیں بھی۔" اس نے کہہ کر موبائل آف کردیا' کیونکہ ابھی اسے اپنی بات کی وضاحت نہیں کرنی

تھی۔ کچھ دیر وہیں کھڑی وہ رازی کی باتوں کو سوچتی رہی 'پھر کمرے سے نکل آئی۔ سب لوگ پتا نہیں کہاں تھے۔ سارہ بھی ٹی وی لاؤنج میں نہیں تھی۔

"سارہ شاید مما کے پاس ہوگی۔" وہ سوچتے ہوئے یاسمین کے کمرے میں داخل ہوتے ہی رک گئی۔ یاسمین نماز پڑھ رہی تھی۔ آتشی دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اریبہ بے خود سی اسے دیکھے گئی۔ ماں کا ایسا روپ تو شاید اس نے خود بھی کبھی تصور نہیں کیا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا کچھ چاہیے؟" یاسمین نے سلام پھیر کر اریبہ کو دیکھا۔

"نہیں۔" وہ چونک کر بولی۔ "وہ میں سارہ کو دیکھنے آئی تھی۔"

"سارہ ڈرائنگ روم میں ہوگی۔ وہیں نماز پڑھتی ہے۔" یاسمین نے بتایا تو وہ سر ہلا کر پوچھنے لگی۔

"آپ نے نماز پڑھ لی مما؟"

"ہاں بیٹا! نماز تو پڑھ لی۔ اب منت کی نفلیں پڑھ رہی ہوں۔ تمہاری سلامتی اور واپسی کی مانی تھیں۔ چلو اِدھر پڑھ لوں گی۔ تم آؤ بیٹھو۔" یاسمین کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں مما! میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ آپ اپنی نفلیں پوری کریں۔" وہ کہہ کر وہیں سے پلٹ آئی۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ سست روی سے چلتے ہوئے واپس اپنے کمرے میں آکر بیٹھی تھی کہ سارہ دروازے سے جھانک کر پوچھنے لگی۔

"سو رہی ہو؟"

"نہیں! تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ آجاؤ۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آتی ہوں۔" سارہ کو اچانک جانے کیا یاد آیا کہ پلٹ کر بھاگی۔ پھر فوراً" واپس بھی آگئی اور اس کے برابر بیڈ پر دھم سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں! اب سناؤ۔"

"کیا سناؤں؟" وہ بے دھیانی سے بولی۔

"یہی کہ کیسا لگ رہا ہے تمہیں؟ خواب سے جاگی ہو یا ابھی بھی خواب سفر میں ہو۔" سارہ کے ہلکے پھلکے انداز نے اسے مسکرانے پر اکسایا تھا۔ اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

"تمہیں پتا ہے سارہ! میں کسی بات کو خود پر طاری نہیں کرتی۔ جو ہوا سو ہوا۔ ہاں! اگر تم یہ جاننے کو بے چین ہو کہ میرے ساتھ کیا ہوا تو تمہاری بے چینی کم کرنے کو بتا دیتی ہوں۔ ویسے مجھے خود نہیں پتا۔"

"کیا نہیں پتا؟"

"یہی کہ مجھے کس نے کڈنیپ کیا۔ کہاں رکھا اور ان لوگوں کا مقصد کیا تھا۔ یہ سب میں نہیں جان پائی 'بلکہ کوئی بھی نہیں جان پایا میرا مطلب ہے 'وہاں اور لڑکیاں بھی تھیں اور تمہیں شاید یقین نہ آئے 'ہمارے ساتھ برا سلوک نہیں ہوا۔" وہ بہت سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

"سچ اریبہ!" سارہ اس کی آخری بات پر پرجوش ہوگئی۔ "میں یہی دعا کرتی تھی اللہ تمہیں محفوظ رکھے اور میں اللہ کو تمہاری نیکی کا واسطہ دیتی تھی۔"

"میری نیکی؟" وہ نہ سمجھنے کے انداز میں سارہ کو دیکھنے لگی۔

"ہاں! تمہاری نیکی کام آئی۔ تم بے سہارا تاجور کو اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ یہ نیکی نہیں تو اور کیا ہے؟" سارہ نے کہا تو وہ سر جھکا کر بولی۔

"پتا نہیں۔"

"اچھا خیر! پھر تم وہاں سے نکلیں کیسے؟" سارہ نے پوچھا تو اس کا جواب وہ پہلے ہی سوچ چکی تھی۔

"وہاں سے نکلنا تو ممکن نہیں تھا۔ اس لیے مجھے لگتا تھا جیسے میری زندگی اسی زنداں میں گزر جائے گی۔ لیکن کل وہ لوگ ہمیں شاید کہیں اور شفٹ کر رہے تھے تو راستے میں مجھے موقع ملا اور میں ٹرک سے کود گئی۔ پھر پتا نہیں ون مجھے وہاں سے اٹھا کر اسپتال لے گیا اور پتا نہیں ڈیڈی کو کس نے بتایا۔ خیر شکر ہے میں گھر پہنچ گئی۔" اس نے خر میں لمبی سانس کھینچی تھی۔

"ہاں! اللہ کا بڑا شکر ہے۔ ہم سب تو اب تقریباً" مایوس ہی ہوچکے تھے۔" سارہ نے کہا 'پھر اسے دیکھ کر مسکرائی جوابا" وہ بھی مسکرائی 'پھر پوچھنے لگی۔

"اب تم بتاؤ! میری گمشدگی کو یہاں کیا نام دیا گیا؟"

"کوئی نام نہیں دیا گیا۔ قیاس آرائیاں تھیں۔" سارہ نے کندھے اچکا کر یوں سرسری انداز میں کہا جیسے اب وہ ساری باتیں غیر اہم ہوں اور تھا تو ایسا ہی 'لیکن وہ جاننا چاہتی تھی 'جب ہی زور دے کر بولی۔

"وہی تو میں جاننا چاہتی ہوں 'کیا کیا قیاس آرائیاں ہوئیں؟"

"ایسی وارداتوں پر جو ہوتی ہیں۔ یعنی پہلے یہی سمجھا گیا کہ کڈنیپ کرنے والے رقم کا مطالبہ کریں گے 'لیکن جب کوئی فون نہیں آیا تو ڈیڈی نے تمہاری گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی۔ پھر یہ سمجھا جانے لگا کہ تمہارے ساتھ کوئی حادثہ ہوگیا ہے۔ پتا نہیں تم زندہ بھی ہو کہ نہیں۔ بس ایسی ہی باتیں تھیں۔" سارہ کو اب وہ سب سوچ کر بھی کوفت ہو رہی تھی 'جب ہی یوں سر ہلایا 'جیسے یہ موضوع ختم کرو۔

"کسی کو یہ خیال بھی آیا ہوگا کہ میں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوں۔" اس نے بظاہر جتنے آرام سے پوچھا 'سارہ ی قدر اچھلی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟ ایسا کون سوچ سکتا ہے؟ جانتے نہیں ہیں کیا ہم سب تمہیں؟ جو کرنا چاہتی ہو 'ڈنکے کی چوٹ پہ کرتی ہو۔"

اریبہ ہنس کر یہ تاثر دینے لگی جیسے اس نے جان بوجھ کر سارہ کو اکسایا ہو۔



ساجدہ بیگم اریبہ کی واپسی کا سن کر خاموش بیٹھی تھیں۔ پتا نہیں ان کے پاس کہنے کو کچھ تھا نہیں یا سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس خبر پر ان کا ردعمل کیا ہونا چاہیے۔ جبکہ اجلال رازی اریبہ کا بتا کر انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر کتنی دیر بعد ساجدہ بیگم بولی تھیں۔

"شکر ہے! بچی گھر آگئی۔ اس کے ماں باپ کے لیے بڑی آزمائش تھی۔ اللہ ایسی آزمائش میں کسی کو نہ ڈالے۔" پھر پوچھنے لگیں۔

"تم کیا کہتے ہو رازی! میں جاؤں اریبہ سے ملنے؟"

"پتا نہیں امی! مجھے نہیں پتا اس موقع پر آپ کو کیا کرنا چاہیے۔" رازی نے دامن بچایا 'پھر ساجدہ بیگم کو شش میں دیکھ کر کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے امی ابھی رہنے دیں۔ نہ جائیں آپ۔"

"عجیب مشکل ہے۔ نہ جاؤں تو بھی باتیں بنیں گی اور چلی جاؤں تب بھی نہیں بخشا جائے گا۔" ساجدہ بیگم اپنے

آپ سے ہی بولی تھیں۔

"جب ہر دو صورت میں باتیں ہی بنی ہیں تو بس، آپ نہیں جائیں گی۔" رازی کے فیصلہ کن انداز پر ساجدہ بیگم خاموش ہو گئیں، پھر قدرے رک کر پوچھنے لگیں۔

"اچھا! یہ بتاؤ، اریبہ ہے کیسی؟"

"ٹھیک ہے! رات میں نے فون کیا تھا۔ اس وقت اور بہتر لگی۔" رازی نے سیدھے سادے انداز میں بتایا، پھر بھی ساجدہ بیگم ٹھٹک گئیں۔

"تم نے اریبہ کو فون کیا تھا؟"

"جی!" اس نے اثبات میں سر ہلایا، پھر ساجدہ بیگم کا چہرہ دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"آپ حیران کیوں ہو رہی ہیں امی؟"

"میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہی۔ اریبہ کو فون کرنے کا مطلب؟ کیا تم اس سے منگنی قائم رکھنا چاہتے ہو؟" ساجدہ بیگم کا ذہن یہی بات سوچ سکتا تھا۔

"اوہ امی! اریبہ کو فون کرنے کا یہ مطلب کیسے نکال لیا آپ نے؟" وہ جھنجلا گیا۔

"ایسا سوچیے گا بھی مت۔ میں آپ کو جو فیصلہ سنا چکا ہوں، وہی آخری ہے۔ اریبہ میری چچازاد ہے اور بس۔"

"اچھا تو ناراض کیوں ہو رہے ہو۔ یوں بھی مجھے اس سلسلے میں تم سے بات کرنی تھی۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو وہ عاجز ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"بس امی! جو بات ختم ہو گئی۔ اسے بار بار مت دہرائیں۔"

"میں اس بات کو نہیں دہرا رہی۔" ساجدہ بیگم کو غصہ آ گیا۔ "تم اپنا فیصلہ سنا کر فارغ ہو گئے۔ اب باقی سب تو مجھے جھیلنا ہے۔ کس کس کو کیا کیا جواب دوں گی، سوچا تم نے؟"

"آپ کیوں جواب دیں گی؟" وہ بے سوچے سمجھے بول کر ایک دم خاموش ہو گیا۔ غالباً" احساس ہو گیا تھا کہ ساجدہ بیگم غلط نہیں کہہ رہیں۔ تب خود پر قابو پا کر کہنے لگا۔

"میرا مطلب ہے امی! آپ ابھی کسی سے کچھ مت کہیں۔ میرا فیصلہ ہے، اسٹینڈ بھی میں ہی لوں گا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کا وقار مجروح نہیں ہونے دوں گا۔"

ساجدہ بیگم اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ بولنے سے قصداً" خود کو باز رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

شمشیر علی کو اریبہ نے گیارہ بارہ بجے کا ٹائم دیا تھا، پھر بھی وہ صبح نو بجے سے ہی فضل کریم کے پاس آ بیٹھا اور ہر آنے والی گاڑی کو دیکھ کر یوں چوکنا ہو جاتا، جیسے اس میں سے اریبہ نکلے گی اور فضل کریم جو ہمیشہ اس کی حرکات نوٹ کرتا تھا، پھر ٹوکنا بھی ضرور تھا تو ابھی بھی ٹوک دیا۔

"کیا بات ہے باؤ! کسی کا انتظار ہے؟"

"ہاں......!" وہ بے اختیار بول کر سنبھل ہی گیا تھا۔ "ایک ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لیا تھا۔ اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"خیر تو ہے کیا تکلیف ہے تجھے؟" فضل کریم نے اس کی صحت کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"دل کو روگ لگ گیا ہے۔" وہ خود ہی محظوظ ہوا تو فضل کریم نے فوراً" ٹوک دیا۔

"توبہ کر باؤ! ایسی باتیں مذاق میں بھی منہ سے نہیں نکالتے۔ اللہ بچائے ان بیماریوں سے۔"

"ہاں! لیکن میں مذاق نہیں کر رہا۔ ڈاکٹر کو دکھانے ہی آیا ہوں۔ ویسے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بدہضمی سے بھی دل پر اثر پڑتا ہے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں فضل کریم کو مطمئن بھی کر دیا۔

"کیا نام ہے ڈاکٹر کا؟" فضل کریم نے پوچھا۔

"ڈاکٹر ابرار احمد۔ دیکھتا ہوں شاید آ گئے ہوں۔" وہ فضل کریم کے مزید سوالوں سے بچنے کی خاطر اٹھ گیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا سیدھا اسپتال کے کیفے ٹیریا میں آ بیٹھا اور دوبارہ اریبہ کو میسج کر کے اپنے وہاں پہنچنے کا بتایا پھر چائے آرڈر کر کے اخبار پڑھنے لگا۔ کسی طرح وقت تو گزارنا ہی تھا۔

تقریباً" ساڑھے گیارہ بجے اریبہ آئی تو وہ اسے دیکھے گیا۔ جبکہ ذہن کہیں اور بھٹک گیا تھا۔

"ہیلو......!" اریبہ نے سامنے بیٹھ کر اسے متوجہ کیا۔ تب اس نے یوں سر ہلایا جیسے اپنی کسی سوچ پر خود کو سرزنش کر رہا ہو۔

"کیا بات ہے، تم حیران ہو پریشان یا کوئی اور بات؟" اریبہ نے ٹوکا تو نفی میں سر ہلا کر پوچھنے لگا۔

"تاجور کیسی ہے؟"

"بہت اچھی..... میرا دل چاہ رہا تھا اسے بھی ساتھ لے آؤں۔" اریبہ کی بات پر وہ بے چین ہو کر فوراً" بولا۔

"لے آتیں۔"

"نہیں شام! ہماری اب تک کی پلاننگ کامیاب رہی ہے۔ اس لیے آگے بھی ہمیں سوچ سمجھ کر چلنا چاہیے۔"

"اب کیا سوچنا ہے؟"

"کیوں؟ تم تاجور سے کیا کہو گے کہ تم اسے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟ جبکہ میں اسے اس اپارٹمنٹ تک لے گئی تھی، جہاں تم رہتے تھے۔ پھر اب وہ صرف تمہاری بہن نہیں ہے کہ تم اسے لے کر چلتے بنو۔" اریبہ اب اپنے پورے اعتماد کے ساتھ بات کر رہی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا.....؟"

"مطلب یہ کہ اس عرصے میں تاجور ہمارے گھر کی فرد بن چکی ہے۔ میں اسے ایسے ہی تمہارے حوالے نہیں کروں گی۔ میرا مطلب ہے، ابھی جہاں تم رہتے ہو۔ وہ جگہ تاجور کے لیے مناسب نہیں ہے۔ تم پہلے اچھی جگہ رہائش کا انتظام کرو، کیونکہ تاجور کو اچھے ماحول کی ضرورت ہے۔" اریبہ کی بات وہ سمجھ رہا تھا۔ پھر بھی پریشان ہو گیا۔

"میں کر لوں گا۔ سب کر لوں گا۔ لیکن اس میں وقت لگے گا۔ جبکہ میرے لیے اب ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہے۔ جب تک میں تاجور سے نہیں مل لوں گا، کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"ہاں تو میں تمہیں تاجور سے ملوا رہی ہوں ناں۔" اریبہ نے کہا تو وہ بے تابی سے بولا۔

"کب.....؟"

"آج شام میں۔" اریبہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اس کی پل پل بدلتی کیفیت دیکھ رہی تھی۔

"واقعی.....؟"

"ہاں! شام میں، جب میں تمہیں اپنے گھر کا ایڈریس سینڈ کروں تو تم آ جانا اور سوچ کر آنا کہ تمہیں تاجور سے کہنا ہے۔ جیسے میں نے اپنی بہن کو من گھڑت کہانی سنائی ہے۔ ٹھیک ہے؟" اریبہ بات ختم کر کے جانے کو تیار ہوئی تو وہ ایک دم بول پڑا۔

"بہت مشکل ہے۔ شام تک کا وقت کیسے کٹے گا۔ کہیں اس سے پہلے میری زندگی کی شام نہ ہو جائے۔"

"تم..." اریبہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور پرسوچ انداز میں اسے دیکھنے لگی پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر بولی۔ "چلو آؤ ابھی چلو میرے ساتھ۔"

"ابھی؟" وہ حیران ہو کر کھڑا ہو گیا۔

اریبہ اسے اشارہ کر کے چل پڑی تو وہ یوں ہی حیران حیران سا اس کے پیچھے آیا تھا۔

پھر تمام راستے وہ یہی سوچتا رہا کہ تاجور سے کیا کہے گا۔ اسے بتائے بغیر وہ کہاں چلا گیا تھا۔ بہت ساری باتیں بلکہ بہانے اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ابھی وہ کسی ایک بات پر قائم نہیں ہوا تھا کہ اریبہ گاڑی روک کر اسے دیکھنے لگی۔

"سنو! کوئی اتنا گمبھیر مسئلہ نہیں ہے۔ معصوم تاجور تمہاری ہر بات کا یقین کرلے گی۔ چلو اٹھو۔" اریبہ کہہ کر گاڑی سے اتر گئی۔

پھر شمشیر علی کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر وہ تیزی سے اندر آئی۔

"سارہ! تاجور!" لالی سے پکارتے ہوئے اریبہ نے پہلے اپنے کمرے میں جھانک کر سارہ کو آنے کا اشارہ کیا، پھر تاجور کے کمرے میں آ گئی۔

"کیا ہوا؟" سارہ فوراً ہی اس کے پیچھے آ گئی۔

"گڈ نیوز......!" وہ سارہ سے کہہ کر تاجور سے مخاطب ہو گئی۔ "تاجور! میں تمہارے لیے خوش خبری لائی ہوں۔ تمہارا بھائی مل گیا ہے۔"

"ہائیں باجی۔" تاجور خوشی اور حیرت کی ملی جلی تصویر بن گئی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہو؟ کہاں ملا اس کا بھائی اور تم نے اسے کیسے پہچانا؟" سارہ نے اسے بازو سے بھینچ کر پوچھا تو وہ تاجور کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"پہلے اسے سنبھالو۔ کہیں بے ہوش ہی نہ ہو جائے۔"

"تاجور!" سارہ نے بھاگ کر تاجور کو کندھوں سے تھام کر بٹھایا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر کہنے لگی۔ "دیکھا تاجور! تمہاری دعائیں کیسے رنگ لائیں۔ تم نے کہا تھا، اریبہ باجی آ گئی ہیں اب تمہارا بھائی بھی مل جائے گا۔ مل گیا تمہارا بھائی۔"

"باجی!" تاجور اریبہ کو دیکھ کر بس اسی قدر کہہ سکی۔ اس کا دل قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں! بتاؤ اسے کہاں ملا اس کا بھائی۔" سارہ نے اپنا تجسس تاجور سے منسوب کر کے اریبہ کو دیکھا۔

"اسپتال میں...... میرا مطلب ہے ابھی اسپتال گئی تھی نا تو وہاں کاؤنٹر پر ایک آدمی تاجور کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ بس پھر تاجور کا نام سنتے ہی میں اس کے پاس چلی گئی۔ پورا انٹرویو لے ڈالا اس کا اور جب یقین ہو گیا کہ وہ تاجور کا بھائی ہے تو اسے اپنے ساتھ لے آئی۔" اریبہ اپنے کارنامے پر خوش ہو رہی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے......" سارہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں! شمشیر علی ڈرائنگ روم میں موجود ہے۔ آؤ تاجور!" اریبہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور تاجور کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ جہاں شمشیر علی دروازے پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

"بھائی!" تاجور تڑپ کر بھاگی تھی اور اگلے پل شمشیر علی کے سینے سے لگی مچل مچل کر رو رہی تھی۔ یہی حال شمشیر علی کا تھا۔

اریبہ الٹے پیروں وہاں سے نکل آئی۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ کسی توانا مرد کو ٹوٹ کر روتے دیکھنا بھی

گردے کا کام تھا۔

"کیا ہوا، کچ مچ تاجور کا بھائی ہے؟" سارہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تو اس نے اثبات میں سرہلایا، پھر آنکھوں کی نمی انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

"بہت رو رہے ہیں دونوں۔ مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ خیر! تم کچھ چائے، کھانے کا انتظام کرو۔"

"وہ تو میں کرتی ہوں۔ تم یہ بتاؤ، کیسا ہے تاجور کا بھائی؟ میرا مطلب ہے، وہ جو کہتی ہے پڑھا لکھا......"

"ہاں! ایسا ہی ہے۔ تم دیکھنا چاہتی ہو؟" اس نے تصدیق کرنے کے بعد پوچھا تو سارہ تمہید باندھنے لگی۔

"اصل میں تاجور کی زبانی اتنا کچھ سن چکی ہوں کہ......"

"اچھا! ٹھیک ہے۔ تم چائے لے کر آجانا۔" اس نے کہتے ہوئے واش روم کا رخ کیا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، پھر کچھ دیر ٹھہر کر ڈرائنگ روم میں آئی تو دونوں بہن بھائی پرسکون ہو چکے تھے۔

"بھائی! یہ اریبہ باجی ہیں۔" تاجور اسے دیکھتے ہی بتانے لگی۔ "یہ مجھے اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔ پھر انہوں نے میرا علاج بھی کیا۔ اب تو میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں۔"

"ہاں! میں بہت شکر گزار ہوں تمہاری اریبہ باجی کا۔ اچھی مسیحا ہیں۔" شمشیر علی تاجور سے کہتے ہوئے آخر میں اسے دیکھ کر مسکرایا تو اس نے فوراً" آنکھوں سے محتاط رہنے کا اشارہ کیا۔

تب ہی سارہ چائے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے آگئی۔

"بھائی! یہ سارہ ہیں۔ مجھے اردو اور انگریزی پڑھاتی ہیں۔۔۔ اور پتا ہے بھائی! میں نے قرآن شریف بھی ختم کرلیا ہے۔" تاجور کی خوشی، جوش اور شوق قابل دید تھا۔

شمشیر علی ممنونیت کے احساس میں گھرا باری باری دونوں بہنوں کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"میں آپ دونوں کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ میری بہن کو نئی زندگی دی ہے آپ نے اور بالکل ایسی جیسی میں اس کے لیے سوچتا تھا۔ یہ آپ کا مجھ پر ایسا احسان ہے، جو میں کبھی، کسی صورت نہیں اتار سکتا۔"

"ہم نے کوئی احسان نہیں کیا، لیکن آپ ضرور احسان کیجیے گا کہ تاجور کو ہم سے ملواتے رہیے گا۔ کیوں تاجور! آتی رہو گی ناں؟"

سارہ نے شمشیر علی سے کہتے ہوئے تاجور سے پوچھا تو وہ زور زور سے اثبات میں سرہلانے لگی، جبکہ اریبہ کچھ سٹپٹائی تھی۔ شمشیر علی کو دیکھا پھر سارہ کو مخاطب کرکے بولی۔

"سارہ! تاجور ابھی نہیں جا رہی۔ کیونکہ ابھی ان کے پاس رہائش نہیں ہے۔"

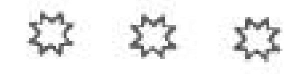
"جی! لیکن میں جلد ہی انتظام کرلوں گا، تب تک آپ کو اعتراض نہ ہو تو تاجور......" شمشیر علی کو سارہ کے سامنے بات کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔

"لیجیے اعتراض کیوں ہو گا۔ میں تو تاجور کے جانے کا سوچ کر ہی پریشان ہو گئی تھی۔ چلو! اچھا ہے ابھی یہ یہیں رہے گی۔" سارہ کی بات سن کر تاجور شمشیر علی کو دیکھنے لگی تو وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

"بس تھوڑے دنوں کی بات ہے تاج! پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ویسے میں نے اریبہ صاحبہ کا نمبر لے لیا ہے۔ اس دوران تمہیں فون کرتا رہوں گا۔"

"ملنے بھی آسکتے ہیں۔ کوئی پابندی نہیں ہے۔" اریبہ نے کہہ کر چائے کا کپ اٹھالیا تو وہ زیر لب مسکرانے لگا۔

✡ ✡ ✡

شمشیر علی بہت خوش تھا۔ اس نے اسی روز سے رہائش کے ساتھ فل 

کیونکہ پارٹ ٹائم جاب سے وہ کسی اچھے علاقے میں اپارٹمنٹ نہیں لے سکتا تھا۔ گو کہ سی اے میں ابھی اس کا ایک سال باقی تھا اور اسے یونیورسٹی جوائن کرنے کا خیال بھی آیا تھا، لیکن پھر اس نے سختی سے اس خیال کو جھٹک دیا تھا۔ کیونکہ وہ اریبہ کے سامنے عہد کر چکا تھا کہ جب تک اریبہ اپنی منزل کو نہیں پہنچے گی، وہ اپنی منزل کی طرف جانے والے راستے پر قدم بھی نہیں رکھے گا۔ گو کہ اسے اریبہ کی منزل کا کچھ پتا نہیں تھا، نہ اس کے خوابوں سے آگاہی تھی۔ لیکن اس عرصے میں وہ اتنا ضرور جان گیا تھا کہ اریبہ کوئی عام سی لڑکی نہیں ہے۔ نہ ہی وہ خوابوں میں رہنے والی لڑکی نظر آئی تھی۔ اس کے باوجود اس کے کچھ خواب تھے، جب ہی تو اس نے کہا تھا۔

"لڑکیوں کے خواب کانچ کی مانند ہوتے ہیں۔ ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے قدرت نے لڑکیوں کی فطرت میں خاص وصف رکھا ہے کہ خواب ٹوٹ جائیں تو دنیا تیاگ کے نہیں بیٹھتی ہیں، نہ مرتی ہیں۔ بس جیے جاتی ہیں۔"

"تم بھی کیا بس جیے جاؤ گی؟" شمشیر علی نے اس وقت بھی ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا تھا اور جواب میں اریبہ کی پلکوں سے ٹوٹتے موتی اس کے دل میں ترازو ہو گئے تھے۔ تب ہی اس نے عہد کیا تھا اور وہ عہد شکن نہیں تھا۔

بہرحال اس نے جاب کے لیے کئی جگہوں پر درخواست دے دی تھی، لیکن دو ہفتے بعد بھی کہیں سے کال نہیں آئی تھی۔ جس سے وہ خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ گو کہ تاجور کا اب کوئی مسئلہ نہیں تھا، بلکہ اس کی طرف سے وہ مکمل مطمئن تھا۔ پھر بھی وہ چاہتا تھا، تاجور کو جلد سے جلد اپنے پاس لے آئے۔ کیونکہ اس کے خیال میں کسی کی مہربانی اور احسان پر تکیہ نہیں کر لینا چاہیے۔ اس لیے وہ بہت جلدی چاہ رہا تھا، لیکن اسی قدر اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

اس وقت وہ ایک جگہ انٹرویو دے کر نکلا تو خاصا بددل ہو رہا تھا۔ کیونکہ انٹرویو کے دوران اس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ محض خانہ پُری ہے جبکہ جگہ پہلے سے پُر ہو چکی ہے۔ پتا نہیں لوگوں کو محض رعب جھاڑنے کا شوق کیوں ہوتا ہے۔ وہ پراگندہ سوچوں میں گھرا پارکنگ میں اپنی گاڑی کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا کہ اپنے قریب گاڑی رکنے پر چونک کر ادھر متوجہ ہوا تھا۔

گاڑی میں پچھلی نشست پر بیٹھے توصیف احمد نے اسی کو دیکھ کر گاڑی رکوائی تھی۔

"السلام علیکم!" شمشیر علی نے انہیں دیکھتے ہی سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" توصیف احمد نے جواب کے ساتھ گاڑی کا دروازہ کھول دیا تو وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔

"کم آن مسٹر شمشیر آئی وانٹ ٹو ٹاک ٹو یو۔" توصیف احمد نے کہا تو اس نے پہلے پارکنگ میں پھنسی اپنی گاڑی پر نظر ڈالی، پھر ان کے ساتھ بیٹھتے ہی اس کا ذہن جیسے اچانک بیدار ہو گیا تھا اور پہلا خیال یہی آیا کہ توصیف احمد اس سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔

"یہاں جاب کرتے ہو؟" توصیف احمد نے اس بلڈنگ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا، جہاں سے وہ نکلا تھا۔

"نو سر! یہاں میں انٹرویو کے لیے آیا تھا۔" اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے، آج کل جاب لیس ہو۔" توصیف احمد نے اسے دیکھا اور اس کے جواب دینے سے پہلے ہی کہنے لگے۔ "میرے پاس کیوں نہیں آئے؟ میں نے تم سے کہا بھی تھا۔"

اس نے آہستہ سے نفی میں سرہلایا۔ یوں جیسے دوبارہ اس آفس میں کام کرنا ممکن نہیں ہے، جہاں وہ پورے اسٹاف کے سامنے گرفتار ہوا تھا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں، تم کیوں منع کر رہے ہو۔" توصیف احمد خود ہی کہنے لگے۔ "لیکن مجھے تم جیسے محنتی اور ایماندار شخص کی ضر[illegible]ں نے تمہارے پاس ایک آدمی بھی بھیجا تھا، لیکن تم شاید وہ اپارٹمنٹ چھوڑ

چکے ہو۔"

"جی۔۔۔!" وہ اندر ہی اندر جز بز ہو رہا تھا۔

"ابھی تمہاری رہائش کہاں ہے؟"

"ابھی میرے پاس اپنی رہائش نہیں ہے سر! ایک دوست کے ساتھ رہتا ہوں۔" اس نے مصلحتاً" مبالغہ آرائی کی۔

"ہوں!" توصیف احمد نے چند لمحے کچھ سوچا' پھر کہنے لگے۔ "ہاں! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں سائٹ پر اپنے آفس کی نئی برانچ کا آغاز کر رہا ہوں۔ وہاں کے لیے میں تمہیں جاب کے ساتھ رہائش بھی آفر کر رہا ہوں۔ وہاں نیا اسٹاف تم خود اپائنٹ کرو گے۔"

اس نے فوراً" جواب نہیں دیا' البتہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ دونوں ضرورتیں ایک ساتھ پوری ہو رہی تھیں۔

"یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے احسان کا بدلہ اتارنا چاہتا ہوں۔" توصیف احمد جیسے اس کی سوچ پڑھ کر گویا ہوئے تھے۔ "اور نہ ہی تم اسے میری غلطی کی تلافی کی کوشش سمجھنا۔ مجھے واقعی تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری صلاحیتیں میں آزما چکا ہوں۔ کسی نئے آدمی کو میں اتنی بڑی ذمہ داری نہیں سونپ سکتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"جی۔۔۔!" اس نے پرسوچ انداز میں ہی اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر کب سے جوائن کر رہے ہو؟"

"جی!" اس نے چونک کر توصیف احمد کو دیکھا۔

☼ ☼ ☼

ساجدہ بیگم' امینہ کو ساتھ لے کر توصیف ولا آئی تھیں۔ اریبہ کی گمشدگی ایسا معاملہ تھا کہ ہر ایک اپنے آپ میں شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ تینوں خواتین یعنی ساجدہ بیگم' امینہ اور یاسمین ایک دوسرے سے نظریں ملانے سے بھی کترا رہی تھیں۔ آخر یاسمین ہمت کر کے بولی۔

"اللہ نے بڑا کرم کیا ہے' میری بچی کو مجھ سے ملا دیا۔"

"ہاں! توصیف بھائی کی کوئی نیکی کام آئی ہے۔" امینہ بے ساختہ کہہ گئیں' جس پر ساجدہ بیگم گھبرا کر بات بدل گئیں۔

"ہے کہاں اریبہ؟"

"کمرے میں ہے۔ بلاتی ہوں۔" یاسمین کہتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔

"دیکھ رہی ہیں بھابھی! یاسمین کو؟ کیسی نیک پروین بننے کی کوشش کر رہی ہے۔" امینہ نے ساجدہ بیگم کو مخاطب کر کے یاسمین کے گھریلو حلیے پر نکتہ چینی کی۔

"اللہ اس کی کوشش کو کامیاب کرے۔ بچوں کے لیے اچھی ماں ہی بن جائے۔" ساجدہ بیگم نے امینہ کی نکتہ چینی کی حوصلہ افزائی نہیں کی' جس پر امینہ منہ بنا کر بولیں۔

"بس کریں بھابھی! یہ عورت سدھرنے والی نہیں ہے۔"

"اچھا! چپ ہو جاؤ۔ آ رہی ہے۔" ساجدہ بیگم نے ٹوک کر کہا۔ تب ہی یاسمین کے ساتھ اریبہ نے آتے ہی خوشی کا اظہار کیا اور لپک کر پہلے امینہ کے گلے لگی' پھر ساجدہ بیگم کی آغوش میں سمٹی تو ہمیشہ والی نرمی گرمی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اسے لگا' جیسے وہ اجنبی بانہوں میں آن سمائی ہو۔

"کیسی ہیں تائی امی آپ؟" اریبہ' ساجدہ بیگم کی بانہوں سے نکل کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"شکر ہے۔ تم ٹھیک ہو؟" ساجدہ بیگم کے لہجے اور نظروں میں بھی ہمیشہ والی اپنائیت نہیں تھی۔

"جی۔۔۔!" اریبہ اٹھ کر یاسمین کے پاس بیٹھ گئی اور جیسے خود کو سہارا دینے کے لیے یاسمین کا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔ "بہت پریشان ہوئے آپ سب میرے لیے اور دیکھیں! آپ سب کی دعاؤں سے میں زندہ سلامت واپس آ گئی۔ ورنہ مجھے تو بالکل امید نہیں تھی کہ میں پھر کبھی آپ سب کو دیکھ سکوں گی۔"

"بس بیٹا! بھول جاؤ سب۔" یاسمین نے اریبہ کا ہاتھ تھپک کر کہا۔

"میں تو بھول جاؤں مما! لیکن لوگ تو نہیں بھولیں گے' ہے ناں تائی امی؟" اریبہ نے بظاہر سادہ انداز میں کہہ کر ساجدہ بیگم کو مخاطب کیا تو وہ بمشکل سنبھل کر بولیں۔

"لوگوں کا کیا ہے' انہیں تو موضوع ملنا چاہیے۔"

"اور کیا۔۔۔ اپنے گریبان میں کوئی نہیں جھانکتا۔" سارہ جانے کب اریبہ کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھی ایک دم بولتے ہوئے سامنے آ گئی۔ تو یاسمین اسے گھور کر بولی۔

"سارہ! جاؤ بوا سے چائے کا کہو۔"

"وہ میں کہہ آئی ہوں۔" سارہ کہتے ہوئے امینہ کے پاس بیٹھ گئی۔ "شکر ہے پھوپھو! آپ آئیں تو۔"

"تمہارے لیے نہیں' میرے لیے آئی ہیں پھوپھو اور تائی امی بھی۔" اریبہ کو ساجدہ بیگم اور امینہ کا لیا دیا انداز بری طرح محسوس ہو رہا تھا' جب ہی اس نے قصداً" سارہ پر جتایا کہ شاید کوئی کہہ دے "ہاں! ہم اریبہ کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں اریبہ کی محبت کھینچ لائی ہے۔" لیکن وہ دونوں خاموش تھیں۔

"پتا ہے' سب تمہارے لیے آتے ہیں۔ مجھے تو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔" سارہ نے کہا تو امینہ نے فوراً" اسے گلے لگا لیا۔

"ارے! تم تو میری لاڈلی' میری جان ہو۔"

"میں چائے بھجواتی ہوں مما!" اریبہ اٹھ کر چلی گئی تو یاسمین دل مسوس کر رہ گئی۔

"بس یاسمین بھابھی! اب آپ بیٹیوں کی شادی کا سوچیں۔۔۔ بیٹیاں عزت' آبرو سے اپنے گھر بار کی ہو جائیں تو ماں باپ بھی سکون سے ہو جاتے ہیں۔"

امینہ کی بات سن کر سارہ اٹھ کر چلی گئی' جبکہ یاسمین کو اپنے دل سے بوجھ سرکتا محسوس ہوا' انکھیوں سے ساجدہ بیگم کو دیکھ کر بولی۔

"ہاں! چاہتی تو میں بھی یہی ہوں۔ دونوں بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

"پھر کوئی رشتے ہیں آپ کی نظر میں؟" امینہ جانے کیا سوچ کر آئی تھیں۔ ساجدہ بیگم پریشان ہو گئیں۔

"رشتے؟" یاسمین کو جھٹکا لگا۔ امینہ کو دیکھ کر ناگواری سے پوچھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ جو بھی بات ہے' صاف کہو۔ آپ بتائیں ساجدہ بھابھی! امینہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔"

"میں نے کوئی فارسی نہیں بولی یاسمین بھابھی! سیدھی بات کی ہے۔ ظاہر ہے' رشتے ہوں گے تو شادی ہو گی۔" امینہ جانتی تھیں' ساجدہ بیگم سے جواب نہیں بن پڑے گا' جب ہی فوراً" بولیں۔

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں اور میری بیٹیوں کے لیے کمی نہیں ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ موجود ہے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی بیٹی کا سوچو اور ساجدہ بھابھی! آپ کی بھی بیٹی بیٹھی ہے۔ برا مت مانیے گا۔ اپنے گھروں میں بیٹیاں رکھ کر آپ کو میری بیٹیاں کیوں کھل رہی ہیں؟" یاسمین کوشش کے باوجود خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔

"اللہ نہ کرے! کھلیں گی کیوں؟ بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں اریبہ اور سارہ کی فکر اس لیے ہے کہ توصیف بھائی ساتھ نہیں رہتے۔ باپ کا رعب ہو تو لڑکیاں من مانی نہیں کرتیں۔"

"یہ بات تمہیں اپنے بھائی کو سمجھانی چاہیے تھی۔ اس وقت' جب وہ دوسری کرنے جا رہے تھے۔ تب تو تمہیں توصیف کی بیٹیوں کا خیال نہیں آیا تھا۔" یاسمین بری طرح سلگ اٹھی۔

"یہ تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟" ساجدہ بیگم نے گھبرا کر ٹوک دیا۔ "امینہ! تم خاموش رہو۔ یاسمین نادان نہیں ہے۔ اپنی اولاد کی بہتری سوچ سکتی ہے۔"

یاسمین نے سر جھٹک کر منہ موڑ لیا۔ اس کے چہرے پر غصے کے ساتھ ناگواری واضح تھی۔

"تم ناراض مت ہو یاسمین! امینہ بھتیجیوں کی محبت میں جو منہ میں آیا کہہ گئی۔ لیکن اس کا کوئی غلط مطلب نہیں تھا۔"

"اس کا جو بھی مقصد تھا' میں بہرحال سمجھ گئی ہوں۔" یاسمین جتا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ساجدہ بیگم امینہ کو دیکھنے لگیں۔

"چلتے ہیں بھابی!" امینہ نے ساجدہ بیگم کو مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اٹھتے ہی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بھی اٹھا دیا۔



یاسمین امینہ کی باتوں سے اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ وہ دونوں صلاح مشورہ کر کے ہی آئی تھیں اور ساجدہ بیگم خود تو نہیں بولیں' لیکن امینہ کی زبانی کہلوا دیا تھا کہ اریبہ اور رازی کے رشتے کو ختم سمجھا جائے۔ گو کہ واضح الفاظ میں نہیں کہا تھا اور یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ امینہ اگر صاف لفظوں میں رشتہ ختم کرنے کی بات کرتیں تو یاسمین وجہ بھی نہیں پوچھ سکتی تھی۔

بہرحال اب جب یاسمین پر گھر اور بچوں کی اہمیت واضح ہو چکی تھی تو اس کے لیے اریبہ کی نسبت ٹوٹنا بڑی تکلیف دہ بات تھی۔ صرف اس لیے نہیں کہ اریبہ' رازی سے محبت کرتی تھی' بلکہ اس لیے کہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی اسے سزا مل رہی تھی اور یہ سزا ایسی ختم ہو جانے والی نہیں تھی۔ یاسمین سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے توصیف احمد کو فون کر کے آنے کو کہہ دیا تھا اور جب تک توصیف احمد آ نہیں گئے' وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ کیونکہ وقت نے اسے جو سبق سکھایا تھا' اس سے وہ بہت محتاط ہو گئی تھی۔ پہلے وہ ذرا ذرا سی بات اریبہ اور سارہ کو بڑھا چڑھا کر بتاتی تھی' مگر اب ایسا نہیں تھا۔ اس نے پہلے توصیف احمد کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"ہاں! کیا ضروری بات کرنی ہے؟" توصیف احمد نے آرام دہ انداز میں بیٹھتے ہی پوچھا۔

"وہ میں آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ امینہ اور ساجدہ بھابھی آئی تھیں اور امینہ نے کچھ ایسی باتیں کیں' جس سے مجھے لگا کہ ساجدہ بھابھی' اریبہ اور رازی کی منگنی ختم کرنا چاہتی ہیں۔"

یاسمین نے روانی میں اصل بات کہہ دی۔ توصیف احمد اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ بولے کچھ نہیں۔ غالباً" سمجھنا چاہ رہے تھے کہ یاسمین کی بات میں کتنی سچائی ہے۔

"ساجدہ بھابھی نے اپنے منہ سے کچھ نہیں کہا' لیکن انہوں نے امینہ کو ٹوکا بھی نہیں تھا تو اس کا کیا مطلب ہے؟ میں تو یہی سمجھی ہوں کہ امینہ کے منہ میں ساجدہ بھابھی کی زبان تھی۔" یاسمین اب رک رک کر بول رہی تھی۔

"ہوں!" توصیف احمد نے غیر محسوس طریقے سے اندر کا دباؤ کم کرنے کے لیے سانس کھینچی تھی۔ اصل میں وہ

یاسمین پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ انہیں اس بات سے کتنی تکلیف ہوئی ہے۔ جب ہی بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگے۔

"تم کیا کہا تھا امینہ نے؟"

"یہی کہ میری نظر میں رشتے ہوں تو ہمیں اب اریبہ اور سارہ کی شادی کر دینی چاہیے۔" یاسمین توصیف احمد کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ان کی پیشانی پر لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ کوشش کے باوجود ناگواری چھپا نہیں سکے۔

"ہاں! تو کر دیں گے۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ جب ہم مناسب سمجھیں گے' بچیوں کی شادی کر دیں گے۔ امینہ کو کیا فکر ہے۔"

"یہی میں نے بھی امینہ سے کہا تھا۔" یاسمین فوراً" کہہ کر خائف ہو گئی تھی' لیکن توصیف احمد نے نوٹس نہیں لیا۔ قدرے رک کر کہنے لگے۔

"دیکھو یاسمین! ہو سکتا ہے تم غلط سمجھی ہو۔ کیونکہ ساجدہ بھابھی یا رازی کی طرف سے کبھی مجھے ایسا نہیں لگا کہ وہ یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔ اور اگر فرض کرو! ایسا ہی ہے تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے! ہم کچھ نہیں کر سکتے لیکن اریبہ۔۔۔۔" یاسمین اچانک رو پڑی۔ آنسو اس روانی سے چھلکے تھے کہ توصیف احمد چند ثانیے کو ساکت ہو گئے تھے۔

"میری اریبہ کا کیا قصور ہے؟ جب اپنے اس سے منہ موڑ رہے ہیں تو غیر۔۔۔۔" یاسمین ہتھیلیوں سے آنسو صاف کرنے لگی۔

"کوئی منہ نہیں موڑ رہا اور موڑ بھی لیں تو کیا' میری بیٹی کے لیے کمی نہیں ہے۔ تم ابھی سے واویلا مت مچاؤ اور بچیوں کو تو بالکل پتا نہیں چلنا چاہیے۔" توصیف احمد نے قدرے جھلائے انداز میں کہا پھر پوچھنے لگے۔ "ہیں کہاں دونوں؟"

"اپنے کمرے میں ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے! تم فریش ہو کر آجاؤ۔ میں سارہ سے کہتا ہوں' کھانا لگوا دے۔" توصیف احمد کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے تو یاسمین نے واش روم کا رخ کیا۔

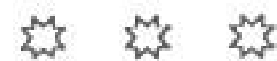
منہ دھونے کے بعد بھی اس کا چہرہ ستا ہوا لگ رہا تھا۔ آنکھیں بھی ہلکی گلابی ہو رہی تھیں۔ بالوں میں برش کرتے ہوئے اس نے اپنا دھیان ادھر ادھر کرنے کی کوشش کی' پھر کمرے سے نکل آئی۔

توصیف احمد' اریبہ کو اپنے بازو کے حلقے میں لیے ڈائننگ روم کی طرف جا رہے تھے۔ یاسمین کو پہلی بار احساس ہوا کہ یہ شخص اس کے اور اس کے بچوں کے لیے کتنا اہم ہے اور وہ کتنی بدقسمت ہے کہ ہمیشہ اس کی اہمیت سے انکاری رہی۔ اس کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔ جلدی سے پلکیں جھپک کر وہ توصیف احمد اور اریبہ کے پیچھے ڈائننگ روم میں آ گئی۔

"بیٹا! اتنا اہتمام۔۔۔۔!" توصیف احمد ٹیبل کا جائزہ لیتے ہوئے حیران ہو رہے تھے۔

"ڈیڈی! اتنا اہتمام میں نے تائی امی اور پھوپھو کے لیے کیا تھا' لیکن وہ اتنی جلدی چلی گئیں۔" سارہ نے افسوس سے بتایا۔

"ہاں! آپ کی مما نے بتایا ہے۔" توصیف احمد سرسری انداز میں کہہ کر بیٹھ گئے تو باقی سب نے ان کی تقلید کی تھی۔



سارہ نے کیونکہ امینہ کو یہ کہتے سنا تھا کہ "یاسمین بھابھی اب آپ بچیوں کی شادی کا سوچیں۔" تو اس سے وہ یہی سمجھی تھی کہ ساجدہ بیگم خاص طور سے اریبہ اور رازی کی شادی کی بات کرنے آئی تھیں اور اس وقت سے وہ مسلسل اریبہ کو چھیڑ رہی تھی۔ پھر توصیف احمد کی آمد کو بھی وہ یہی رنگ دے رہی تھی۔

"اب تو تمہیں یقین آجانا چاہیے اریبہ! تائی امی شادی کی بات کرنے ہی آئی تھیں۔ جب ہی تو ڈیڈی بھی آگئے اور اتنی دیر کمرے میں بند مما اور ڈیڈی یقیناً اسی بات پر غور کر رہے تھے۔"

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اریبہ کا انداز بجھا بجھا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں اور دیکھو! اب تم پڑھائی وڑھائی کا بہانہ مت کرنا۔ اگر تائی امی کی طرف سے جلدی شادی پر اصرار ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔۔۔ ہے ناں؟" سارہ نے آخر میں اس کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلائی تھی۔

"پتا نہیں، کیا اچھا ہے کیا برا، مجھے تو تائی امی کا رویہ سمجھ میں نہیں آرہا۔ تمہیں پتا نہیں، کیسے خوش فہمی ہو گئی ہے۔" اریبہ نے آخر ٹوک دیا تھا۔

"یار! میں اس لیے تو وہاں سے اٹھ کر آگئی تھی، کیونکہ پھوپھو نے شادی کی بات چھیڑ دی تھی۔" سارہ نے زور دے کر کہا تو وہ سر جھٹک کر بولی۔

"تمہاری شادی کی بات چھیڑی ہو گی پھوپھو نے۔"

"اوہ!" سارہ جھنجلا گئی۔ "اچھا! یہ بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جو تم چاہو گی، وہی ہو گا۔" سارہ نے اتنے یقین سے کہا کہ وہ کتنی دیر اسے دیکھتی رہی، پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں سارہ! اب مجھے لگ رہا ہے میں اپنی ہستی کا غرور کھو چکی ہوں۔ گو کہ میرا دامن ہر آلودگی سے پاک ہے۔ لیکن میرا یقین کون کرے گا۔۔۔؟ کوئی نہیں۔۔۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو میں چاہوں۔۔۔"

"کسی نے کچھ کہا تم سے۔۔۔؟ رازی بھائی نے؟" سارہ نے اب دھیرے سے پوچھا تھا۔

"نہیں۔"

"پھر تم اتنی دل برداشتہ کیوں ہو رہی ہو؟" سارہ کو اس کی آزردگی بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔

"زندگی نے عجیب مذاق کیا ہے میرے ساتھ۔ توصیف احمد کی بیٹی اریبہ توصیف احمد جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی، وہ یوں بے مایا ہو گئی کہ محبت کے دو بولوں کے لیے اسے جتن کرنے پڑ رہے تھے۔۔۔ "میرے لیے آئی ہیں پھوپھو اور تائی امی بھی۔۔۔" سانپ سونگھ گیا تھا دونوں خواتین کو اور تم پوچھتی ہو، کسی نے کچھ کہا۔۔۔ تم بتاؤ! کیوں نہیں کسی نے کچھ کہا؟ دل رکھنے کو بھی نہیں۔ پھر بھی جو میں چاہوں گی۔۔۔" اریبہ بری طرح ٹوٹ رہی تھی۔

سارہ کا دل سہم گیا۔

"میں چاہوں، وقت کا پہیہ الٹا چل جائے تو کیا چل جائے گا۔۔؟ نہیں نا۔۔۔؟ تو بھول جاؤ اس اریبہ کو جسے من چاہا ملتا تھا۔ اب اریبہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہے۔"

"نہیں اریبہ!" سارہ نے تڑپ کر اس کے ہاتھ تھامے۔

"ایسا مت کہو۔ خدا کی قسم! اگر تم داغ دار تن لیے واپس آتیں، تب بھی تائی امی تمہارے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ کیونکہ ان کے پیٹ کی اولادیں وہ نہیں ہیں، جو نظر آتی ہیں۔"

اریبہ ۔۔۔ [illegible]

"ہاں! بلال امریکا میں بیٹھا کیا گل کھلا رہا ہے۔ میں سب جانتی ہوں۔ ثنا کی حرکتیں بھی ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔" سارہ تنفر سے بولی۔

"اور رازی؟" اریبہ نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔

"وہ بھی تمہارے قابل نہیں ہیں۔" سارہ نظریں چرا گئی تو اریبہ دکھ سے مسکرائی۔ اس کے خیال میں سارہ اسے بہلا رہی تھی۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تمہارے ساتھ جو ہوا اس میں تمہارا قصور نہیں ہے، جبکہ وہاں سب قصوروار ہیں۔" سارہ نے مزید کہا تو وہ شکستگی سے بولی تھی۔

"سزا تو بے قصوروں کو ہی ملتی ہے ناں!"

"ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔" سارہ کے روٹھے انداز پر وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

شمشیر علی نے زیادہ نہیں سوچا تھا۔ بس وہ ایک لڑکی اریبہ توصیف احمد جو اسے اپنے دل کے آس پاس محسوس ہونے لگی تھی تو بس اس سے ایک تعلق قائم رکھنے کی خاطر اس نے توصیف احمد کی آفر قبول کرلی تھی اور پھر اپائنٹمنٹ لیٹر کے ساتھ اپارٹمنٹ کی چابی ملتے ہی وہ سیدھا اریبہ کے پاس آیا تھا۔

اریبہ اس وقت اسپتال میں ڈینگی پیشنٹ کی کیس ہسٹری تیار کررہی تھی۔

"مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" شمشیر علی اسے سارے اسپتال میں ڈھونڈتے ہوئے آخر اس تک پہنچ گیا تھا۔

"ابھی میں فارغ نہیں ہوں۔ دو بجے کے بعد آنا یا فون کرلینا۔" اریبہ نے بس ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

"دو بجے سے پہلے تو مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔ آئی مین اس شہر سے۔" اس نے کہا تو اریبہ زچ ہوگئی۔

"اب کہاں جارہے ہو؟"

"یہی بتانا چاہتا ہوں، لیکن یہاں نہیں پلیز۔" اس کے ملتجی انداز پر اریبہ مجبوراً اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آگئی

"زیادہ تمہیدیں مت باندھنا۔ جو بتانا ہے جلدی بتاؤ۔"

"پہلے تم بتاؤ! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے یا تم روتی رہی ہو؟" وہ اس کی آنکھوں میں تیرتی گلابیاں دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"شام!" اریبہ نے ٹوک دیا۔ "تم صرف اپنی بات کرو۔"

"ہاں۔ وہ میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ مجھے اپارٹمنٹ مل گیا ہے اور ہینڈسم جاب بھی۔" اس نے بتایا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"مبارک ہو۔"

"شکریہ! اب یہ بھی سن لو کہ مجھے جاب اور رہائش کی آفر تمہارے ڈیڈی نے کی تھی۔ جو میں نے صرف تمہاری وجہ سے قبول کرلی۔" دوسری بات وہ بلا ارادہ کہہ گیا تھا۔

"میری وجہ سے؟" اریبہ کے استفسار پر وہ گڑبڑا گیا۔

"ہاں! وہ تاجور جو تم لوگوں سے اتنی مانوس ہوگئی ہے۔ میں نے سوچا تمہارے ڈیڈی کا آفس جوائن کرنے سے مجھے تاجور کو تمہارے ہاں لانے لے جانے میں شاید مسئلہ نہیں ہوگا۔" وہ سنبھل کر بات بنانے میں بھی کامیاب ہوگیا تھا۔

"ہوں، پھر کب سے جوائن کررہے ہو؟" اریبہ نے اس کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

"پہلی تاریخ سے اور اس سے پہلے میں چاہتا ہوں۔ تاجور کو ابا سے ملوا لاؤں۔" اس نے کہا تو وہ فوراً بولی تھی۔

"ٹھیک ہے! لیکن تاجور کو وہاں چھوڑ کر مت آجانا۔"

"نہیں! تاجور میرے ساتھ رہے گی۔ یہاں پڑھے لکھے گی اور پھر اس کی شادی بھی یہیں ہوگی۔" وہ کہہ کر مسکرایا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں، گھر چلو اور تاجور کو میرے ساتھ روانہ کرو۔ میں اس وقت گاؤں کے لیے نکلنا چاہتا ہوں۔" اس کی بے تابی دیکھتے ہوئے اریبہ منع نہیں کرسکی۔

"ٹھیک ہے! تم چلو، میں ڈاکٹر سے کہہ کر آتی ہوں۔" اریبہ ہامی بھر کر واپس اندر چلی گئی اور وہ اپنی گاڑی میں آبیٹھا۔

پھر اریبہ کے آنے پر ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور اریبہ کی گاڑی کے تعاقب میں ڈرائیو کرتے ہوئے اسے لگا جیسے اب اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں رہی۔ وہ کہے گی، چلو تو وہ چل پڑے گا۔ وہ کہے گی رکو تو وہ رک جائے گا۔ تقدیر کے ہاتھوں کٹھ پتلی بننے کا مزا اس نے چکھ لیا تھا۔ اب یہ نیا تماشا تھا۔ سینے کے اندر دل چھلانگیں مار رہا تھا اور پہلی بار اس نے دل کو سرزنش نہیں کی تھی۔

اریبہ اپنی گاڑی گیٹ سے اندر لے گئی اور وہ گیٹ پر ہی انتظار کرنے لگا۔ تقریباً" پندرہ منٹ بعد اریبہ تاجور کو ساتھ لے کر آئی تو اس نے فوراً" گاڑی سے اتر کر تاجور کو گلے لگایا پھر اریبہ کو دیکھ کر بولا۔

"تھینک یو اریبہ! تم نے مجھے میرے باپ کی نظروں میں سرخرو کرکے۔۔۔"

"اچھا! بس۔" اریبہ فوراً" اسے ٹوک کر تاجور سے بولی۔ "اپنا خیال رکھنا تاجور!"

"باجی۔۔۔!" تاجور اس سے لپٹ گئی۔

"پگلی! تھوڑے دنوں کی بات ہے، پھر تم یہیں آؤ گی۔" اس نے تاجور کو پیار کیا۔ پھر اسے گاڑی میں بٹھا کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ گھنے پیڑ سے سورج کی دودھیا کرن زبردستی راستہ بناتی ہوئی اس کے بالوں کو چومنے لگی تھی۔

"اجازت؟" شمشیر علی نے یوں پوچھا جیسے وہ نہیں کہے گی تو وہ نہیں جائے گا۔

اریبہ اثبات میں سر ہلا کر گیٹ سے اندر چلی گئی تب گہری سانس سینے کے اندر دباتے ہوئے اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی زن سے گاڑی بھگا دی۔

"بھائی! ابا کو پتا ہے میں آرہی ہوں؟" تاجور گھر جانے کے خیال سے خوش ہورہی تھی۔

"نہیں۔" اس نے بے دھیانی میں جواب دیا، پھر ایک دم خود کو سنبھال کر کہنے لگا۔ "میں نے ابا کو فون نہیں کیا۔ اچانک پہنچو گی تو ابا تمہیں دیکھ کر حیران ہوجائیں گے۔ اور دیکھو! ابا کو اور کسی کو بھی یہ مت بتانا کہ میں کہیں چلا گیا تھا اور تم کسی اور کے گھر رہ رہی تھیں۔ بہت برا مانیں گے ابا۔ بس یہی کہنا کہ تمہیں آج ہی اسپتال سے چھٹی ملی ہے۔ میری بات اچھی طرح سمجھ لو، ورنہ ابا تمہیں تو نہیں، لیکن مجھے ضرور کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیں گے اور پھر کبھی میری شکل بھی نہیں دیکھیں گے۔"

"نہیں بھائی! میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔" تاجور سہم گئی۔

"ہاں! بس تھوڑے دن ہم وہاں رہیں گے، پھر واپس آجائیں گے۔ یہاں مجھے گھر مل گیا ہے۔ اب ہم ساتھ رہیں گے، تمہارے لیے میں ٹیچر کا انتظام کردوں گا۔ وہ تمہیں میٹرک کی تیاری کرادے گی۔" وہ تاجور کو ذہنی طور پر

آنے والے وقت کے لیے تیار کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام ڈھلے وہ تاجور کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو برآمدے میں بیٹھے ابا پہلی نظر میں تاجور کو پہچان ہی نہیں سکے اور ناگواری سے اس سے پوچھنا چاہتے تھے کہ یہ تو کسے لے آیا ہے لیکن اس سے پہلے ہی تاجور بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔

"ابا۔۔۔ ابا! آپ کیسے ہیں؟ میں آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔"

"ہائیں۔۔۔!" ابا تاجور کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر دیکھتے ہوئے بولے۔ "اتنی بڑی ہو گئی تو۔ اے پپو کی ماں! ادھر آ دیکھ تاج آئی ہے۔"

"آ گئی۔" اماں کمرے سے نکلتے ہی شمشیر علی کو دیکھ کر رک گئیں۔

"السلام علیکم! کیسی ہو خالہ؟" شمشیر علی نے قصداً "روٹھا انداز اختیار کیا تھا۔

"شکر ہے اللہ کا' جس حال میں رکھے۔ تو بڑے دنوں بعد آیا ہے؟" اماں نے جواب کے ساتھ کہا۔

"ہاں! وہ تاجور کا علاج چل رہا تھا نا۔" اس نے کہتے ہوئے تاجور کو اشارہ کیا تو وہ اماں کی طرف گھوم کر بولی۔

"السلام علیکم خالہ۔۔۔!"

"ہو گیا تیرا علاج؟ کیا تکلیف تھی تجھے؟" اماں تاجور کے چہرے پر کھلتی گلابیاں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھیں۔

"اچھا! بس زیادہ سوال جواب نہ کر۔ تھکے ہوئے آئے ہیں دونوں۔ روٹی شوٹی لا۔" ابا نے اماں کو ٹوک دیا تو شمشیر علی آگے آ کر بولا۔

"نہیں خالہ! روٹی ہم نے راستے میں کھالی تھی۔ البتہ چائے مل جائے تو۔۔۔"

"میں بناتی ہوں چائے۔" تاجور ابھی بھی اماں سے خائف تھی۔

"تو بیٹھ میرے پاس۔ ابھی تو آئی ہے۔" ابا نے تاجور کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا' پھر شمشیر علی سے پوچھنے لگے۔ "تو بتا! نوکری کر رہا ہے یا ابھی بھی بے کار پھر رہا ہے؟"

"بے کار میں کبھی نہیں پھرا ابا! اور اب تو میری ترقی ہو گئی ہے نوکری کے ساتھ گھر بھی مل گیا ہے۔ تھوڑے دنوں کی پریشانی تھی۔ اب اللہ کا شکر ہے' سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ تاجور بھی خوش ہے۔" اس نے تاجور کی خوشی کو خاص طور پر جتایا تھا۔

"ہاں! ادھر تو ہر وقت روتی رہتی تھی یہ تاجور۔" ابا بڑی جلدی پر امان جاتے تھے۔

"روتی نہیں تھی تو خوش بھی نہیں تھی ابا! کیونکہ آپ نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔ گھٹ گھٹ کر کیا حال ہو گیا تھا اس کا۔ اگر میں کچھ دن اور نہ آتا تو مر گئی ہوتی یہ۔" وہ بھی جتانے سے باز نہیں آیا۔ ابا سر جھٹک کر رہ گئے۔

"جا تاج! چائے لے آ۔ خالہ تو پائے پکانے بیٹھ گئی ہو گی۔" وہ کہہ کر منہ ہاتھ دھونے کے ارادے سے اٹھ گیا۔

پھر چائے پیتے ہی وہ گھر سے نکل آیا' کیونکہ ابا کے ساتھ اس کی بنتی ہی نہیں تھی اور اپنی ماں بھی نہیں تھی جس کے ساتھ وہ حال احوال کرتا۔ اس لیے اندھیرا پھیلنے کے باوجود وہ بے مقصد گلیوں میں پھرتا رہا۔ اب واقعی یہاں کوئی مقصد نہیں تھا۔ نہر والے باغ کا خیال بھی ذہن سے محو ہو گیا تھا' جس کے حسین گوشے میں اس کے خواب دفن تھے۔ وقت کی تیز آندھی اس کا سب کچھ نہیں تو بہت کچھ اپنے ساتھ بہا لے گئی تھی۔ اس وقت وہ کچھ

سوچ نہیں رہا تھا' پھر جانے دل پر کیسا بوجھ لیے گھر لوٹا تو صرف تاجور ہی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے بھائی؟"

"کہیں نہیں۔ بس ایسے ہی۔ تم پریشان کیوں ہو جاتی ہو؟ کھانا وانا کھایا؟" اس نے ٹوک کر پوچھا۔

"جی! آپ کے لیے کھانا لاؤں؟" تاجور احتیاط سے بول رہی تھی کہ کہیں کوئی اٹھ نہ جائے۔

"نہیں! بھوک نہیں ہے۔ تم سو جاؤ۔" اس نے کہا تو تاجور جاتے جاتے رک گئی۔

"بھائی! خالہ کہہ رہی تھیں' اب میں یہیں رہوں۔"

"کیوں؟" اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے' پھر سر جھٹک کر پوچھنے لگا۔ "تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا بھائی سے پوچھ لیں۔" تاجور کے جواب پر اسے پھر غصہ آ گیا۔

"کیوں' تمہاری اپنی کوئی مرضی نہیں ہے؟ میں کہوں گا' رہ جاؤ تو یہیں رہ جاؤ گی؟ سوچو گی نہیں کہ یہاں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟ پھر خون تھوکو گی؟" اس کے بگڑنے پر تاجور خائف ہو گئی تھی۔

"خبردار! جو خالہ کی باتوں میں آئیں تو۔ ہم کل ہی یہاں سے نکل چلیں گے۔ ابا کو اگر ہماری یاد آئے گی تو خود ہی ہم سے ملنے آ جائیں گے۔ جاؤ سو' مجھے بھی سونے دو۔"

اس نے قصداً "تاجور کو تسلی نہیں دی اور اس کے سہمے ہوئے چہرے سے نظریں چرا کر لیٹ گیا۔ گو کہ ابھی دس ہی بجے تھے' لیکن گاؤں میں سر شام پھیل جانے والے سناٹے کے باعث یوں لگ رہا تھا جیسے بہت رات بیت گئی ہو۔ اس نے تاجور سے تو غصے میں کہہ دیا تھا کہ کل ہی یہاں سے نکل چلیں گے' لیکن اب اسے یہی ٹھیک لگ رہا تھا۔ وہ صبح ناشتے کے بعد ہی واپسی کا سوچتے ہوئے سو گیا۔

☼ ☼ ☼

پھر صبح کچھ ملی جلی آوازوں سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے غور کیا تو تاباں کی آواز تھی۔

"ہائے بجی تاج! تو تو پہچانی نہیں جا رہی۔ لال لال ہو رہی ہے۔ کیا کھلاتے تھے تجھے شہر والے؟" وہ کان لگا کر سننے لگا کہ تاجور کیا کہتی ہے۔ لیکن وہ بس ہنس رہی تھی۔

"اب تو تو ادھر ہی رہے گی نا؟" تاباں پوچھ رہی تھی۔

"نہیں! بھائی کے ساتھ واپس جاؤں گی۔" تاجور کے جواب پر اسے رات کی باتیں یاد آئیں تو اس وقت جو تاجور کی سہمی شکل دیکھ کر دل میں ملال رہ گیا تھا' وہ جاتا رہا۔

"اوہو! بڑا دل لگ گیا ہے تیرا شہر میں۔ یہاں والے یاد نہیں آتے تجھے؟" تاباں کے پوچھنے پر وہ پھر ادھر متوجہ ہوا تھا۔

"آتے ہیں۔۔۔ سب یاد آتے ہیں۔"

"تو پھر کیوں جا رہی ہے؟ نہ جا۔" تاباں نے کہا تو اب شمشیر علی نے تاجور کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ فوراً" اٹھ کر کمرے سے باہر آتے ہی تاباں پر بگڑ گیا تھا۔

"تم کیا سویرے سویرے الٹی پٹیاں پڑھانے آ گئی ہو میری بہن کو؟ تمہیں اپنے گھر میں کام نہیں ہے کیا؟"

تاباں نے یکدم اسے دیکھا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

نگہت سیما

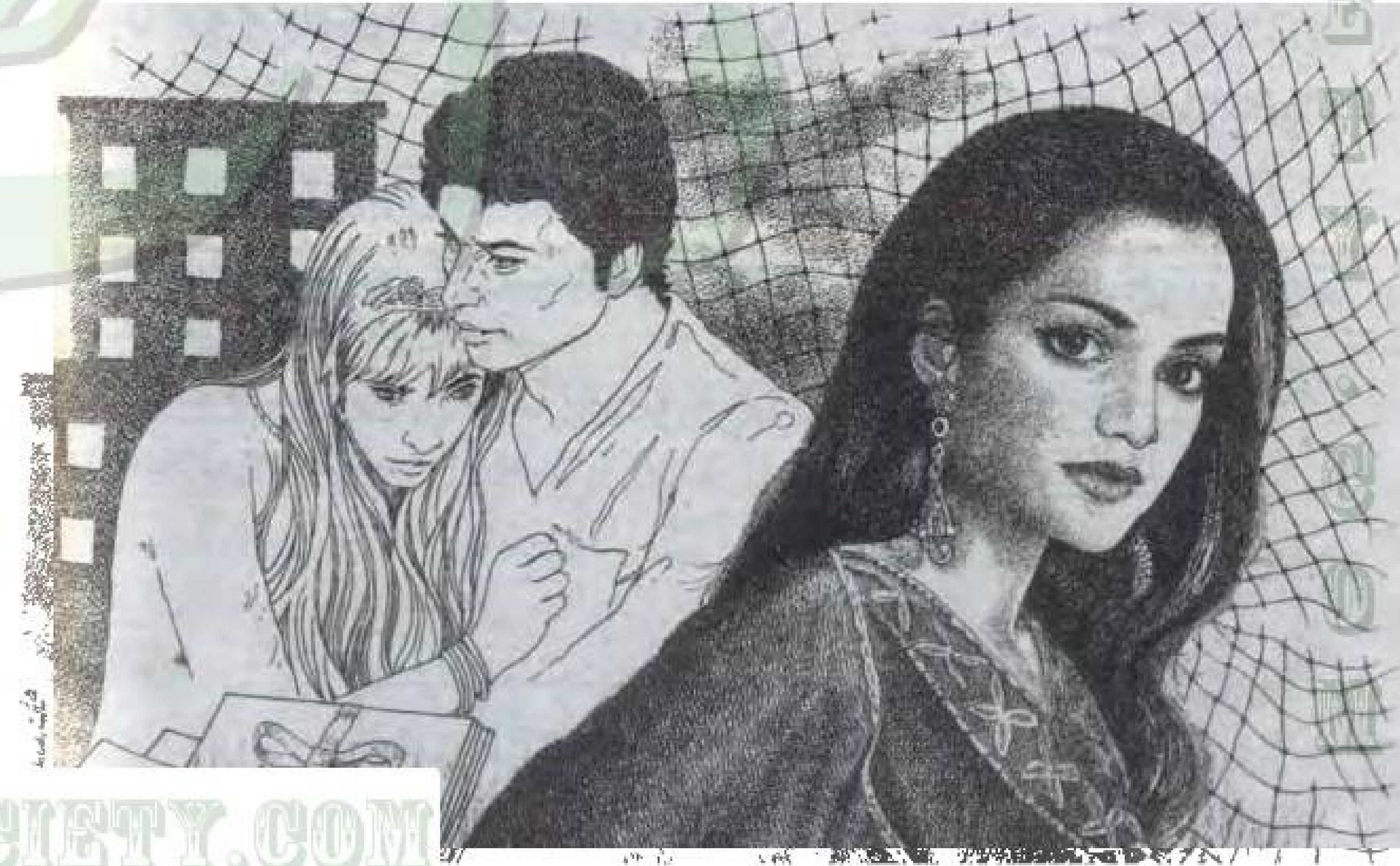
زمین کے آنسو

ایبک فلک شاہ کو خوابوں میں اکثر ایک خوب صورت اور نشیلی آنکھوں والی لڑکی روتے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس نے اسے فرضی نام "حور عین" دے رکھا ہے۔ وہ اس پر کچھ تحریر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"الریان" کے سربراہ عبدالرحمٰن شاہ ہیں۔ مصطفیٰ' مرتضیٰ' عثمان اور احسان (شانی) ان کے بیٹے ہیں۔ عمارہ (عمو) اور زارا ان کی بیٹیاں ہیں۔

"مراد پیلس" کے سربراہ مراد شاہ کے بیٹے سلجوق' عبدالرحمٰن کے گہرے دوست ہیں۔ سلجوق کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے فلک شاہ (موی) "الریان" آجاتے ہیں۔ وہاں ان کی سب سے دوستی ہو جاتی ہے۔ احسان سے ان کی دوستی زیادہ گہری ہو جاتی ہے اور عمارہ سے محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ فلک شاہ کالج میں سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگتے ہیں۔ فلک شاہ کو سلجوق کے انتقال کے بعد ان کی والدہ زریں جائیداد کے چکر میں لے جاتی ہیں مگر وہاں اس کا شوہر فیروز فلک سے چڑنے لگتا ہے۔ سلجوق کے انتقال کی وجہ سے جائیداد کے شرعی حق سے محرومی کے بعد وہ فلک شاہ کو واپس مراد شاہ کے پاس چھوڑ جاتی ہے اور چھ ماہ بعد فوت ہو جاتی ہے۔

مکمل ناول



چوتھی قسط

WWW.PAKSOCIETY.COM

عبدالرحمٰن شاہ کی بہن مروہ کی سسرالی رشتے دار مائرہ سے ملاقات میں احسان اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ عبدالرحمٰن، فلک شاہ سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں اور اپنی بیٹی عمارہ کی شادی کردیتے ہیں۔ ایک جھگڑے میں فلک شاہ "الریان" والوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرکے بہاول پور چلے جاتے ہیں۔ بہت عرصے بعد ان کے بیٹے ایبک کی "الریان" میں آمد ہوتی ہے۔ احسان کی بیوی مائرہ اور بیٹی رابیل کے علاوہ سب ایبک کی آمد پر خوش ہوتے ہیں جبکہ عمر احسان ایبک کا فین ہے۔ "الریان" میں رہنے والی، ریب فاطمہ جو کہ مروہ پھپھو کے شوہر کی رشتے کی بھانجی ہے، ایبک سے کافی متاثر ہے۔

عمارہ اور فلک شاہ "الریان" آنے کے لیے بہت تڑپتے ہیں۔ عمارہ کو انجائنا اٹیک ہوتا ہے تو عبدالرحمٰن شاہ بھی بیمار ہوجاتے ہیں۔

احمد رضا اور سمیرا، حسن رضا اور زبیدہ بیگم کے بچے ہیں۔ احمد رضا بہت خوب صورت اور ہینڈسم ہے۔ وہ خوب ترقی، کامیابی اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رضا کا دوست ابراہیم اسے ایک بزرگ اسماعیل خان سے ملواتا ہے۔ ان سے مل کر رضا کو حسن بن صباح کا گمان گزرتا ہے۔

عمارہ کی طبیعت بہتر ہوتے ہی ایبک انہیں عبدالرحمٰن شاہ کی بیماری کا بتاتا ہے۔ عمارہ یہ سنتے ہی بابا جان سے ملنے کے لیے بے چین ہوجاتی ہیں۔

احسان شاہ، فلک شاہ کو مائرہ سے اپنی محبت کا احوال سناتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ مائرہ —— ان سے کھل کر اظہار محبت کرچکی ہوتی ہے جبکہ ان کا رشتہ عمارہ سے طے ہوچکا ہے اور وہ عمارہ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔

احمد رضا کو پولیس گرفتار کرکے لے جاتی ہے۔ اس پر الزام ہوتا ہے کہ وہ اسماعیل خان سے جو خود کو اللہ کا بھیجا ہوا خلیفہ کہتا ہے 'لوگوں کو بہکا رہا ہے' ملتا ہے۔ احمد رضا کو اس کے والد گھر لے آتے ہیں۔

الوینا جو اسماعیل کے ہاں احمد رضا کو ملی تھی۔ وہ اسے فون کرکے بلاتی ہے۔

اسماعیل، احمد رضا سے کہتا ہے کہ احمد رضا کو دولت، عزت اور شہرت ملنے والی ہے۔ احمد رضا مسرور ہوجاتا ہے۔ ہمدان کو عمارہ پھوپھو کی بیٹی انجی بہت پسند تھی، لیکن گھر والوں کے شدید ردعمل نے اسے مایوس کردیا۔ نئی نسل میں سے کوئی نہیں جانتا کہ عمارہ پھوپھو پر الریان کے دروازے کیوں بند ہیں۔

اریب فاطمہ مروہ پھوپھو کی سسرالی رشتہ دار ہے، جسے مروہ پھوپھو پڑھنے کے لیے الریان لے آئی ہیں، یہ بات مائرہ بھابھی کو پسند نہیں ہے۔ ایبک، عمارہ کو لے کر باباجان کے پاس آیا تو اتنے عرصہ بعد انہیں دیکھ کر باباجان کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ باباجان کی طبیعت سنبھل جاتی ہے۔ اسپتال میں عمارہ کو دیکھ کر سب بہت خوش ہوتے ہیں، مگر مائرہ اور رابیل انہیں تنفر اور سخت تنقیدی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ مائرہ، عمارہ سے کافی بدتہذیبی سے پیش آتی ہے جبکہ احسان شاہ غصے سے منہ موڑ کر چلے جاتے ہیں۔

فلک شاہ، مروہ پھپھو سے مائرہ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ وہ فلک اور عمارہ کے فوری نکاح کا مشورہ دیتی ہیں۔ یوں مصطفیٰ اور عثمان کے ولیمہ میں ان دونوں کا نکاح ہوجاتا ہے۔ مائرہ رحیم یار خان سے مصطفیٰ کو فون کرکے اپنا نام پوشیدہ رکھ کر فلک شاہ کے خلاف بھڑکاتی ہے مگر مصطفیٰ مروہ پھپھو سے بات کرکے مطمئن ہوجاتے ہیں تاہم ان کو یہ فون کال آج بھی یاد ہے۔

فلک شاہ نے حق نواز کی پارٹی باقاعدہ طور پر اختیار کرلی۔ مائرہ اور احسان کی شادی کے بعد ایک جھگڑے میں فلک شاہ کبھی بھی "الریان" میں قدم نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں بصورت دیگر ان کی طرف سے عمارہ کو طلاق ہوگی جبکہ احسان شاہ کہتے ہیں کہ "الریان" سے اگر کوئی "مراد پیلس" گیا تو وہ خود کو گولی ماریں گے۔

سمیرا کو شک ہوجاتا ہے کہ احمد رضا، اسماعیل خان کے پاس اب بھی جاتا ہے تاہم احمد رضا اسے بہلا لیتا ہے اور یوں ہی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ اسماعیل خان اسے ورلڈ سوسائٹی آف مسلم یونٹی کا اہم کارکن بنا کر اس سے الٹے سیدھے بیان دلوادیتا ہے۔ حسن رضا یہ خبر پڑھ کر احمد رضا کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔

لبوں پر مدھم مسکراہٹ، آنکھوں میں گہری چمک لیے وہ الریان کے ایک ایک فرد کے متعلق انجی کو بتا رہے تھے جب بیڈ پہ پڑا ان کا فون بج اٹھا تھا۔ انہوں نے چونک کر بیڈ کی طرف دیکھا تو انجی نے اٹھ کر فون اٹھایا اور پھر مڑ کر فلک شاہ کی طرف دیکھا۔

"بھائی کا ہے۔"

انہوں نے بے حد مضطرب سا ہو کر ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور پھر آن کرکے بے چینی سے پوچھا۔

"ایبک بیٹا! عمو ٹھیک ہے نا۔ باباجان کیسے ہیں اور وہاں پر... ان سب نے..." پھر کسی انجانے خوف سے سہم کر وہ چپ ہوگئے تھے۔

"سب ٹھیک ہے باباجان!" دوسری طرف بھی ایبک تھا۔ جو اتنی دور سے بھی ان کے دل میں چھپے خوف کو جان گیا تھا۔ "باباجان ٹھیک ہیں اور اس وقت دونوں باپ بیٹی مزے سے باتیں کررہے ہیں۔"

وہ ہولے سے ہنسا تھا۔ اور فلک شاہ کے مضطرب دل کو ذرا سا قرار آیا تھا لیکن وہ اسی بے چینی اور اضطراب سے پوچھ رہے تھے۔

"وہاں اسپتال میں اس وقت اور کون کون ہے؟"

"مصطفیٰ انکل ہیں۔ ہمدان ہے اور میں ہوں۔ آپ سے بات کرنے کے لیے لان میں آیا تھا اور اب واپس روم میں جارہا ہوں۔ رات کو تفصیل سے بات ہوگی۔ اوکے۔ اپنا خیال رکھیے گا بہت۔"

"ایبک!" انہوں نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "شانی... شانی نہیں آیا عمو سے ملنے؟"

"کون احسان انکل؟" ایبک نے ایک گہری سانس لی۔ "وہ تو اس وقت آفس میں ہوں گے۔ باباجان کے پاس تو صرف ہمدان تھا۔ مصطفیٰ انکل بھی ابھی آئے نہیں۔ اور احسان انکل کو تو ماما کے آنے کا پتا بھی نہیں ہے۔"

اس نے ایک بار پھر انہیں اپنا خیال رکھنے کی تاکید کی اور انجی کو فون دینے کو کہا۔

اور انجی کو فون دے کر وہ کسی گہری سوچ میں کھوگئے تھے۔ یک دم دل پر اداسی کا غبار سا چھا گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کتنے خوش تھے۔ ان کی عمو چھبیس سال بعد اپنے باباجان سے ملی ہوگی۔ یہ احساس کتنا خوشی کن تھا اور ایبک نے تو ایسی کوئی بات بھی نہیں کی تھی جس سے وہ اداس ہوجاتے لیکن پھر بھی یکایک جیسے وہ ہر شے سے بیزار سے ہوگئے تھے۔

انجی نے فون آف کرکے ان کی طرف دیکھا۔ "بابا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

انہوں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہوں چندا! کچھ تھکن سی ہورہی ہے۔ اب آرام کروں گا۔"

"ٹھیک ہے باباجان! آپ کے لیے دودھ لے آؤں؟"

"نہیں بیٹا! تم بھی اب آرام کرو۔ میں دودھ نہیں پیوں گا۔"

"آپ نے کھانا بھی تو ٹھیک سے نہیں کھایا بابا۔"

"آج بھوک پیاس سب مرگئی ہے۔" انہوں نے سوچا اور مسکرادیے۔

"کھا تو لیا تھا۔"

"کہاں! دو لقمے لیے تھے۔" انجی نے کسی قدر ناراضی سے کہا تو وہ پھر مسکرادیے۔

"آج دل ویسے ہی بھرا ہوا ہے خوشی سے اور تم اب کہاں جارہی ہو۔ آرام کرو۔"

"بابا وہ جواد نے ذرا دیر سے آنے کو کہا تھا۔ میں ان کے آنے تک ٹی وی دیکھوں گی۔" انجی اٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ سوئیں گے اب؟" پھر وہ جاتے جاتے پلٹی تھی۔ "میں آپ کی ہیلپ کروں؟"

"نہیں، میں ابھی سوؤں گا نہیں۔ جواد آجائے تو پھر۔"

انہوں نے وہیل چیئر کو کھڑکی کی طرف بڑھایا۔

"بابا... کھڑکی مت کھولیے گا۔ آج کچھ خنکی ہے باہر۔"

انہوں نے سر ہلادیا تھا۔ لیکن انجی کے باہر جانے کے بعد انہوں نے شیشہ سرکایا۔ آسمان پر اب بھی ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی آسمان کی طرف دیکھتے رہے۔ کھڑکی کھلتے

ہی ہلکی سی خنکی اندر در آئی تھی اور ہوا کے جھونکے ان کے چہرے سے ٹکرائے تو انہیں اچھا لگا۔ ان کا جی چاہا' وہ یونہی کھڑکی کھولے بیٹھے رہیں اور باہر سے آتی ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے ان کے چہرے سے ٹکراتے رہیں۔ عجیب سی آگ تھی جو جسم و جان کو جلائے جاتی تھی

اس روز بھی ان کے اندر ایسی ہی آگ دہک اٹھی تھی جب مروہ پھپھو نے مختصراً" انہیں بائرہ کے فون کا بتایا تھا۔ ان کے نکاح کی تقریب ہو چکی تھی۔

وہ سب سے مبارکبادیں وصول کرتے ہوئے گاہے گاہے ایک نظر عمارہ پر بھی ڈال لیتے تھے۔ جو دلہن نہیں بنی تھی۔ سادہ سے میک اپ میں سادہ سے جوڑے میں بھی اس کا روپ قیامت ڈھا رہا تھا اور یہ اماں جان کا حکم تھا چونکہ رخصتی چند ماہ بعد ہے تو نکاح میں عمارہ کو مکمل دلہن نہ بنایا جائے بلکہ ان کا تو اصرار تھا کہ عام گھریلو لباس میں نکاح کر دیا جائے جبکہ باقی سب کا خیال تھا کہ اصل تقریب تو نکاح ہی ہے۔ باقی سب تو ثانوی باتیں ہیں۔ تاہم اماں جان کی بات کسی حد تک مان لی گئی تھی کہ دادی جان بھی ان کی ہم نوا تھیں۔

"دراصل اماں جان نے یہ شرط اس لیے لگائی ہے کہ کہیں تم دلہن دیکھ کر مچل ہی نہ اٹھو کہ ابھی رخصتی کر دیں۔" راحت بھائی نے مذاق کیا تھا۔

"ہاں بھئی! اس کا کیا اعتبار۔ بڑا گھنا ہے۔" مصطفیٰ بھی بولے تھے۔

"پہلی بار چپکے سے بہاول پور گیا تو آنے پر منگنی کا شوشا چھوڑا۔۔۔ اور اب پھر اچانک وہاں گیا تو نکاح کی خبر لایا۔" فلک شاہ مسکرا دیے تھے۔ منگنی کے لیے تو دادا جان اور دادی جان نے زیادہ کچھ نہیں کہا تھا فوراً" ہی تیار ہو گئے تھے۔۔۔ لیکن شادی کے لیے وہ قطعی تیار نہیں تھے۔ ان کی بات سن کر وہ یکدم چپ ہو گئے تھے۔

"عبدالرحمٰن نہیں مانے گا بیٹا اور میں بھی سمجھتا ہوں' پہلے تم اپنی تعلیم مکمل کر لو۔ عمارہ بھی اپنی تعلیم مکمل کر لے۔ عبدالرحمٰن کے خاندان میں پڑھائی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے بیٹا۔۔۔۔ اسے اب تک تمہارے یو۔ اے۔ سی کو چھوڑنے کا دکھ ہے۔"

اور تب انہیں دادا جان کو سب کچھ بتانا پڑا تھا۔

"یہ بہت ضروری ہے دادا جان ورنہ میں۔۔۔ ورنہ اس لڑکی نے کچھ ایسا ویسا بدگمان کر دیا بابا جان کو تو میں تو انہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہوں گا۔ میں سچ کہتا ہوں دادا جان! بابا جان نے اگر ایک بدگمانی کی نظر بھی مجھ پر ڈالی تو میں تو اسی وقت مر جاؤں گا۔"

اور دادا جان نے ساری بات سن کر ایک لفظ بھی مزید نہیں کہا تھا اور اسی روز لاہور کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ انہیں الریان چھوڑ کر وہ ہاسٹل آ گئے تھے اور پھر وہ دادا جان کے فون کے انتظار میں بے چینی سے اپنے ہاسٹل کے کمرے میں ادھر سے ادھر تک ٹہلتے رہے تھے۔ کبھی بیٹھ جاتے کبھی کھڑے ہو جاتے۔

"کتنی عجیب بات ہے میں فلک مراد شاہ ایک چھوٹی سی لڑکی سے خوف زدہ ہو گیا ہوں۔" انہیں خود پر ہنسی آئی تھی اور ایسے میں حق نواز کے فون نے انہیں مزید بے چین اور مضطرب کر دیا تھا۔ وہ انہیں کسی فوری نوعیت کی ہنگامی میٹنگ میں شرکت کے لیے کہہ رہا تھا۔

"سوری یار! میرا آج آنا مشکل ہے۔"

"کیوں؟" حق نواز کے لہجے میں طنز کی جھلک صاف محسوس ہوتی تھی۔

"کیا ایک بار پھر ہماری پارٹی چھوڑنے کا ارادہ تو نہیں کر لیا۔ جب تم نے رکنیت کا فارم لیا تھا تو میں نے تم سے کہا تھا۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ اس سے پہلے بھی تم ایک بار غیر رسمی طور پر ہی سہی' میری پارٹی جوائن کر کے چھوڑ چکے ہو۔"

"ہاں!" انہوں نے بے دھیانی سے اس کی بات سنی تھی اور سادگی سے جواب دیا تھا۔

"تب اور بات تھی حق نواز! میں تم سے متاثر ہو کر تمہاری پارٹی میں شامل ہوا تھا لیکن میرے خاندان والے اس کے خلاف تھے اور۔"

"تو کیا اب وہ خلاف نہیں ہیں تمہارے سیاست میں آنے کے؟" حق نواز کو پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ ورنہ وہ اس طرح جرح نہیں کرتا تھا۔

"وہ اب بھی پسند نہیں کرتے میرا سیاست میں آنا۔ لیکن میں نے اس بار انہیں مکمل بے خبر رکھا ہے۔ پہلے شائی کچھ نہ کچھ جانتا تھا' اس لیے مجبوراً" مجھے پارٹی چھوڑنا پڑی تھی لیکن اب تو میں نے فارم بھرا ہے رکنیت کا۔۔۔۔ بس کچھ پرابلم ہے آج آ نہیں سکتا۔"

"اوکے!" حق نواز نے فون بند کر دیا تھا اور وہ مزید پریشان ہوئے تھے۔ اس نے کچھ کہا تو نہیں تھا ایسا پھر بھی انہیں لگا تھا کہ ان کے شرکت نہ کرنے پر حق نواز کچھ ناراض سا ہو گیا ہے وہ بے حد الجھے الجھے سے بیٹھے تھے جب دادا جان خود ہی چلے آئے تھے اور وہ تقریباً" بھاگتے ہوئے باہر آئے تھے اور جب وہ دادا جان کا ہاتھ تھام کر انہیں اندر کمرے میں چلنے کو کہہ رہے تھے تو دادا جان نے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھا تھا اور پھر یکدم ہی گلے سے لگا لیا تھا۔

"تو بہت لکی ہے یار! عبدالرحمٰن مان گیا ہے۔ فی الحال نکاح ہو گا اور عمارہ کے ایگزام کے بعد رخصتی۔"

اور بے حد سکون محسوس کرتے ہوئے وہ انہیں اپنے کمرے میں لے آئے تھے لیکن دادا جان زیادہ دیر نہیں ٹھہرے تھے۔ وہ الریان سے ڈرائیور کو ساتھ لے کر مٹھائی لینے نکلے تھے اور انہوں نے سوچا تھا وہ انہیں بھی بتاتے چلیں۔

"کیا خیال ہے فلک! سات کلو مٹھائی لے جاؤں۔"

"دادا جان! مجھے کیا پتا۔" وہ ہولے سے ہنس دیے تھے۔

"یار! خوشی کا موقع ہے۔ تم بھی چلو' وہاں الریان میں اس وقت بڑی رونق ہے۔ تمہارے نکاح کے ساتھ ساتھ مصطفیٰ اور عثمان کی شادی کی تاریخ بھی طے کی جا رہی ہے۔"

اور انہیں یکدم حق نواز کی ناراضی کا خیال آ گیا تھا۔

"مجھے ایک ضروری کام ہے دادا جان! میں کچھ دیر تک آتا ہوں۔ آپ جائیں۔"

اور پھر دادا جان کو رخصت کر کے وہ بے حد مطمئن ہو کر پارٹی کے دفتر آ گئے تھے۔

انہیں دیکھ کر حق نواز کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ اٹھی تھی۔

بنگلہ دیش نامنظور کی تحریک تو دم توڑ چکی تھی اس وقت نہ جانے کیا مسئلہ درپیش تھا' وہ چپکے سے جا کر حق نواز کے نزدیک ہی خالی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

"جمہوریت۔"

"انتخابات۔"

"مخلص سربراہ۔"

نہ جانے کن کن موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں لیکن ان کا ذہن بار بار الریان کی طرف چلا جاتا تھا۔ جہاں اس وقت رونق لگی ہو گی۔ وہ "الریان" سے ہاسٹل چلے آئے تھے۔ تو بہت ساری باتوں کا انہیں علم نہیں ہو پاتا تھا۔ مصطفیٰ اور عثمان کی شادیاں تو طے تھیں۔ ثنا بھابی سے اس کی ملاقات بھی ہو چکی تھی اور راحت بھائی کی یہ کزن انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ لیکن اتنی جلدی ان کی شادی ہو رہی تھی "اس کا انہیں علم نہیں تھا اور قصور ان کا ہی تھا۔ حق نواز کی پارٹی میں شامل ہونے کے بعد وہ اس طرح اتنی باقاعدگی سے الریان جا نہیں پاتے تھے۔

اور جب وہ دفتر سے نکلے تو بہت رات ہو گئی تھی اور اس وقت انہیں الریان جانا مناسب نہیں لگا تھا۔

"ارے کہیں سچ مچ تو رخصتی کے متعلق نہیں سوچنے لگے تم؟"

مصطفیٰ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھا تھا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگے تھے۔

"اگر سوچوں بھی تو بابا جان بھلا کہاں رخصت کریں گے عمارہ کو۔"

"بابا جان! تمہاری کوئی بات ٹالتے بھی تو نہیں ہیں۔"

مصطفیٰ نے کہا تھا اور اس وقت انہوں نے بابا جان کے لیے اپنے دل میں بڑا مان اور یقین محسوس کیا تھا۔

"اور میں بابا جان کو کسی آزمائش میں ڈالوں ہی کیوں۔"

انہوں نے ایک بار کن اکھیوں سے عمارہ کی طرف دیکھا تھا جو جانے زارا سے کیا کہہ رہی تھی۔ مصطفیٰ کسی کے بلانے پر وہاں سے چلے گئے تھے اور وہ دادی جان کو دیکھنے کے لیے لان کے اس حصے کی طرف آئے تھے جہاں کچھ دیر پہلے دادی جان بیٹھی تھیں۔

گھر کے وسیع لان میں ہی تقریب کا انتظام کیا گیا تھا۔ صرف گھر کے افراد اور عبدالرحمٰن شاہ کے قریبی رشتہ دار اور احباب وغیرہ تھے۔

لان کے اس حصے میں انہیں دادی جان تو نظر نہ آئی تھیں' ہاں مروہ پھپھو ایک کرسی پر بیٹھی نظر آ گئی تھیں جو جھک کر اپنے پاؤں کو دبا رہی تھیں۔

"کیا ہوا پھپھو؟" ان کے قریب آ کر انہوں نے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں۔ اتنی ہائی ہیل تھی' پاؤں میں درد ہونے لگا تھا۔ زارا کو فلیٹ جوتا لانے کے لیے بھیجا ہے اندر۔"

"دادی جان کہاں ہیں۔"

"وہ زارا کے ساتھ ہی اندر چلی گئی ہیں۔"

طبیعت تو ٹھیک تھی نا؟" وہ پریشان ہوئے۔

"ہاں' شاید تھک گئی تھیں۔" مروہ نے ان کی طرف دیکھا۔

"تھینک گاڈ! مومی سب کچھ خیر خیریت سے ہو گیا۔ ورنہ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔"

"کس بات کا ڈر پھپھو؟" وہ حیران ہوئے تھے۔

"مائرہ کا..... بہت جنونی ہو رہی ہے وہ لڑکی' پتا ہے اس روز اس نے یہاں الریان میں فون کیا تھا۔"

وہ انہیں مصطفیٰ کے پاس آنے والے فون کے متعلق بتانے لگی تھیں اور انہیں لگا تھا جیسے ان کے پورے وجود میں آگ دہک اٹھی تھی۔

"اب نہیں پھپھو..... اب میں نہیں چھوڑوں گا اس لڑکی کو۔"

"پاگل ہو گئے ہو مومی! خوامخواہ بات بڑھانے سے فائدہ..... اب تمہارا نکاح ہو گیا ہے۔ اب بھلا کیا ہو سکتا ہے اور کیا کرنا ہے اس نے۔"

"کچھ بھی کر سکتی ہے وہ۔ پھپھو پلیز مت روکیں مجھے۔ میں ابھی اسی وقت رحیم یار خان جا رہا ہوں۔ میں اسے سبق سکھاؤں گا۔ دوسروں کی عزت اچھالنے والی کی جب اپنے عزت پر بات آئے گی تو۔"

"بیٹھ جاؤ مومی!" مروہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا تھا۔

"ریلیکس ہو جاؤ۔ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ میرے سسرال کا معاملہ ہے۔"

اور پھر مروہ پھپھو بہت دیر تک انہیں سمجھاتی رہی تھیں۔ لیکن ان کے اندر دہکتی آگ کو ٹھنڈا ہونے میں کئی دن لگ گئے تھے اور وہ مصطفیٰ اور عثمان کی شادی کو بھی صحیح طرح سے انجوائے نہیں کر پائے تھے۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ دادا جان اور دادی جان واپس بہاول پور چلے گئے۔ مصطفیٰ اور عثمان کی شادیاں بخیر و خوبی ہو گئی تھیں۔ وہ ہاسٹل واپس آ گئے تھے۔ لیکن غیر ارادی طور پر وہ کئی دن تک منتظر رہے کسی انہونی کے۔

پتا نہیں کیوں انہیں لگتا تھا کہ مائرہ کسی روز ان کے ہاسٹل آ دھمکے گی اور پھر وہ کیا کرے گی وہ اس کے متعلق کچھ بھی اندازہ نہیں کر پا رہے تھے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ البتہ احسان آ گیا تھا بے حد خوش اور مطمئن۔

"بہت پڑھاکو ہو گئے ہو۔" آتے ہی پہلے اس نے ان کے ہاتھ سے کتاب چھین کر پھینکی تھی۔

کہاں غائب ہو' ویک اینڈ پر سب ہی تمہارا انتظار کرتے رہے۔"

"کہیں بھی نہیں' ہاسٹل میں ہی رہا۔ فلو ہو رہا تھا۔" اندر کے خوف کو چھپا کر انہوں نے چپکے سے

احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

"فلو ہو گیا تھا اور یہاں پڑے رہے اکیلے۔ تم کچھ اجنبی نہیں ہوتے جا رہے ہو موی!" احسان نے گلہ کیا تھا۔

اور وہ چپ رہے تھے جب سے مروہ پھپھو نے مائرہ کے فون کے متعلق بتایا تھا' اندر سے وہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اس بات کا تو انہیں یقین تھا کہ وہ فون مائرہ کا ہی تھا۔ شک و شبے کی تو اس میں کوئی گنجائش تھی ہی نہیں اور انہوں نے مروہ پھپھو کے سمجھانے کے باوجود سوچ رکھا تھا کہ اگر مائرہ شادی میں شرکت کے لیے آئی تو وہ ضرور اس سے بات کریں گے لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ احسان اس کے نہ آنے پر بے حد مایوس ہوا تھا لیکن مروہ پھپھو مطمئن تھیں۔

"اچھا ہے نہیں آئی ورنہ خوامخواہ مجھے ٹینشن رہتی' تم نہیں جانتے ہو موی! وہ بڑی انتقامی فطرت کی لڑکی ہے۔ یہاں آکر پتا نہیں کیا کرتی۔"

"پتا ہے۔" انہیں اسے خاموش دیکھ کر احسان نے بتایا۔ "مائرہ نے مجھے فون کیا تھا۔"

"کیا..... کیا کہا اس نے۔" وہ یکدم اچھل پڑے تھے۔

"کچھ خاص نہیں....." احسان ان کے بیڈ پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ خوشی اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔

"لیکن مجھے لگتا ہے موی! تمہاری سفارش کام آ گئی۔ پتا ہے وہ کہہ رہی تھی۔ موی تمہاری بہت تعریف کرتا تھا۔"

"اچھا..... ایسا کہا اس نے؟" وہ زبردستی مسکرائے تھے۔

"ہاں!" احسان بے حد مطمئن تھا۔ "بہت دیر تک باتیں کرتی رہی۔ آج میں اسے فون کروں گا۔"

"اچھا!" وہ الجھے ہوئے تھے لیکن احسان بہت خوش تھا اور اس خوشی میں وہ بہت دیر تک مال پر گھومتے رہے اور واپسی میں انہوں نے عمارہ اور زارا کی پسندیدہ آئس کریم لی تھی اور "الریان" آ گئے تھے۔ پھر مصطفیٰ' ثنا بھابھی' عثمان بھائی وغیرہ کے ساتھ وہ ایک شان دار شام گزار کر ہاسٹل واپس آئے تھے تو حق نواز کا پیغام ان کا منتظر تھا۔

اور پھر اگلے کئی دن وہ حق نواز کے ساتھ مصروف رہے۔ پارٹی کی میٹنگز' اجلاس' وغیرہ اور جب وہ فارغ ہو کر الریان گئے تو احسان شاہ نے انہیں خوش خبری سنائی تھی۔

"موی یار! میں نے بالآخر مائرہ کے سامنے اپنے دل کھول کر رکھ دیا۔" وہ بے حد خوش تھا۔

اور مائرہ نے کیا کہا؟" انہوں نے دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔

"اس نے میرے جذبوں کی پذیرائی بڑے خوب صورت انداز میں کی موی! اس نے کہا کہ میں اپنے والدین کو اس کے گھر بھجواؤں۔"

اور ان کے دل میں دور تک اطمینان پھیلتا چلا گیا تھا۔ اللہ نے شاید ان کی دعائیں قبول کرلی تھیں جو انہوں نے احسان کے لیے کی تھیں۔ اور یہ لڑکیاں بھی کتنی بے وقوف ہوتی ہیں۔ لیکن شکر ہے' مائرہ کو عقل آ گئی ہے۔ بھلا شانی جیسا لڑکا جو اسے اتنا چاہتا ہے کہیں مل سکتا ہے؟

اور اس روز بڑے دنوں بعد انہیں اپنے دل سے بوجھ سرکتا ہوا سا محسوس ہوا تھا اور اس روز بڑے دنوں بعد ان کا دل چاہا تھا کہ وہ آج الریان میں ہی رک جائیں اور اس روز وہ باباجان سے اجازت لے کر زارا' عمارہ اور احسان شاہ کے ساتھ فلم دیکھنے گئے تھے اور زارا کو مخاطب کر کے ذو معنی باتیں کرنا اور عمارہ کے رخسار پر پھیلتے رنگوں کو دیکھنا انہیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

اور اس رات جب وہ اپنے بیڈ پر لیٹے تھے تو انہیں لگا تھا جیسے آج نہ جانے کتنے دنوں بعد وہ سکون سے سوئیں گے۔

اور پھر کئی دن گزر گئے۔ وہ بے حد مطمئن ہو کر اپنی پڑھائی اور پارٹی کے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ اور بہت کم "الریان" جا پاتے تھے لیکن جس روز

"الریان" جاتے وہاں جیسے عید کا سا سماں ہو جاتا۔ سب لاؤنج میں اکٹھے ہو جاتے۔ بابا جان اور اماں جان بھی کچھ دیر کو ان کی محفل میں بیٹھتے تھے۔

ان دنوں احسان شاہ کی شوخیاں عروج پر تھیں۔ احسان شاہ اور مائرہ کے درمیان اکثر فون پر بات چیت ہو جاتی اور احسان شاہ ہر بات انہیں بتاتے اور ہر بار احسان شاہ سے مل کر وہ مزید مطمئن ہو جاتے۔ اس روز تو احسان شاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ وہ ہاسٹل کے کمرے میں گہری نیند سو رہے تھے۔ جب احسان شاہ نے آکر ان کا کمبل کھینچا تھا۔

چھٹی ہونے کی وجہ سے ان کا بہت دیر تک اٹھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ کیونکہ رات کافی دیر تک وہ پروفیسر الطاف کے ساتھ رہے تھے۔

انہوں نے کمبل کو خود پر لپیٹ کر کروٹ بدل لی تھی۔ تب احسان شاہ نے بازو سے پکڑ کر انہیں جھنجھوڑا تھا۔

"اٹھو یار! گیارہ بج رہے ہیں۔"

اور جب انہوں نے بیڈ کے پاس کھڑے احسان شاہ کو دیکھا تھا تو یک دم گھبرا گئے تھے اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر تقریباً" چیختے ہوئے پوچھا تھا۔

"کیا ہوا شانی۔ سب ٹھیک تو ہیں نا۔ بابا جان۔ دادا جان اور سب۔" ان کی آواز گھٹ گئی تھی۔

"یار! سب ٹھیک ہے' سب خیریت ہے۔" احسان نے ہولے سے ان کا بازو تھپتھپایا تھا۔

"تم آج بھی پہلے کی طرح نیند سے اچانک اٹھانے پر گھبرا جاتے ہو۔"

اور انہوں نے اپنے تیزی سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

اور انہیں وہ شام یاد آ گئی تھی۔ جب وہ پہلی بار "الریان" میں آئے تھے اور دادا جان بابا کو لے کر چلے گئے تھے اور اس دوپہر وہ بہت گہری نیند سو رہے تھے جب احسان شاہ نے انہیں جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا اور وہ دہشت بھری آنکھوں سے اسے اور اس کے قریب کھڑی عمارہ کو دیکھنے لگے تھے۔ انہیں لگا تھا جیسے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ لیکن ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"بابا!" ان کے کانپتے لبوں سے نکلا تھا۔ "بابا تو ٹھیک ہیں نا۔"

اور عمارہ نے چمکتی آنکھوں اور سرخ چہرے کے ساتھ بتایا تھا۔

"وہ..... موی! باہر لان میں امرود کے درخت پر طوطا بیٹھا ہوا ہے سرخ کنٹھے والا۔"

تیز تیز بولتے ہوئے عمارہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تھا لیکن وہ کتنی ہی دیر تک وحشت زدہ سے اس کی بات سمجھے بغیر اسے دیکھتے رہے تھے ان کی آنکھوں کے سامنے بابا آ رہے تھے۔

بابا جن سے وہ بہت پیار کرتے تھے۔

اور ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان سے بہت ساری باتیں کریں۔ لیکن وہ بیمار تھے اور ابھی کچھ دیر پہلے ہی بابا نے ان سے بات کی تھی۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہے تھے اور انہوں نے کہا تھا۔

"فلک بیٹا! آپ کو ہمیشہ بہادری کے ساتھ مشکلات اور غموں کو برداشت کرنا ہے۔" ان کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ وہ بمشکل ان کی بات سمجھ رہے تھے۔

"تو کیا.....؟"

وہ خوف زدہ نظروں سے شانی اور عمارہ کو دیکھ رہے تھے انہیں عمارہ کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ تب احسان شاہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا اور جوش سے بولے تھے۔

"موی یار! اٹھو نا..... وہ طوطے اڑ جائیں گے۔ دو..... دو طوطے ہیں۔ سرخ کنٹھوں والے پکڑتے ہیں جا کر..... مالی بابا کہتے ہیں سرخ کنٹھوں والے طوطے بولنا جلدی سیکھ جاتے ہیں۔"

اور تب کہیں جا کر ان کی وحشت ختم ہوئی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے موی! سب ٹھیک ہے' سب خیریت ہے۔" احسان شاہ نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا تو وہ چونکے تھے۔

"پھر اتنی صبح تم کیسے آ گئے شانی؟"

"صبح کہاں! گیارہ بج رہے ہیں یار!"

"لیکن اتوار کو تو تمہاری صبح اتنی جلدی نہیں ہوتی پھر آج۔" انہوں نے جیسے حواس میں آتے ہوئے اسے بغور دیکھا تھا۔

اس کی چمکتی آنکھوں کو اور اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ کو۔

"آج بہت خاص بات ہے یار! آج مائرہ نے مجھ سے اظہار محبت کیا ہے۔ یار موی! وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ بہت محبت کرنے لگی ہے، مجھ سے۔ پتا ہے اس نے کہا ہے' وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی اب۔"

"تو۔۔۔؟" انہوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔ تم نے اماں جان اور بابا جان سے بات کی؟"

"نہیں۔" احسان شاہ نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "شنا بھابی سے کچھ دن پہلے بات ہوئی تھی اور انہوں نے سرسری ساذکر کیا تھا اماں جان سے لیکن اماں جان نے کہا۔ مروہ کے سسرال میں وہ رشتہ نہیں کریں گی اس طرح وٹہ سٹہ ہو جاتا ہے اور اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو دو خاندان متاثر ہوتے ہیں۔۔۔ اور پھر مائرہ شانی سے عمر میں بڑی ہے۔"

"تو پھر تم کیا کرو گے شانی؟" وہ پریشان سے ہو گئے تھے۔

"میں مروہ پھپھو سے بات کروں گا۔ وہی کچھ کر سکتی ہیں۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ تم بات کرنا پھپھو سے۔"

"کیا پھپھو آئی ہوئی ہیں؟"

"نہیں تو۔۔۔ ہم رحیم یار خان جائیں گے۔"

"ابھی۔۔۔؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"ہاں ابھی اور تم فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔۔۔ دس منٹ میں۔۔۔ ناشتا ہم کہیں باہر کرلیں گے راستے میں۔"

وہ اٹھے تھے اور احسان شاہ ان کے بیڈ پر نیم دراز ہو کر انہیں تیار ہوتے دیکھنے لگا تھا۔ اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ ان کے ساتھ رحیم یار خان جا رہے تھے۔

"بابا جان! آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔"

جواد نے اندر قدم رکھا تھا اور انہوں نے چونک کر مڑتے ہوئے اسے دیکھا اور کھڑکی بند کر دی تھی۔

"تمہارا انتظار کر رہا تھا بیٹا!"

"سوری بابا! کچھ دیر ہو گئی۔ جن لوگوں سے ملنا تھا' وہ بہت دیر سے آئے تھے۔"

"کوئی بات نہیں یار! مجھے تو آج ویسے ہی نیند نہیں آرہی تھی۔ تم نے کھانا کھالیا؟"

"ہوں ابھی کھانا لگانے لگی تھی۔ میں آپ کی طرف آگیا۔"

"جاؤ' کھانا کھالو۔" انہوں نے محبت سے اسے دیکھا۔

"آپ تھک گئے ہوں گے' لیٹ جائیں اب۔" انہوں نے سرہلا دیا۔

تب جواد نے ان کی مدد کی اور لیٹنے کے بعد ان پر کمبل پھیلا دیا۔

"شکریہ بیٹا!" ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"کس بات کا بابا جان؟" جواد نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "کیا باپ کو اتنی سی بات پر بیٹے کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

"سوری بیٹا! ایسے ہی عادتاً" کہہ دیا۔ تم اب جاؤ میں بھی سونے لگا ہوں۔"

جواد چلا گیا۔۔۔ تو انہوں نے آنکھیں موند لیں اور بہت سارے منظر آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔

ان کا رحیم یار خان جانا۔ مروہ پھپھو کا ان سے وعدہ کرنا کہ وہ شانی اور مائرہ کے رشتے کے لیے بابا جان اور اماں جان کو قائل کرنے کی پوری کوشش کریں گی اگرچہ وہ خود اس کے حق میں ہرگز نہیں تھیں اور انہوں نے احسان شاہ کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن احسان شاہ نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"مروہ پھپھو! مجھے شادی کرنا ہے تو صرف مائرہ سے۔۔۔ ورنہ نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں پھپھو!"

"تم یقیناً" اس سے محبت کرتے ہو گے شانی۔ لیکن وہ تم سے محبت کرتی ہے' مجھے اس کا یقین نہیں۔"

احسان شاہ نے چونک کر مروہ پھپھو کو دیکھا تھا اور پھر لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔

"سو واٹ۔۔۔ مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔" تب مروہ پھپھو نے بے بسی سے انہیں دیکھا تھا۔

"موی! تم نے اسے سمجھایا نہیں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔"

"محبت میں آدمی بے اختیار ہو جاتا ہے پھپھو! اس میں مناسب نامناسب کا ہوش نہیں رہتا۔ یہ یونہی جکڑ لیتی ہے۔ آدمی کو اپنے شکنجے میں۔ بس آپ بابا جان کو راضی کریں کسی طرح۔"

پھپھو سے جلد لاہور آنے کا وعدہ لے کر وہ اٹھے تھے اور گیٹ سے نکلتے نکلتے یک دم احسان شاہ کو پھپھو سے کوئی اہم بات کرنا یاد آگیا تھا اور وہ انہیں گیٹ کے پاس کھڑا ہونے کا کہہ کر واپس اندر چلا گیا تھا اور جب وہ گیٹ کے پاس کھڑے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے تو گیٹ کھول کر مائرہ اندر داخل ہوئی تھی اور وہ بلاوجہ ہی گھبرا گئے تھے۔ لیکن وہ بہت اعتماد سے چلتی ہوئی ان کے قریب آئی تھی۔

"السلام علیکم!"

"کیسی ہیں آپ؟" اس کے سلام کا جواب دے کر انہوں نے پوچھا تھا لیکن ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

"تمہارے خیال میں کیسا ہونا چاہیے مجھے۔" اس نے تیکھے لہجے میں کہا تھا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے انہوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا موی شاہ! تم نے مائرہ حسن کی بات ٹھکرا کر اس کی توہین کی ہے اور مائرہ اپنی توہین نہیں بھولتی۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔" وہ بات مکمل کر کے تیزی سے اندرونی گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"مائرہ پلیز۔ سنیں' ایک منٹ رکیں۔"

وہ اسے بتانا چاہتے تھے کہ انہوں نے اس کی محبت کی توہین نہیں کی۔ بلکہ وہ تو پہلے ہی کسی کی محبت کے اسیر ہو چکے تھے اور جو دل پہلے ہی اسیر ہو چکا ہو اس میں بھلا کسی اور دل کی محبت کیسے سما سکتی ہے۔

وہ رکی نہیں تھی اور تب ہی اندر سے احسان شاہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ اور پورچ کی سیڑھیاں چڑھتی مائرہ کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا اور اس نے آواز دے کر کہا تھا۔

"موی! تم جا کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اور وہ بے حد پریشان سے بیرونی گیٹ کھول کر باہر آئے تھے اور گیٹ کے ساتھ ہی کھڑی احسان شاہ کی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ جو مائرہ کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گئے تھے' ایک بار پھر بے چین ہو گئے تھے۔ یہ لڑکی۔۔۔ پتا نہیں کیا کرے گی ان کے ساتھ۔ عمارہ کے ساتھ۔ ان کے کانوں میں مائرہ کی آواز گونجی۔

"مائرہ حسن اپنی توہین نہیں بھولتی۔"

بے حد مضطرب سا ہو کر انہوں نے سامنے سے آتے احسان شاہ کو دیکھا اور یونہی نظریں اٹھائے اسے قریب آتا دیکھتے رہے۔

"ارے گاڑی کی چابی تمہارے پاس نہیں تھی کیا۔" قریب آکر احسان شاہ نے پوچھا تھا۔

"ہاں' میرے پاس ہی تھی۔" وہ مڑ کر گاڑی کا لاک کھولنے لگے تھے۔

احسان شاہ کی آنکھیں محبوب کے دیدار کی خوشی سے دمک رہی تھیں۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"یار! تم خود ڈرائیو کر لو۔" گاڑی کی چابی احسان شاہ کو دیتے ہوئے وہ چکر کاٹ کر پسنجر سیٹ پر آکر بیٹھ گئے تھے۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا موی؟"

"ہاں۔ بس ہلکا سا سر میں درد ہے اور نیند آرہی ہے۔ میں نے سوچا کہیں سو نہ جاؤں اور۔" وہ زبردستی مسکرائے تھے۔

"اوکے، تم ایزی ہو کے بیٹھ جاؤ اور سو جاؤ کچھ دیر۔"

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے سیٹ کی پشت پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں اور احسان شاہ ڈرائیو کرتے ہوئے ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔

کتنی بار ان کا جی چاہا، وہ احسان شاہ سے سب کہہ دیں۔ وہ سب جو ان کے اور مائرہ کے درمیان تھا اور جسے صرف مردہ پھپھو جانتی تھیں۔ لیکن پھر ان کی ہمت نہ ہوئی۔ احسان شاہ اتنا خوش تھا۔ وہ کیسے ..... کیسے اس کی خوشی چھین لیتے اور پھر پتا نہیں وہ کیا سوچتا ..... وہ اب صرف اس کے دوست نہیں تھے، اس کی بے حد لاڈلی بہن کے شوہر بھی تھے۔

کاش وہ اس وقت احسان شاہ کو سب کچھ بتا دیتے ایک ایک حرف تو شاید آج وہ ان سب سے اور "الریان" سے یوں دور نہ ہوتے۔

ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور انہیں اس وقت "الریان" کی بے تحاشا یاد آئی تھی۔ "الریان" اور اس کے باسی اور ان کی محبت تو ان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتی تھی۔ انہوں نے کروٹ بدلی۔ اب ان کا رخ دیوار کی طرف تھا اور وہ بے آواز رو رہے تھے۔

آنسو ان کی آنکھوں سے نکل نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔



حسن رضا تخت پر دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھے تھے ان کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ وہ کل صبح سے یونہی تخت پر بیٹھے تھے اسی کیفیت میں۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر وہ خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ لیتے تھے اور پھر کبھی گھٹنوں پر سر رکھ لیتے۔ کبھی آنکھیں بہنے لگتیں اور جب آنسو خشک ہو جاتے تو وہ گھٹنوں پر سر رکھ لیتے۔

کل صبح وہ دروازے سے ٹیک لگائے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور دروازے کے باہر احمد رضا بار بار انہیں پکار رہا تھا۔

"ابو..... ابو پلیز۔" وہ دستک دے رہا تھا۔

اور وہ جیسے اس کی آواز نہیں سن رہے تھے۔ ان کا دل تو کٹ کٹ کر گر رہا تھا۔ روتے روتے یکایک انہیں لگا تھا جیسے ان کے ارد گرد آوازیں مر گئی ہوں۔ انہوں نے چونک کر بند دروازے کو دیکھا تھا اور پھر ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بے یقینی سے بند دروازے کو دیکھنے لگے تھے۔

کیا وہ چلا گیا۔ یہ کیا کیا انہوں نے۔ اسے اپنے اکلوتے بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے خوابوں کو اپنی آنکھوں سے نوچ کر پھینک دیا۔ وہ اسے سمجھا بھی تو سکتے تھے۔ توبہ کا در تو ہر لمحہ کھلا ہے، وہ توبہ کر لیتا تو اللہ ضرور اسے معاف کر دیتا۔ وہ تو نادان ہے۔ بچہ ہے۔ جانے کس مرتد کافر نے اسے ورغلا دیا ہے۔ اولاد کی محبت ہر جذبے پر غالب آگئی تھی۔ انہوں نے بے چینی سے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے اور ان کے لبوں سے نکلا تھا، "رضی!"

ان کی نظروں نے پوری گلی کا جائزہ لے ڈالا تھا۔ گلی دور دور تک سنسان پڑی تھی۔

"نہیں ..... وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ اس طرح ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" وہ یونہی دروازہ کھلا چھوڑ کر گلی میں نکل آئے تھے اور پھر تقریباً بھاگتے ہوئے روڈ تک آئے تھے۔ احمد رضا کہیں نہ تھا۔ لمحہ بھر وہ یونہی سڑک کے کنارے کھڑے رہے پھر مایوسی سے سر جھکائے واپس پلٹ آئے اور تھکے تھکے سے آکر تخت پر بیٹھ گئے تھے اور تب سے اب تک وہ یہاں ہی بیٹھے تھے۔ یونہی اسی طرح۔ انہیں یاد نہیں تھا کہ انہوں نے ساری نمازیں پڑھی تھیں یا نہیں۔ صبح سے رات ہو گئی تھی۔ وہ یونہی تخت پر بیٹھے رہے تھے انہوں نے اس کی زندگی کے ایک ایک لمحے کے متعلق سوچ ڈالا تھا..... وہ جب پیدا ہوا تھا۔

اس نے جب پہلی بار انہیں ابو کہہ کر بلایا تھا۔

جب پہلی بار اپنی توتلی زبان میں اس نے بسم اللہ اور کلمہ طیب سنایا۔

"پہلا کلمہ طیب طیب معنی پاک۔"

جب وہ رک رک کر پڑھتا تو ان کا رواں رواں خوشی سے سرشار ہو جاتا تھا۔

جب اس نے انہیں پہلی بار سورۂ کوثر سنائی تھی تو وہ صرف اڑھائی سال کا تھا۔ انہوں نے حیرت اور خوشی سے اسے کتنی بار چوما تھا اور فخر سے اس کی طرف دیکھتی زبیدہ سے پوچھا تھا۔

"یہ... یہ تم نے یاد کروائی ہے اسے؟"

اور پھر جب وہ پہلی بار اس کے ساتھ اسکول گئے تھے... کتنے سارے لمحے تھے جو بہت یادگار اور حیران کن تھے۔ وہ اتنا ذہین تھا۔ اتنا حسین تھا۔ پھر کس چیز نے اسے گمراہ کر دیا۔ کیسے یقین کر لیا اس نے اس کذاب کی باتوں پر... کیونکر اخبار والوں کے سامنے اس کی پارسائی کی گواہی دی۔

وہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر حجت کرتا تھا۔ ہر ایک کی تہہ تک پہنچتا تھا۔ پھر کیسے... کیوں اور اس سوال کا جواب وہ پوری رات ڈھونڈتے رہے تھے لیکن انہیں سوال کا جواب نہیں ملا تھا... یہاں تک کہ مسجد سے صبح کی اذان سنائی دی تھی۔ پتا نہیں کیسے وہ اٹھے تھے کیسے انہوں نے نماز پڑھی تھی اور پھر نماز کے بعد بنا دعا مانگے وہ پھر تخت پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ پوری رات دروازہ کھلا رہا تھا۔ انہوں نے گیٹ کو بند کر کے کنڈی نہیں لگائی تھی۔ صبح شمو دروازہ دھکیل کر اندر آ گئی تھی۔ اس نے صفائی کی تھی۔ ان کے لیے ناشتا بنایا تھا۔ ناشتے کی ٹرے اب بھی تخت پر یونہی پڑی تھی۔ انہوں نے ناشتا نہیں کیا تھا۔ کل سے اب تک سوائے چند گھونٹ پانی کے کچھ بھی ان کے حلق سے نہیں اترا تھا۔ شمو نے صفائی کرتے ڈسٹنگ کرتے کئی بار بہت غور سے انہیں دیکھا تھا اور ان کے قریب آ کر کچھ پوچھا بھی تھا۔ شاید ان کی طبیعت کے متعلق۔ انہوں نے یونہی سر ہلا دیا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کے اندر سے سب کچھ خالی ہو گیا ہو۔ فون کی گھنٹی بھی بجی تھی۔ شمو نے فون اٹھا کر بات کی تھی وہ یونہی اسے دیکھتے رہے تھے۔ امید بھری نظروں سے شاید...

"سمیرا آپی کا فون ہے رحیم یار خان سے' میں نے آپ کی طبیعت کا بتا دیا ہے۔"

انہوں نے آدھی بات سنی تھی۔ "سمیرا کا فون ہے۔" اس کے بعد اس نے کیا کہا تھا۔ انہوں نے نہیں سنا تھا۔ مایوسی نے ان کے دل میں پنجے گاڑ دیے تھے۔ پوری رات گزر گئی تھی۔ اس نے فون نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے کیے پر شرمندہ نہیں تھا۔ نادم نہیں تھا۔ ذرا بھی نہیں۔

پھر شمو چلی گئی تھی۔

"میاں صاحب! دروازہ بند کر لیں اور کنڈی لگا لیں"۔ جاتے جاتے اس نے تاکید کی تھی۔ لیکن وہ یونہی بیٹھے رہے تھے اور اب عصر ہونے والی تھی دھوپ برآمدے سے سمٹ کر صحن میں آ گئی تھی۔

"آہ!" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کون سی چیز اسے وہاں تک لے گئی۔ کاش میں جان پاتا۔ زبیدہ نے تو اس کی تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی... چھوٹی سی عمر میں اسے بہت ساری دعائیں زبانی یاد تھیں۔

وہ اسے رات کو جب سلانے کے لیے لٹاتی تو سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے کچھ نہ کچھ بتاتی۔

خلفائے راشدین کے متعلق بتاتی۔ اسلامی کہانیاں سننے کا اسے کتنا چسکا تھا۔

بچپن میں وہ محمد بن قاسم۔ طارق بن زیاد اور صلاح الدین ایوبی بننے کی خواہش کرتا تھا لیکن اب کیا بن گیا تھا۔ اخبار میں کیا لکھا تھا۔ انہوں نے نظر گھما کر اخبار کا وہ مڑا تڑا ٹکڑا اٹھایا جو ٹرے کے پاس پڑا تھا۔

ٹرے میں صبح کے ناشتے کے سلائس سوکھے پڑے تھے آملیٹ بھی جیسے عجیب سا ہو گیا تھا۔ انہوں نے ٹرے اٹھا کر نیچے رکھ دی اور اخبار کو سیدھا کیا۔

[illegible]

"احمد رضا..." تو محمد بن قاسم بنا تھا نہ طارق بن زیاد۔ وہ تو ایک مرتد شخص کا نمائندہ تھا۔

ایک بار پھر اخبار کو موڑ توڑ کر انہوں نے پھینک دیا اور ایک بار پھر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ انہوں نے اپنے آنسو پونچھنے کے لیے ہاتھ اونچے کیے تو انہیں لگا جیسے آنکھوں کی نیچے جگہ چھل گئی ہو... انہوں نے ہاتھ نیچے کر لیے تب ہی گیٹ پر بیل ہوئی اور پھر ساتھ ہی کسی نے دروازہ دھکیلا... وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئے تھے۔ گیٹ کھلا سمیرا اور زبیدہ اندر داخل ہوئیں۔ زبیدہ نے ہاتھ میں بیگ اٹھا رکھا تھا۔ زبیدہ کے ہاتھ میں بھی بیگ تھا۔ وہ سپاٹ نظروں سے انہیں صحن پار کرتے اور پھر برآمدے کی طرف آتے دیکھتے رہے۔ سمیرا نے برآمدے میں قدم رکھتے ہی بیگ نیچے رکھا اور تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

"ابو... ابو! کیا ہوا ہے۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا... شمو نے بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔"

وہ جیسے کچھ نہیں سن رہے تھے۔ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا احمد کے ابو! آپ بولتے کیوں نہیں۔ رضی کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا۔" زبیدہ نے ان کی سوجی ہوئی آنکھوں اور رستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

وہ جیسے کچھ نہیں سن رہے تھے۔ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

احمد کے نام پر ان کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی تھی۔ شدت گریہ سے سوجی ہوئی آنکھیں بمشکل کھل رہی تھیں۔

"احمد...!" انہوں نے نظریں اٹھا کر زبیدہ کی طرف دیکھا۔ "احمد رضا۔" ان کے لبوں سے پھر نکلا۔

"ہم لٹ گئے زبیدہ... ہماری پونجی چھن گئی۔ ہمارا سرمایہ ہمارا خزانہ مٹی میں مل گیا۔" پھر آنسوؤں نے ان کا حلق بند کر دیا۔

"رضی... رضی! کیا ہوا ہے کہاں ہو تم۔"

سمیرا تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکی اور ابھی اس نے تیسری سیڑھی پر قدم رکھا تھا جب حسن رضا کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"زبیدہ! تمہارا احمد رضا... ہمارا رضی مر گیا۔"

"نہیں..." ایک چیخ کے ساتھ سمیرا وہاں ہی اسی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

"مرتد ہو گیا... وہ کافر ہو گیا زبیدہ۔ نکال دیا میں نے اسے گھر سے۔ چلا گیا وہ۔"

"نہیں... میرا بیٹا ایسا نہیں ہے احمد کے ابا۔"

زبیدہ ان کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گئی تھیں اور اب ان کا ہاتھ پکڑے بار بار ایک ہی بات کی تکرار کیے جا رہی تھیں۔

"ضرور آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے احمد کے ابا۔ وہ کہاں ہے۔ بلائیں اسے میں پوچھتی ہوں خود اس سے۔"

"رضی... رضی! نیچے آؤ۔"

انہوں نے آواز دی اور سیڑھی پر بیٹھی سمیرا کی طرف دیکھا۔ جو وحشت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"شمو! دیکھو جا کر۔ جگا کر لاؤ اسے نیچے۔"

سمیرا اٹھی لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان باقی نہیں رہی ہے۔

"اللہ اکبر۔" مسجد سے عصر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔

حسن رضا تخت سے اٹھے اور جھک کر تخت کے نیچے سے سلیپر نکالے اور پہن کر باتھ روم کی طرف بڑھے۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ پتا نہیں کل سے اب تک کتنی نمازیں چھوٹی ہیں اور جو پڑھی ہیں... وہ بھی پتا نہیں۔ واش روم کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

زبیدہ نے سیڑھیوں کی ریلنگ پر ہاتھ رکھے کھڑی سمیرا کی طرف دیکھا اور تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"تم نے سنا نہیں سمو! اوپر جا کر رضی کو بلا لاؤ۔ گہری نیند سو رہا ہے۔ ہمارے آنے کا اسے پتا ہی نہیں چلا ہو گا۔"

غسل خانے کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے حسن رضا نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"وہ اوپر نہیں ہے زبیدہ۔"

اور تیزی سے دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ لمحہ بھر تک زبیدہ اور سمیرا ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر سمیرا بھاگ کر زبیدہ سے لپٹ گئی۔ "امی ...... امی۔"

اس کی آواز گھٹی ہوئی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"سمو! اپنے ابو سے کہو اسے لے کر آئیں۔ جہاں بھی ہے ...... میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں مر جاؤں گی۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔ میں اس کے لیے اللہ سے توبہ کروں گی۔ گڑگڑا کر۔ رو رو کر۔"

وہ سمیرا کو گلے سے لگائے روتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور واش روم میں بیسن کے سامنے کھڑے حسن رضا ان کا ایک ایک لفظ کو سن رہے تھے۔

"کیا اللہ اسے معاف کر دے گا۔ نعوذباللہ اس نے ایک کذاب کو اللہ کا برگزیدہ بندہ کہا اور اس کا خلیفہ بننا منظور کیا۔" انہوں نے خود سے پوچھا تھا۔

پانی کے چھینٹے منہ پر مارتے ہوئے۔ کلی کرتے ہوئے، مسح کرتے ہوئے وہ زبیدہ کی آہ و زاری سن رہے تھے۔ وضو کر کے وہ باہر نکلے تو زبیدہ نے دوڑ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"آپ کو اللہ کا واسطہ۔ اسے ڈھونڈ کر لائیں۔ وہ نادان ہے۔ کون سا بڑا ہو گیا ہے۔ وہ ...... بچہ ہی تو ہے ترغیب میں آ گیا ہو گا۔ اسے سمجھائیں توبہ کر لے گا تو اللہ اسے معاف کر دے گا۔"

انہوں نے بنا کچھ کہے اثبات میں سر ہلایا اور صحن کی طرف بڑھ گئے۔ صحن میں ایک لمحہ کے لیے وہ ٹھٹک کر رکے تھے۔ کل یہاں اس نے بھاگ کر ان کے ہاتھ سے اپنا بیگ لے لیا تھا۔ وہ کتنا فرماں بردار تھا۔ وہ آج کل کے بچوں کی طرح نہیں تھا۔ اس نے کبھی گستاخی نہیں کی تھی۔ کبھی پلٹ کر انہیں جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ان سے بہت ڈرتا تھا پھر ...... پھر کیوں؟

ایک بڑا سا سوالیہ نشان پھر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور انہیں اس کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ وہ گیٹ کھولتے ہوئے رکے اور پھر مڑ کر سمیرا کی طرف دیکھا جو ابھی تک برآمدے میں زبیدہ کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔

"تمہیں کچھ پتا ہے، یہ اس کا دوست ابراہیم کہاں رہتا ہے۔"

سمیرا نے نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن یہاں ڈائری میں اس کے سب دوستوں کے نمبر ہیں۔"

زبیدہ کا ہاتھ چھوڑ کر وہ فون اسٹینڈ کی طرف لپکی اور ڈائری اٹھا کر جلدی جلدی ورق الٹنے لگی ...... اور ڈائری سے ورق پھاڑ کر اس پر ابراہیم کا نمبر لکھا۔

"کیا وہ ابراہیم کے گھر ہے؟" نمبر حسن رضا کو دیتے ہوئے اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" نمبر والا ورق انہوں نے جیب میں رکھا۔ "نماز پڑھ کر میں ابراہیم کی طرف جاؤں گا۔"

اور پھر سمیرا کی طرف دیکھے بغیر وہ تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گئے۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے چند لوگوں نے ان کی خیریت پوچھی تھی۔ مسجد میں کل سے نظر نہ آنے کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ وہ ہوں ہاں کرتے ہوئے مسجد کے کونے میں آخری صف میں بیٹھ گئے تھے۔

نماز پڑھ کر انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان کے آنسو ان کے اٹھے ہوئے ہاتھوں پر گرنے لگے۔

"یا اللہ! اسے توبہ کا راستہ دکھا۔ اسے واپس لے ...... اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ زبیدہ صحیح کہتی ہے وہ ترغیب میں آ گیا ہو گا۔"

یکدم دعا مانگتے مانگتے وہ سجدے میں گر گئے اور تڑپ تڑپ کر اس کے لیے دعا مانگی اور پھر اٹھے۔

"حسن صاحب! گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ خیریت ہے نا۔" ایک دو افراد نے پوچھا تھا۔

لیکن انہیں یاد نہیں تھا کہ انہوں نے کیا جواب دیا تھا۔ پھر وہ تیزی سے مسجد سے باہر نکل آئے تھے اور ایک پی سی او سے انہوں نے ابراہیم کو فون کر کے اس کا ایڈریس پوچھا تھا۔

"بیٹا! مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔ جو فون پر نہیں کر سکتا۔"

اور پھر کچھ دیر بعد ہی وہ ابراہیم کے سامنے بیٹھے تھے۔

"بیٹا! مجھے بتاؤ، اس شخص اسماعیل کے متعلق۔ تم ہی اسے پہلی بار لے کر وہاں گئے تھے نا۔"

ابراہیم کی نظریں جھک گئیں۔ وہ بے حد شرمندہ تھا۔

"تب میں نہیں جانتا تھا کہ وہ شخص کیا ہے۔ بظاہر وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی باتیں کرتا تھا۔ اسلام کے فروغ کے لیے بے چین دکھائی دیتا تھا۔ میں ابتدا میں متاثر ہوا لیکن پھر جلد ہی مجھے لگا کہ کہیں کچھ غلط ہے۔"

"اسے ...... اس کم بخت کو کیوں نہیں لگا کچھ غلط۔ وہ تو اتنا ذہین ہے ابراہیم! پھر کیوں نہیں جانا اس نے۔" وہ رو دیے۔

ابراہیم کا سر مزید جھک گیا۔

انہوں نے خود ہی اپنے آنسو پونچھے اور ابراہیم سے التجا کی۔

"ابراہیم بیٹا! مجھے لے چلو وہاں جہاں وہ ملعون رہتا ہے۔ ضرور احمد رضا بھی وہاں ہو گا۔"

"کیا وہ گھر پہ نہیں ہے؟" اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ حسن رضا صاحب کیوں اس کے گھر تک چلے آئے ہیں۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ یکدم کھڑا ہو گیا۔ "چلیں۔"

اور کچھ دیر بعد وہ ابراہیم کے ساتھ اسماعیل خان کے ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے۔

مغرب ہوئی پھر عشاء ہوئی۔ حسن رضا واپس نہیں آئے تھے۔ سمیرا بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ زبیدہ مسلسل تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ تخت پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے سمیرا کی طرف دیکھا۔

"سمو! تمہارے ابا اور بھائی آتے ہوں گے۔ تم نے کچھ پکایا ہی نہیں۔ کیا کھائیں گے۔ تمہیں پتا ہے نا رضی بھوک کا کتنا کچا ہے۔" سمیرا نے آنسو بھری نظروں سے زبیدہ کو دیکھا۔

"رضی آ گیا تو باہر سے کھانا لے آئے گا۔"

وہ ان کے پاس ہی بیٹھ کر آس بھری نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"رضی آ جائے گا نا امی؟"

"تمہارے ابو لینے گئے ہیں تو آ جائے گا۔ میرے بچے سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو سو بار رب اسے ضرور معاف کر دے گا سمو!"

وہ پھر تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

"اماں! میرا دل گھبرا رہا ہے ...... ابو کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ اتنی دیر ہو گئی۔ دس بجنے والے ہیں۔"

"ہاں ...... دیر تو ہو گئی ہے۔ تو ایسا کر، ابراہیم کے گھر فون کر ...... ڈائری میں نمبر ہے نا۔ تیرے ابا اسی کے گھر گئے تھے نا۔"

اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے انہوں نے سمیرا سے کہا تو وہ اٹھ کر نمبر ملانے لگی۔ ابھی اس نے دو تین نمبر ہی ڈائل کیے تھے کہ گیٹ پر بیل ہوئی۔

"ابو آ گئے۔" وہ ریسیور پھینک کر صحن کی طرف بھاگی۔

حسن رضا سر جھکائے اندر داخل ہوئے۔ اس نے رضی کو دیکھنے کے لیے باہر جھانکا۔

گلی خالی تھی۔ حسن رضا اکیلے تھے۔ گیٹ بند کر کے وہ مڑی۔ حسن رضا سر جھکائے تھکے تھکے سے برآمدے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ زبیدہ نے انہیں تنہا آتے دیکھا تو اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئیں۔

"نہیں ملا۔"

وہ خاموشی سے تخت کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئے

..... لائٹ کی روشنی میں سمیرا کو ان کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ ستا ہوا اور پیلا پیلا لگ رہا تھا۔

"وہ کسی دوست کے گھر میں ہے اور نہ ہی۔"

انہوں نے سر نہیں اٹھایا تھا اور تفصیل بتا رہے تھے۔ ابراہیم کے ساتھ وہ اس کے ٹھکانے پر گئے تھے وہاں تالا لگا تھا۔ چوکیدار نے بتایا تھا کہ حضرت صاحب تو امریکا چلے گئے ہیں تین ماہ کے لیے۔"

"اور..... اور وہ احمد رضا وہ کہاں ہے؟" انہوں نے بے اختیار پوچھا تھا۔

"کون احمد رضا؟" چوکیدار اسے نہیں جانتا تھا۔

"وہ تمہارے حضرت صاحب کا خلیفہ دوم۔" خلیفہ کہتے ہوئے ان کے لب کانپے تھے۔

چوکیدار لحہ بھر انہیں تذبذب سے دیکھتا رہا۔

"احمد رضا کو میں نہیں جانتا لیکن وہ ادھر..... وہ جی گارڈن ٹاؤن میں طیب خان رہتا ہے' وہ حضرت جی کا قریبی ساتھی ہے۔"

اور پھر طیب خان کا ایڈریس لے کر وہ گارڈن ٹاؤن پہنچے تھے۔

سرخ و سپید رنگت والے طیب خان نے بے حد غور سے انہیں دیکھا تھا۔

"میں آپ حضرت کو نہیں جانتا۔"

حسن رضا نے اس شخص کو دیکھا سر پر پگڑی اور گھیردار شلوار پر افغانی جیکٹ پہنے بڑی سی داڑھی والا یہ شخص جو دیکھنے میں عجیب سا لگتا تھا۔ بہت روانی سے اردو بول رہا تھا جب کہ چوکیدار نے انہیں بتایا تھا کہ وہ افغانی ہے۔

"میں ابراہیم ہوں۔ حضرت صاحب کی مجالس میں شرکت کرتا رہا ہوں۔" یکدم اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی تھی۔

"یہاں..... میرا پتا کس نے دیا تمہیں؟"

"ایکچوئلی ہمیں احمد رضا کی تلاش تھی۔ وہ حضرت صاحب کا مرید ہے۔ یہ احمد رضا کے والد ہیں۔ دو تین دن سے وہ گھر نہیں آیا تو سب پریشان ہو رہے ہیں۔"

"اوہ.....!" اس نے ہونٹ سکیڑے۔ "لیکن میں تو کسی احمد رضا کو نہیں جانتا۔"

"سر! وہ ہمیں پتا چلا تھا کہ آپ حضرت صاحب کے خاص بندے ہیں۔ آپ کو کچھ پتا ہو' ان کے ٹھکانے کا تو پلیز راہنمائی کر دیجیے۔ احمد رضا ضرور ان کے ساتھ ہو گا۔"

"میں تو صرف ایک بار ان سے ملا ہوں جناب اور مجھے ان کے کسی ٹھکانے کا علم نہیں ہے۔"

اس نے گویا بات ختم کر کے انہیں جانے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ مایوس سے ہو کر اس کے گھر سے نکلے تھے انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ ان کے باہر نکلتے ہی تیزی سے کوئی نمبر ملا رہا تھا۔

پھر ابراہیم کے ساتھ وہ تقریباً" اس کے ہر دوست کے گھر گئے تھے کسی کو اس کے متعلق علم نہیں تھا۔ وہ کسی کے گھر نہیں گیا تھا۔ تو اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ اسماعیل خان کے ساتھ تھا۔

شاید ان سے غلطی ہو گئی تھی۔ وہ جذبات میں آ گئے تھے۔ انہیں پہلے اسے سمجھانا چاہیے تھا۔ اتمام حجت تو ضروری ہے۔ ہاں وہ پھر بھی نہ مانتا تو..... لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

وہ سر جھکائے بیٹھے تھے اور زبیدہ رو رہی تھیں۔

"زبیدہ! اللہ سے دعا کرو..... وہ ہی اسے سیدھا راستہ دکھا سکتا ہے۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی سمیرا نے انہیں دیکھا۔ دو ہی دنوں میں وہ کتنے بوڑھے اور کمزور لگنے لگے تھے۔ اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔

"جاؤ سو جاؤ بیٹا جا کر۔ صبح یونیورسٹی جاؤں گا۔ وہ یونیورسٹی تو ضرور جاتا ہو گا۔ پڑھائی کا حرج تو نہیں کر سکتا وہ۔"

"ہاں.....!" سمیرا کے دل میں ایک امید جاگ اٹھی۔

"ہاں۔ وہ جہاں کہیں بھی ہو گا۔ یونیورسٹی تو جاتا ہو

گا۔" اس نے زبیدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"امی! اٹھ جائیں۔ سفر کرکے آئی ہیں۔ کچھ دیر اندر جا کر لیٹ جائیں۔ میں روٹیاں پکالی ہوں۔ ساتھ میں آملیٹ بنالیتی ہوں۔"
"مجھے تو بھوک نہیں ہے سمو! اپنے ابا کے لیے بنالے کچھ۔" وہ اٹھیں اور پھر بیٹھ گئیں۔
"پتا نہیں کہاں ہوگا وہ۔ اس نے کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں۔ اسے تو اپنے کمرے بنا نیند ہی نہیں آتی سمو!"

دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر وہ پھر رونے لگی تھیں۔ سمیرا ان کے پاس ہی بیٹھ کر بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔
صبح سمیرا بہت جلدی جاگی تھی لیکن حسن رضا اس سے پہلے ہی جاگ کر برآمدے میں تخت پر بیٹھے تھے

مدھم روشنی میں اس نے دیکھا' ان کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ تخت کے پاس ہی زمین پر جانماز بچھی تھی۔ شاید وہ تہجد پڑھ کر اٹھے تھے۔
"فجر کی اذان ہوگئی ابو۔"
ان کے قریب آکر اس نے آہستگی سے پوچھا۔ تو انہوں نے نفی میں سر ہلادیا۔
وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"ابو کیا رضی نے خود بتایا تھا آپ کو کہ وہ......"
"اس نے اعتراف کیا تھا۔" انہوں نے ایک نظر سمیرا کو دیکھا۔
"ابھی اذان ہونے والی ہے۔ نماز پڑھ کر مجھے ایک کپ چائے بنا دینا۔ میں چائے پی کر یونیورسٹی کے لیے نکلوں گا۔"
"اتنی جلدی ابو!"
"ہاں جلدی جاؤں گا...... دیر سویر ہو جاتی ہے راستے میں۔ کہیں وہ آکر چلا ہی نہ جائے اور ہاں اپنی اماں کو مت جگانا۔ کچھ دیر پہلے ہی سوئی ہے۔"
وہ افسردگی سے انہیں دیکھتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔
اور پھر وہ چھ بجے سے پہلے ہی گھر سے نکل گئے تھے لیکن بے سود...... وہ یونیورسٹی نہیں آرہا تھا پچھلے کئی دنوں سے اور انہیں یاد آیا یہ بات تو رات انہیں ابراہیم حسن اور دوسرے دوستوں نے بھی بتائی تھی' پھر وہ یہاں کس آس میں چلے آئے تھے اور اگلے کئی دن لگاتار وہ یونیورسٹی آتے رہے۔ لیکن احمد رضا انہیں نہیں ملا تھا۔
"غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ میرے بیٹے سے بھی غلطی ہوگئی ہے۔ اللہ اسے معاف کرے گا۔"
زبیدہ دن میں کئی بار کہتیں تو وہ نظریں چرا لیتے انہیں لگتا جیسے زبیدہ ان سے کہہ رہی ہیں۔
وہ آفس سے آتے تو بیٹھتے بیٹھتے اٹھ کھڑے ہوتے اور پھر اس کی تلاش میں چل پڑتے۔ بیٹے کی محبت ہر جذبے پر غالب آچکی تھی۔ دل نے اس بات پر یقین کر لیا تھا کہ وہ بھٹک گیا تھا لیکن وہ سمجھائیں گے تو سمجھ جائے گا۔
اس روز بڑے دنوں بعد اخبار میں خبر آئی تھی۔
"اسماعیل خان ملک سے فرار ہو گیا ہے یا انڈر گراؤنڈ ہو گیا ہے۔"
تو کیا وہ اپنے ساتھ احمد رضا کو بھی لے گیا ہے۔ ان کا دل ڈوب گیا۔ وہ ناشتا کیے بنا ہی اٹھ گئے۔ زبیدہ کمرے میں چپ چاپ لیٹی رہتیں۔ ان کی نظریں سوال کرتی تھیں لیکن اب وہ زبان سے کچھ نہ کہتی تھیں۔
پورے گھر میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ کوئی برتن بھی کھڑکتا تو سب چونک جاتے تھے۔
"ابو ناشتا کرلیں۔" سمیرا نے انہیں اٹھتے دیکھ کر کہا۔
وہ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔
"ابو......!" اس نے ذرا سر آگے کرکے کمرے میں جھانکا۔ زبیدہ بیگم یونہی بیڈ پر لیٹی تھیں اور آنکھوں کے کناروں سے آنسو نکل نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔
"ابو......!" اس کی آواز آہستہ تھی۔
"کل جب میں اسٹاپ پر کھڑی تھی تو مجھے لگا تھا جیسے۔"
"جیسے کیا؟" وہ یکدم اس کی طرف مڑے تھے۔
"وہ ایک بہت بڑی شان دار گاڑی تھی جسے ایک لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی اور اس کی پسنجر سیٹ پر بیٹھا شخص مجھے رضی لگا تھا۔ بس ایک جھلک ہی دیکھ پائی تھی میں...... اور گاڑی نکل گئی۔"
حسن رضا نے ایک گہری سانس لی تھی۔ "تمہیں یقین ہے' وہ رضی تھا؟"
اور اب کے وہ انکار نہ کر سکی۔
وہ رضی ہی تھا۔ اس کی نظریں اس سے ملی تھیں۔ گاڑی اسٹاپ پر ذرا سا آہستہ ہوئی تھی۔ وہ اسی طرف کھڑی تھی۔ رضی نے کھڑکی سے باہر دیکھا تھا اور پھر نظر ملنے پر اس نے ہاتھ اٹھایا تھا۔ اسے رضی کے لب ہلتے دکھائی دیے تھے۔ شاید رضی نے اسے پکارا تھا کیونکہ شیشہ بہت تیزی سے نیچے ہوا تھا لیکن گاڑی زن سے گزر گئی تھی اور وہ حیران سی اسٹاپ پر کھڑی رہ گئی تھی۔
"رضی یہیں ہے لاہور میں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے پھر کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔
وہ سوال جو کتنی ہی بار انہوں نے خود سے کیا تھا' اس کا جواب انہیں مل گیا تھا۔
دولت کی طمع اور ہوس۔
لیکن یہ دولت کی ہوس کب اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ انہیں پتا ہی نہ چلا۔ کب اس طلب نے اس کے اندر سر اٹھایا۔ کون سی خواہش تھی جو وہ پوری نہ کر سکے تھے۔ سب کچھ میسر تھا اسے پھر۔
"سب کچھ؟" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے۔
اس سب کچھ میں وہ سب کچھ تو نہیں تھا جس کی چاہ میں وہ گمراہ ہو گیا تھا اور وہ سمجھ رہے تھے دین کی طلب میں دھوکا کھا بیٹھا ہے اور...... تو کیا صرف دولت؟
"اسے دولت اور شہرت کی بہت خواہش تھی ابو!" سمیرا سر جھکائے انہیں بتا رہی تھی اور ان کے اندر مایوسی گہری ہوتی جارہی تھی۔ پھر بھی اس روز وہ آفس سے اٹھ کر اسی تھانے جا پہنچے تھے۔ اس ایس ایچ او نے انہیں پہچان لیا تھا۔ جس نے اس رات پوچھ گچھ کی تھی۔
"ارے صاحب آپ یہاں کیسے؟"
"یونہی ادھر سے گزر رہا تھا سوچا ایک خبر کی تصدیق کرلوں۔ اخبار میں آیا تھا وہ ملعون فرار ہو گیا ہے ملک سے۔"
"ہاں شاید۔" وہ بھی کچھ زیادہ باخبر نہ تھا۔
وہ مایوس سے گھر آگئے تھے۔ سمیرا کالج سے آچکی تھی اور زبیدہ یونہی چپ بیٹھی تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں۔ ان کا دل چاہا وہ ان سے کہہ دیں کہ وہ اس کی واپسی کی آس نہ رکھے۔ اسے دولت کے سانپ نے ڈس لیا ہے۔
وہ شہرت حاصل کرنے کی تمنا میں دلدل میں گر گیا ہے۔ لیکن انہوں نے زبیدہ سے کچھ نہیں کہا۔
کئی دن گزر گئے۔ وہ اس دوران کئی بار ابراہیم کی طرف گئے۔ کئی بار محسن کو فون کرکے پوچھا۔ کئی بار یونیورسٹی گئے لیکن وہ نہ جانے کہاں تھا۔ پاس سے گزرنے والی ہر سیاہ رنگ کی گاڑی کو وہ غور سے دیکھتے تھے۔ وہ یہیں اسی شہر کے ایک گھر میں الوینا کے ساتھ رہ رہا تھا۔ کتنی بار اس نے الوینا سے کہا تھا اسے گھر جانا ہے۔
"میری امی اور سمیرا میری بہن بہت پریشان ہوں گی رحیم یار خان سے آکر جب امی نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا اور ابو نے انہیں بتایا ہوگا کہ میں...... پلیز الوینا! مجھے گھر جانے دو۔ مجھے ان کی غلط فہمی دور کرنے دو۔"
"تمہیں تمہارے باپ نے گھر سے نکال دیا ہے احمد رضا!"
"وہ غصے میں تھے...... وہ ایک سچے مسلمان ہیں۔ الوینا...... وہ برداشت نہیں کر سکے۔ جب میں وضاحت کردوں گا تو...... اور اب تک ان کا غصہ اتر چکا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ چلے جانا مگر ابھی حضرت صاحب کا حکم نہیں ہے۔"

"کیوں۔۔۔ کیوں حکم نہیں ہے؟"

اس نے جب سے اسٹاپ پر سمیرا کو دیکھا تھا' وہ بہت بے چین تھا۔ اس نے سمیرا کے لیے بہت سی شاپنگ کر رکھی تھی۔ اس کی پسندیدہ کتابیں۔ پرفیومز اور ایک بہت خوب صورت گھڑی اور پھر اس کی اپنی پڑھائی کا بھی حرج ہو رہا تھا۔

"الوینا! مجھے حضرت جی سے ملوادو۔"

"فی الحال انہوں نے پردہ کر لیا ہے۔ جب پردے سے باہر آنے کا حکم ہوا تو سب سے پہلے تمہاری ملاقات ہوگی۔ کیا تم بور ہو رہے ہو احمد رضا؟"

"بور!"

وہ بور تو نہیں ہو رہا تھا اس کے دل بہلانے کا بہت سامان تھا یہاں۔ الوینا کی قربت تھی۔ اس کی ادائیں تھیں۔

لارا تھی جو الوینا کی عدم موجودگی میں پوری جان سے اس پر فدا ہوتی تھی اور ماریا تھی جس کی خوب صورت گفتگو کے سحر میں وہ گھنٹوں مسحور بیٹھا اسے سنتا رہتا تھا۔

سب سے بڑھ کر شراب طہور تھی' جو پی کر وہ سرور میں آجاتا تھا لیکن اس سب کے باوجود وہ ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا گھر تھا۔ ماں باپ تھے۔ بہن تھی۔ وہ بھلا انہیں چھوڑ سکتا تھا۔

"اور کیا تم ہمیں چھوڑ دو گے؟"

الوینا اس کے کندھے پر سر رکھے بیٹھی تھی۔

"امپاسبل۔۔۔ میں بھلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں تمہیں۔"

"تو پھر بار بار کیوں گھر جانے کی بات کرتے ہو۔"

"اس لیے کہ وہ میرا گھر ہے۔" اس نے حیرت سے الوینا کو دیکھا۔ جو اس کے کندھے پر سر رکھے مخمور نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جب رچی اچانک ہی کمرے میں آگیا تھا۔ ہڑبڑا کر اس نے الوینا کا سر اپنے کندھے سے ہٹایا تھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ الوینا اس طرح بے جھجک بیٹھی مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیسے ہو فرینڈ۔"

رچی بیڈ کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ یہ الوینا کا کمرا تھا۔

"فائن اور آپ۔"

"می۔ آئی ایم آلسو۔"

"تمہارا پاسپورٹ بنوانا ہے احمد رضا! اپنا شناختی کارڈ الوینا کو دے دینا۔"

"کس لیے؟" وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"حضرت صاحب ملک سے باہر جا رہے ہیں اور جو جو مریدان خاص ان کے ساتھ جا رہے ہیں۔ ان میں تم بھی شامل ہو۔"

"نہیں۔۔۔ میں نہیں جاسکتا۔"

رچی کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"اوکے میں چلتا ہوں۔"

اور اس کے باہر نکلتے ہی وہ بے چینی سے الوینا کی طرف مڑا تھا۔

"وینا پلیز! کسی طرح میری ملاقات حضرت جی سے کروادو۔ میں خود ان سے بات کرتا ہوں۔ بلکہ میں نے ان سے بات کی تھی انہوں نے کہا تھا ٹھیک ہے تم اپنی پڑھائی مکمل کرو۔ پھر کسی ٹور میں تم چلنا ہمارے ساتھ۔"

الوینا خاموشی سے لحہ بھر اسے دیکھتی رہی۔

"سوری احمد! یہ ممکن نہیں ہے۔ اللہ کا حکم نہیں ہے۔ حکم ہو گا تب ہی وہ پردے سے نکلیں گے۔"

"لیکن اللہ کا حکم کیسے ملتا ہے انہیں۔ کیا ان کے پاس جبرائیل علیہ السلام آتے ہیں۔" اس کے لہجے میں تلخی آگئی تھی۔ "ابو صحیح کہہ رہے تھے میں کسی شیطانی چکر میں پھنس گیا ہوں۔"

اس نے سوچا اور یکدم کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔"

"تم نہیں جاسکتے۔۔۔"

کل صبح تم چلے جانا۔"

"آج کیوں نہیں؟" اس نے سوالیہ نظروں سے الوینا کو دیکھا۔

"اگر میں کہوں میرے لیے۔" فدا ہوتی نظروں سے اسے دیکھتی وہ اس کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ تھام لیا اور بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھو اور ریلیکس ہو جاؤ۔ پلیز ایک دن سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کل چلے جانا۔"

"پتا نہیں کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے الوینا!" اس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ "مجھے جانے دو پلیز۔"

"ٹھیک ہے۔ میں رچی سے بات کرتی ہوں۔ ورنہ میں نے تو سوچا تھا آج جی بھر کے باتیں کریں گے۔ پھر تو میں حضرت جی کے ساتھ باہر چلی جاؤں گی اور جانے کب ملاقات ہو پھر۔"

"کیا تم۔۔۔ تم بھی جا رہی ہو۔" احمد رضا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں مجھے تو جانا ہی ہے۔ تم بھی چلتے تو۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"میں تم سے بہت محبت کرنے لگی ہوں۔ مجھے تمہارے بغیر جانا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی احمد!"

اس نے آنکھیں موندتے ہوئے سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ احمد رضا کو لگا تھا جیسے اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور اس نے اس نمی کو چھپانے کے لیے آنکھیں موندی ہیں۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ایک بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"میں کب تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں الوینا! لیکن مجبوری ہے میں اس طرح اپنی تعلیم ادھوری نہیں چھوڑ سکتا۔ امی ابو کو بہت دکھ ہو گا۔ اب تک ابو کا غصہ ختم ہو چکا ہو گا۔ میں جلد از جلد ان کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم آج۔۔۔"

"ٹھیک ہے وینا! میں آج نہیں جاؤں گا۔ آج ہم دونوں سارا دن باتیں کریں گے۔ تم مجھے اپنے متعلق بتانا۔۔۔ ابھی تک تم نے مجھے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا۔"

الوینا نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرا کر سر پھر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس کے ریشمی بال اس کے کندھوں پر بکھر کر اس کے مشام جاں کو معطر کرنے لگے۔

"وینا۔۔۔" اس کے نرم' ملائم' ریشمی بالوں کو اپنے ہاتھوں پر لپیٹتے ہوئے اس نے جذبات سے بوجھل آواز میں سرگوشی کی۔

"میں کب تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں تم مت جاؤ۔ کیا تم میری خاطر رک نہیں سکتیں؟"

"میں بات کروں گی رچی سے۔" اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"رچی کون ہے الوینا؟" وہ یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ کئی دنوں سے یہ سوال اسے الجھا رہا تھا۔ "میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ تم نے اور لارا نے کہا تھا۔ وہ اسلام سے متاثر ہے اور اسلام میں داخل ہونے سے پہلے اس کے متعلق جاننا چاہتا ہے اچھی طرح۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ یہاں اسے بہت اہمیت حاصل ہے۔ کیا وہ مسلمان ہو گیا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ ہاں!" وہ سٹپٹائی۔ "اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔"

"لیکن یہاں سب اب بھی اسے رچی یا اونیل کہتے ہیں۔" وہ الجھا ہوا تھا۔

"ہاں ابھی باضابطہ طور پر اس کا اعلان نہیں کیا گیا۔ حضرت جی پردے سے باہر آئیں گے تو وہ اس کا اعلان کر کے نام تبدیل کریں گے۔"

"اور اس کے تینوں ساتھی؟ وہ بھی اسلام قبول کریں گے؟"

الوینا نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ پتا نہیں آج وہ اتنے سوالات کیوں کر رہا تھا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

"کچھ پیو گے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ لہراتی ہوئی سی باہر نکل گئی اور کچھ ہی دیر بعد نازک سی صراحی میں سنہری مشروب لے کر یونہی لہراتی ہوئی اندر آئی۔ مشروب میں نقرئی ذرے تیر رہے تھے۔

"یہ خالص صندل اور چاندی کے اوراق سے تیار کیا گیا ہے اور اس میں شراب طہور کی آمیزش بھی ہے۔"

اس نے اپنے نازک ہاتھوں سے جام اس کی طرف بڑھایا تو احمد رضا پر بن پیے ہی خمار طاری ہونے لگا تھا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے جام منہ سے لگا لیا۔ پھر نہ جانے اس نے کتنے جام پیے تھے۔ نہ جانے اس سادہ سے صندل کے مشروب میں کیا تھا کہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں اور پھر اسے پتا بھی نہ چلا کہ وہ کب الوینا کا ہاتھ تھامے تھامے سو گیا۔

جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں نیلی روشنی کا بلب جل رہا تھا.... یہ مدہم مدہم روشنی ٹھنڈک اور خنکی کا احساس دے رہی تھی۔ اے سی بند تھا لیکن کمرے میں خنکی موجود تھی۔ جیسے ابھی ابھی کسی نے اے سی بند کیا ہو۔ اس نے مندی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا الوینا کہیں نہیں تھی۔ لیکن اس کے وجود کی خوشبو پورے کمرے میں رچی تھی اور اسے اپنے بازووں پر اب بھی اس کا لمس ـــــ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر پھر آنکھیں بند کرلیں تب ہی کوئی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ یوں جیسے آس پاس ہی کہیں اس کے جاگنے کا منتظر تھا۔

"الوینا...." اس نے آہٹ پر آنکھیں بند کیے کیے آہستگی سے کہا۔ "کہاں چلی گئی تھیں تم۔"

"میں لارا ہوں آپ پلیز اٹھ جائیں اور فریش ہو کر باہر آجائیں۔"

اس نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں۔ لارا بات مکمل کر کے واپس جا رہی تھی۔ اس نے پشت پر بکھرے اس کے سنہری بالوں کو دیکھا اور پھر وال کلاک کی طرف جہاں ساڑھے چار بج رہے تھے۔

"لارا!" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں یہ دن کے چار بجے تھے یا صبح کے۔ کمرے میں مدھم روشنی کے بلب کی وجہ سے وہ کچھ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔

لارا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

وہ بے حد سنجیدہ لگ رہی تھی لیکن اس سنجیدگی میں بھی اس کا حسن دل گرماتا تھا۔

"یہ کون سا وقت ہے؟" وہ کچھ جھجکا۔ "میں بے وقت سو گیا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک سویا شاید رات بھر۔"

"نہیں آپ صرف چند گھنٹے سوئے ہیں۔ باہر دن ہے۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔"

"باہر کون ہے؟"

"کچھ لوگ۔" لارا تیزی سے باہر نکل گئی۔

"کچھ لوگ کون..... شاید کوئی اجنبی شاید میرے لیے اجنبی۔"

وہ کسل مندی سے اٹھا اور واش روم میں جا کر پانی کے چھینٹے منہ پر مارے اور بالوں میں گیلے ہاتھ پھیرتا باہر نکل آیا۔ باہر والے کمرے میں طیب خان اور رباب حیدر بیٹھے تھے۔

طیب خان اپنے مخصوص لباس میں تھا۔ سر پر پکول اور افغانی جیکٹ۔ اس نے بلند آواز میں انہیں سلام کیا اور متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

رباب حیدر کھڑا ہو گیا۔

"تم تیار ہو احمد رضا!"

"کیا مجھے کہیں جانا ہے؟"

اس نے اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ وہ اس وقت شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔

"ہاں۔"

"کہاں؟"

"پتا چل جائے گا۔ تم اگر لباس چینج کرنا چاہو تو کرلو۔"

"کیا کسی خاص جگہ جانا ہے؟"

"کچھ ایسی خاص بھی نہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔"

اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے اور ابھی بھی

ہلکا خمار سا محسوس ہو رہا تھا۔

"چلیں پھر۔۔۔" طیب خان بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بیرونی گیٹ تک آئے تھے۔ گیٹ کے پاس رک کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ الوینا آس پاس کہیں نہیں تھی۔ آج کا دن اور رات اسے الوینا کے ساتھ گزارنا تھا۔ اسے پھر چلے جانا تھا اور پتا نہیں پھر کب واپس آنا تھا۔

"کیا میرا جانا ضروری ہے؟"

رباب حیدر نے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ لیکن گھنٹے تک واپس آجائیں گے۔"

قدرے مطمئن ہو کر وہ ان کے ساتھ گیٹ سے باہر نکل آیا۔ باہر وہی سیاہ گاڑی کھڑی تھی۔ طیب خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ رباب حیدر اور وہ پیچھے بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اس کا ذہن ابھی تک خمار آلود سا ہو رہا تھا۔ کچھ دیر مزید سو جانے کی خواہش کو وہ بمشکل ذہن و دل سے جھٹک پایا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بلڈنگ کے دفتر نما کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ کافی بڑا ہال تھا جس میں چاروں طرف کرسیاں دیواروں کے ساتھ لگی تھیں جن پر کچھ افراد بیٹھے تھے جن کے ہاتھوں میں قلم اور ڈائریاں تھیں۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" ایک طرف بیٹھتے ہوئے اس نے طیب خان سے پوچھا تھا۔

"یہ صحافی ہیں۔ رباب نے حضرت صاحب کے حکم پر پریس کانفرنس بلائی ہے۔"

وہ سر ہلا کر ان صحافیوں کی طرف دیکھنے لگا جو کاغذ قلم ہاتھ میں لیے منتظر نظروں سے ان تینوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چند افراد اور آگئے تھے۔ یوں ان کی تعداد پندرہ کے قریب ہو گئی تھی۔ تب رباب حیدر اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر کچھ کہنے لگا تھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا اس کا ذہن سویا سویا سا تھا۔ ایک دو بار اس نے سر جھٹک کر اس کی بات سننے کی کوشش کی تھی۔

"حضرت صاحب ایک نیک نیت انسان ہیں۔" رباب حیدر کہہ رہا تھا "ان کے دل میں مسلمانوں کا درد ہے۔"

"آپ کے حضرت صاحب آج خود کیوں اس کانفرنس میں نہیں آئے؟" ایک صاحب پوچھ رہے تھے۔ "ہمیں ان سے سوال کرنے ہیں۔"

"آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے ہم سے پوچھ لیں۔ حضرت صاحب یہاں نہیں ہیں۔"

"مطلب ملک میں نہیں ہیں؟" ایک صحافی نے پوچھا۔

رباب حیدر نے اثبات میں سر ہلایا اور طیب خان کا تعارف کروانے لگا۔

"یہ طیب خان ہیں۔۔۔ مجاہد آزادی۔ انہوں نے افغان جنگ میں حصہ لیا اور اب حضرت صاحب کے پاس چلے آئے ہیں۔"

صحافی اس سے مختلف سوالات کر رہے تھے اور اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

"اور یہ احمد رضا ہیں حضرت صاحب کے مقرب۔ بہت قریبی۔ آپ کو بتائیں گے حضرت صاحب کے متعلق۔"

اب صحافی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیل خان اللہ کا برگزیدہ ہے؟" ایک صحافی نے پوچھا۔

"ہاں!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ بہت نیک بزرگ ہیں۔"

"لیکن ہم نے تو سنا ہے کہ وہ شخص ہمیشہ عورتوں میں گھرا رہتا ہے اور اس میں چاروں شرعی عیب ہیں اور اس کی ان نام نہاد مذہبی مجالس میں شراب و شباب کا سامان ہوتا ہے؟" صحافی کے لہجے میں تلخی تھی۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا "ایسا نہیں ہے۔ یہ پروپیگنڈہ ہے ان کے خلاف۔۔۔"

اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ نیند یکدم اس پر حاوی ہونے لگی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر نیند کو بھگانے کی کوشش کی۔

"اللہ نے انہیں اپنا پیام دے کر بھیجا ہے۔" (نعوذ باللہ۔)

طیب خان نے سرگوشی کے سے انداز میں اس کے کندھے پر جھکتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ اللہ کا پیام لائے ہیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" صحافی نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔

"کیا آپ نہیں جانتے کہ نبوت ہمارے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم پر ختم ہو گئی۔۔۔ وہ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ حجتہ الوداع کے موقع پر انہوں نے فرمایا تھا آج دین مکمل ہو گیا۔"

ہاں یہ تو ہے۔۔۔ یہ صحافی صحیح کہہ رہا تھا۔ خود اس نے اپنی اسلامیات کی کتاب میں بہت چھوٹی کلاس میں پڑھا تھا لیکن اگر نہ بھی پڑھا ہوتا تب بھی وہ جانتا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اللہ کے آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اور یہ بات تو اس کے خون میں شامل تھی۔ گھٹی میں پڑی تھی۔۔۔ کسی بھی مسلمان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس نے بے بسی سے رباب حیدر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں وہ کہنا چاہتا تھا۔ بے شک ایسا ہی ہے اور نبوت کا سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم پر ختم کر دیا گیا لیکن اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

رباب حیدر نے ہولے سے اس کا کندھا دبایا۔ وہ مڑ کر اس سے پوچھنے لگا تھا اور وہ شعوری کوشش سے آنکھیں کھولے اسے اور صحافیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک سوال و جواب ہوتے رہے تھے۔ پھر ہائی ٹی کے بعد صحافی رخصت ہو گئے تو وہ بھی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی اب بھی طیب خاں ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ دونوں پیچھے بیٹھے تھے۔ اب بھی اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں اور پھر اس وقت ہی کھولی تھیں جب رباب حیدر نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"احمد رضا منزل آگئی۔"

"اچھا۔۔۔!" اس کا ذہن پتا نہیں کیوں اتنا سویا سویا سا تھا۔ کل رات تو اس نے بھرپور نیند لی تھی پھر دن میں بھی دو تین گھنٹے سویا تھا۔

وہ اپنی اس کیفیت کے متعلق زیادہ نہیں سوچ سکا تھا۔ رباب حیدر نے اسے الوینا کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔

"لو بھئی سنبھالو اپنے مریض کو۔"

اس نے پوری آنکھیں کھول کر الوینا کی طرف دیکھا۔ آج تو وہ اسے ہر دن سے زیادہ خوب صورت لگی تھی۔ اس کی تیاری اور اس کا سنگھار غضب کا تھا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ الوینا نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ اس کے ہاتھوں کی نرماہٹ اور حرارت کو شدت سے محسوس کرتا ہولے ہولے اس کے ساتھ چلتا ہوا اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اتنے دنوں سے وہ اس کے ساتھ اسی کے کمرے میں مقیم تھا۔ آج ہر دن سے زیادہ اس پر مہربان تھی۔ وہ اس سے باتیں کرتا اپنی محبتوں کا اظہار کرتا جانے کب سو گیا تھا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ بالکل فریش تھا۔ کل کا بوجھل پن اور کسل مندی غائب ہو چکی تھی۔ وہ باتھ لے کر اور کپڑے بدل کر باہر آیا تو سٹنگ میں ٹیبل پر اخبار دیکھ کر وہیں بیٹھ گیا۔

آج وہ ضرور گھر چلا جائے گا اور ابو کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لے گا۔ امی اور سمیرا ضرور اس کی سفارش کریں گی۔ وہ سمیرا کو الوینا کے متعلق بھی بتائے گا اور جب الوینا باہر سے آئے گی تو وہ سمیرا کو اس سے ملوائے گا۔ سمیرا ضرور اس کی پسند کو سراہے گی اور وہ الوینا سے کہے گا کہ وہ اس کا انتظار کرے۔ وہ اپنی تعلیم ختم کرتے ہی اسے اپنی زندگی میں شامل کر لے گا۔

اتنے سارے دنوں سے وہ یہاں تھا۔ شب و روز الوینا کی سنگت میں یوں گزر رہے تھے کہ اسے دنوں کی گنتی کا شمار ہی نہیں تھا۔ "جانے کتنے دن گزر گئے۔ پڑھائی کا کتنا حرج ہوا تھا اور سمیرا اور امی کتنی پریشان ہوں گی۔ سمیرا تو چھپ چھپ کر روتی ہو گی اس نے ضرور میرے

سب دوستوں کو فون کیے ہوں گے۔ خیر! آج میں چلا جاؤں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالی اور چونک گیا۔

"نہیں..... نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے دوبارہ خبر پر نظر دوڑائی۔

"جھوٹے نبی کے کارندوں کی پریس کانفرنس میں اس کے ایک خلیفہ احمد رضا کا بیان..... اسماعیل خان اللہ کا سچا پیامبر اور....."

"نہیں۔" اس نے اخبار یکدم پھینک دیا۔

"نہیں..... میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔"

"میں جانتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نبی آخر الزماں ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔" اس نے سوچا۔ "نہیں یہ جھوٹ ہے۔ میں نے ایسی کوئی گواہی نہیں دی اور میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔"

وہ یکدم کھڑا ہو گیا تھا اور اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ اس کی آواز قدرے بلند تھی۔ "میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" اس نے دہرایا۔

"تم نے ایسا ہی کہا تھا احمد رضا!" دروازے میں رچی کھڑا تھا۔ اس کے لبوں پر بڑی زہریلی سی مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھیں کسی سانپ سے مشابہ تھیں۔ احمد رضا کو خوف محسوس ہوا اور اس نے کمزور آواز میں کہا۔

"میں..... میں بھلا ایسے کیسے کہہ سکتا ہوں..... میں مسلمان ہوں اور کوئی بھی مسلمان....."

"لیکن تم نے ایسا ہی کہا اور گواہی دی کہ اسماعیل خان....."

"نہیں۔" وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ اسے گھورتا ہوا مضبوطی سے قدم زمین پر جماتا رچی ہولے ہولے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ رچی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا اور اس کے پورے وجود میں خوف کی سرد سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"اے زمین تیرا خوب صورت چہرہ مسخ ہو چکا ہے۔ یوں جیسے سنہری لیموں پر جگہ جگہ مسے ابھر آئے ہوں ..... یا..... یا پھر چیچک کے نشان۔"

"نہیں۔" وہ چونکا "سنہری لیموں اور مسے۔"

یہ جملہ..... اس نے پہلے بھی کہیں پڑھا تھا لیکن کہاں۔ "ژل لافورگ" (LAFORG ZHILL) اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔

"ژل لافورگ" فرانس کا وہ علامتی شاعر جو اس کی فرنچ ٹیچر پاؤلن لیکولی کا پسندیدہ شاعر تھا۔ لیکولی ان کی فرنچ زبان کی کلاس کا ایک پیریڈ لیتی تھی اور اس ایک گھنٹے کی کلاس میں اس نے ژل لافورگ کی ساری علامتی نظمیں انہیں سنا ڈالی تھیں اور اس کی اکثر نظمیں سناتے ہوئے وہ بے حد جذباتی ہو جاتی تھی اور وہ اس بات پر بہت فخر محسوس کرتی تھی کہ اس کا نام پاؤلن لیکولی ہے..... جو ژل لافورگ کی ماں کا نام تھا اور جو اپنے بارہویں بچے کی پیدائش پر اڑتیس سال کی عمر میں مر گئی تھی۔

"آہ پاؤلن لیکولی..... بد قسمت ماں۔" وہ اپنی بات کے اختتام پر ہمیشہ آہ بھرتے ہوئے کہتی تھی۔ "لے سنگ لاتے ویلا تر۔" یہ اس کی اٹھارہ سال کی عمر سے لے کر اکیس سال تک کی شاعری تھی۔ "لے سنگ لاتے ویلا تر" "یعنی زمین کی سسکیاں" شاید یہ جملہ زمین کی سسکیاں کی کسی نظم میں تھا یا شاید پھر..... اب وہ نظم تھی۔

"An other for the sun" (سورج کے لیے کچھ مزید) اور ژل نے لکھا تھا۔

"ایک بڑے پیلے کفگیر جیسا سورج جس کے چہرے پر دھبے تھے۔ یوں جیسے سنہری لیموں پر مسے ابھر آئے ہوں۔"

"تو ثابت ہوا کہ یہ جملہ میرا نہیں ہے۔"

اس نے کلپ بورڈ سے کاغذ نکالا اور مروڑ کر شیلف کے پاس پڑی ہوئی باسکٹ میں ڈال دیا تھا۔ جو اوپر تک ایسے ہی مڑے تڑے کاغذوں سے بھری ہوئی تھی۔ آج بڑے دنوں بعد اس کے دل میں لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس کے پبلشر کے کم و بیش دن میں دو تین فون آجاتے تھے۔

"ایک بھائی! کچھ لکھیں..... بہت دنوں سے آپ کی کوئی کتاب مارکیٹ میں نہیں آئی۔"

ایڈیٹروں کے تقاضوں نے الگ ناک میں دم کر رکھا تھا لیکن اس سے کچھ بھی نہیں لکھا جا رہا تھا۔ وہ کوئی عام سی تحریر نہیں لکھنا چاہتا تھا۔ وہ کوئی ایسا شاہکار تخلیق کرنا چاہتا تھا جو اس کی پچھلی تمام تحریروں پر سبقت لے جائے۔ جسے پڑھ کر لوگ پچھلی کتابوں کو بھول جائیں۔ نام تو تشکیل پا چکا تھا اور یہ طے تھا کہ اس کی نئی کتاب کا نام "زمین کے آنسو" ہو گا۔ لیکن وہ چند لائنیں، چند صفحے لکھتا اور پھاڑ کر پھینک دیتا۔ وہ اپنے لکھے سے خود ہی مطمئن نہیں ہو رہا تھا پھر قاری کو کیسے مطمئن کر سکتا تھا۔

اس نے کلپ بورڈ میں کاغذ صحیح کر کے لگائے اور لکھا۔

"زمین کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا یوں جیسے..... جیسے کسی بے حد گوری میم کا ملکوں بھرہ چہرہ یا....."

"نہیں۔" اس نے پھر کاغذ کلپ بورڈ سے کھینچ کر گول مول کر کے باسکٹ میں پھینکا۔

"زمین صدیوں سے رو رہی ہے۔"

اس نے نئے صفحے پر لکھا۔ "پہلا آنسو اس وقت اس کی آنکھ میں آیا تھا، جب حضرت آدم اور حضرت حوا کو جنت سے زمین پر پھینکا گیا تھا۔ اس نے مہربان ماں کی طرح انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ روتے تھے۔ کرلاتے تھے۔ تڑپ تڑپ کر اپنے رب سے اپنے گناہ کی معافی مانگتے تھے۔

"ربنا ظلمنا انفسنا....."

"اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو معاف نہیں فرمائے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم خسارہ کھانے والے ہوں گے)

اور زمین آنکھ میں آنسو لیے بے آواز ان کی دعا میں شامل ہو جاتی تھی۔

اے میرے رب ان پر رحم کر انہیں معاف کر دے۔

اور اس روز اس کی آنکھ میں ٹھہرا آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آیا تھا۔ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا اور اس کے پاکیزہ وجود اور شفاف لباس پر خون کا پہلا قطرہ گرا تھا۔

آنکھ میں ٹھہرا آنسو پگھل کر مٹی میں جذب ہو گیا تھا اور دوسرے آنسوؤں کو راہ مل گئی تھی۔ زمین روتی تھی اور اپنے وجود پر ابھرتے مٹی کے ڈھیر کو دیکھتی تھی۔ قابیل کے ہاتھ تیزی سے زمین میں گڑھا کھودتے تھے اور زمین کے چہرے پر وہ پہلا نشان تھا ..... جسے دیکھ کر اس کی آنکھیں روتی تھیں۔

جب بھی اس کی نظر اپنے چہرے پر لگے اس بدنما داغ پر پڑتی تو وہ بلک اٹھتی..... روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ اس کے شفاف لباس پر خون کے دھبے اور اس کے سینے پر ابھرا مٹی کا ڈھیر اور اس کے وجود میں کھودا گیا گڑھا جس میں ہابیل کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی؟ اسے مدتوں رلاتی رہی تھی۔ مدتوں اس نے آنسو بہائے تھے لیکن پھر اسے صبر آگیا لیکن....."

اس نے اپنی بند مٹھیوں سے آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھے..... آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ بھیگی پلکیں میرے دل میں ہلچل مچا گئیں۔ میں جو بہت دھیان سے اس کی کہانی سن رہا تھا، میرا ارتکاز ٹوٹ گیا۔ میں اس ہرنی جیسی آنکھوں والی لڑکی کی آنکھوں کے سحر میں جکڑ سا گیا۔ اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا چاہتا تھا لیکن جیسے مسمرائز ہو گیا تھا..... اس کے گلاب کی پنکھڑیوں ایسے لب کپکپا رہے تھے۔ ان گلاب لبوں کی نرماہٹ کو محسوس کرنے کی خواہش دل میں دبائے میں نے اس کی آنکھوں کے سحر سے بچنے کے لیے بمشکل نظریں اس کے چہرے سے ہٹائیں۔

"تم آج تیسری بار مجھے ملی ہو حور عین! لیکن آج بھی

اپنے بارے میں کچھ بتانے کے بجائے مجھے زمین کی کہانی سنارہی ہو۔

یہ زمین...... یہ صدیوں پرانی زمین‘ اس سنگدل مٹی میں کیسے کیسے ڈرامے اور کیسی کیسی کہانیاں دفن ہیں ..... تم ایک کہانی نگار کو بتارہی ہو..... حور عین! میں تو تمہیں جاننا چاہتا ہوں..... لفظ لفظ‘ ورق ورق..... میں تمہیں پڑھنا چاہتا ہوں۔“

”تو میں تمہیں اپنے متعلق ہی تو بتارہی ہوں۔“

اس نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا اور مڑ گئی۔

”حور عین رکو!“ میں نے تیزی سے بڑھ کر اس کی اوڑھنی کے پلو کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ ”سنو تم.....“

”ایبک۔“

وہ جو بے حد انہماک سے لکھ رہا تھا۔ عمارہ کے پکارنے پر اس بری طرح چونکا کہ قلم اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

”جی ماما!“ وہ تیزی سے ان کی طرف مڑا۔ عمارہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

”پانی!“ عمارہ کہنی کے بل اٹھیں۔

ایبک نے جھک کر قلم اٹھا کر میز پر رکھا اور کمرے میں موجود روم فریج کی طرف بڑھ گیا۔ پانی کا گلاس عمارہ کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ کرسی گھسیٹ کر ان کے بیڈ کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”تم کچھ کام کر رہے تھے‘ میں نے شاید تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔“

”نہیں! کچھ خاص کام نہیں۔ یوں ہی ایک کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”کوشش‘ کیا مطلب؟“

”ابھی اسے کوشش ہی کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ میں نہیں جانتا کہ جب یہ مکمل ہوگی تو اس کی کیا شکل ہوگی۔ آیا یہ کہانی کہلائی بھی جاسکے گی یا نہیں۔ ہمارے نقاد تو بعض اوقات اچھی خاصی تحریر کو رد کر دیتے ہیں اور میں تو ابھی طفل مکتب ہوں۔“

اس نے بے حد تفصیل سے بات کی تھی شاید اپنے لکھے ہوئے سے وہ اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ لیکن اس نے کلپ بورڈ سے کاغذ نکال کر پھینکا نہیں تھا۔

”بابا جان نہیں آئے کیا۔“ پانی پی کر خالی گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

”انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر میرے پاس آکر رہیں گے یہاں۔“

”ڈاکٹر نے ابھی ان کو ڈسچارج نہیں کیا‘ آپ کو لے چلوں اسپتال؟“

”صبح تو گئی تھی۔“

”تو کیا ہوا۔“

”وہاں اگر مائرہ ہوئی تو۔ ایبک! اسے میرا بابا جان کے پاس جانا ان سے ملنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ دوبار مجھے اسپتال میں ملی اور دونوں بار ہی مجھے لگا کہ وہ..... اسے برا لگ رہا ہے۔ وہ غصے میں ہے۔“

”ہے بی ماما! ایسا ہو لیکن ہمیں کسی دوسرے کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔“

”وہ کوئی دوسری نہیں‘ احسان کی بیوی ہے۔ میرے بھائی کی..... اور شانی۔“ وہ یکدم چپ کر گئی تھیں۔ احسان پتا نہیں ان سے اتنا خفا کیوں ہے۔ الریان سے سب ہی تو انہیں ملنے آئے تھے۔ باری باری..... ثنا بھائی‘ منیبہ‘ حفصہ‘ عادل‘ مریبہ حتیٰ کہ گلزار بابا اور رحمت بوا بھی۔ رحمت بوا کتنی بوڑھی ہوگئی تھیں۔ انہیں گلے لگا کر یوں دھاڑیں مار مار کر روئی تھیں کہ کرنل شیر دل گھر کے اندر سے ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے انیکسی میں آگئے تھے۔

بس نہیں آیا تھا تو احسان نہیں آیا تھا۔

چار دن ہوگئے تھے انہیں یہاں آئے ہوئے اور ان چار دنوں کا بیشتر وقت انہوں نے بابا جان کے پاس اسپتال میں گزارا تھا۔

”تو پھر چلیں؟“ ایبک نے انہیں خاموش دیکھ کر پوچھا اور کلائی الٹ کر وقت دیکھا۔ ”چھ بجنے والے ہیں۔“

”کیا پتا آج بابا جان ”الریان“ چلے گئے ہوں۔ آج ہومی کہہ رہا تھا کہ شام تک شاید وہ بابا جان کو ڈسچارج کر دیں گے۔“

"ہاں لیکن بابا جان نے کہا تھا وہ اسپتال سے سیدھے ادھر آئیں گے۔" ایبک مسکرایا۔

"کیا پتا شانی نے انہیں منع کردیا ہو۔" عمارہ افسردہ ہوگئیں۔

"نہیں! ہومی نے وعدہ کیا تھا اور پھر بابا جان اگر آنا چاہیں تو انکل احسان بھلا انہیں کیسے روک سکتے ہیں۔" عمارہ نے سر ہلاتے ہوئے پاؤں بیڈ سے نیچے لٹکائے۔

"ایبک! تمہارے بابا وہ تو وہاں بہت اکیلے ہیں۔ بہت اداس ہوں گے۔ تمہاری بات ہوئی تھی صبح ان سے تم نے کیا کہا ہم کب بہاول پور جائیں گے۔"

"ہاں وہ اداس تو ضرور ہیں لیکن انہوں نے کہا ہے کہ آپ کا جب تک جی چاہے یہاں رہیں۔"

"نہیں ایبک! تمہارے بابا اس طرح اکیلے کبھی نہیں رہے۔ بے شک انجی اور جواد ہیں ان کے پاس لیکن بہت گھبراتے ہوں گے وہ۔ میں بھی بابا جان کے پاس زیادہ سے زیادہ رہنے کی چاہ میں انہیں بھلائے بیٹھی ہوں۔ تم کل کی سیٹ بک کروادو۔"

وہ چپل پہن کر کھڑی ہوگئیں۔

"ٹھیک ہے ماما! کل چلتے ہیں۔ آپ فریش ہو جائیں تو بابا جان سے ملنے چلتے ہیں۔"

عمارہ واش روم کی طرف بڑھ گئیں تو ایبک نے رائٹنگ ٹیبل سے کاغذات اٹھا کر فائل میں رکھے اور فائل دراز میں رکھ دی۔ "پتا نہیں میں یہ کہانی کبھی مکمل کر بھی سکوں گا یا نہیں۔"

اس نے سوچا اور تب ہی دروازہ زور سے کھلا اور کھلے دروازے سے منیبہ کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے دروازے میں کھڑے کھڑے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

"بابا جان کہاں ہیں؟"

"وہ اسپتال میں ہیں۔ مونی! تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔" ایبک نے حیرت سے کہا۔

"نہیں! وہ اسپتال سے سیدھے ادھر ہی آرہے ہیں۔ ہمدان نے فون کرکے مجھے بتایا تھا۔"

"اچھا!" ایبک کا چہرہ چمک اٹھا۔

منیبہ کے کندھے پر سے زبیر احسان نے اندر جھانکا۔ "ہمیں بھی راستہ دو دروازے میں جم کر کھڑی ہوگئی ہو۔"

"اوہ…… ہاں۔" منیبہ دروازے سے ہٹ کر اندر آئی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا کیک ٹیبل پر رکھا اور اس کے پیچھے پہلے زبیر احسان پھر عمر احسان اور حفصہ، مرینہ سب ہی یکے بعد دیگرے اندر چلے آئے تھے۔

"ایک کے بعد ایک لیکا۔ قطرہ قطرہ زمین پہ ٹپکا۔" عمر احسان ٹیبل سے ٹیک لگا کر گنگنایا۔

حفصہ اور مرینہ نے بھی خوب صورت کیک اٹھا رکھے تھے۔ چھوٹی سی سینٹر ٹیبل پھولوں سے بھر گئی تھی اور کمرا ان کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

منیبہ نے تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور آرڈر جاری کیا۔ "سب لڑکیاں کارپٹ پر بیٹھ جائیں اور لڑکے باہر سے ڈائننگ چیئرز اٹھا کر اندر لے آئیں اور اس دیوار کے ساتھ لگادیں اور ان پر تشریف رکھیں۔"

اندر آتے اس نے سٹنگ روم میں کونے میں چھوٹی سی گول ڈائننگ ٹیبل کے گرد پڑی کرسیوں کو دیکھا تھا۔ تب ہی واش روم کا دروازہ کھول کر عمارہ باہر آئیں۔ سب لڑکیاں باری باری ان سے ملیں۔ عمارہ کا چہرہ ان سب کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

منیبہ تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ کمرے میں دو سنگل بیڈ تھے۔ اس نے فوراً ہی ایک بیڈ پر بکھری کتابیں اٹھا کر رائٹنگ ٹیبل پر رکھیں بیڈ شیٹ کی سلوٹیں ٹھیک کیں اور ایبک کی طرف دیکھا جو دیوار سے ٹیک لگائے دلچسپی سے اسے یہ سب کرتے دیکھ رہا تھا۔

"یہ بیڈ بابا جان کے لیے ٹھیک رہے گا۔"

"بابا جان!" اپنے بیڈ پر بیٹھتے بیٹھتے عمارہ چونکیں۔

"ہاں' بابا جان ہومی کے ساتھ ادھر ہی تو آرہے ہیں پھپھو!"

منیبہ نے ان کے خوشی سے کھلتے چہرے کو دیکھا

اور بے اختیار بڑھ کر ان کے رخسار پر بوسہ دیا اور خود بھی بیڈ پر ایک بازو ان کے گرد حمائل کرکے بیٹھ گئی۔

"ہمیں کارپٹ پر بٹھا کر خود بیڈ پر بیٹھ گئی ہو پھپھو کے ساتھ۔"

مرینہ نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

اور اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے منیبہ نے ایبک سے کہا۔

"ایبک فلک شاہ! تم کوئی ایسا کمرا نہیں لے سکتے تھے جو اتنا بڑا ہوتا جس میں ہم سب سما سکتے؟"

"میرا خیال ہے ہم سب لوگ فٹ ہوگئے ہیں ادھر' بلکہ چار کرسیاں ابھی خالی ہیں۔"

"اور وہ جو ایک اور قافلہ افتاں و خیزاں ہمارے پیچھے چلا آرہا ہے۔ انہیں کہاں فٹ کروگے؟"

"شاعر و ادیب آدمی ہیں' پلکوں پہ بٹھائیں گے آنکھوں پر جگہ دیں گے اور۔"

زبیر احسان پتا نہیں آج اتنا شوخ کیوں ہو رہا تھا۔

"اور آگے تمہاری Vocabulary (ذخیرہ الفاظ) ختم ہوگئی۔"

عمر احسان ہنسا تو زبیر کا مکا اس کے کندھے پر پڑا۔

"تمہاری vocabulary کا بھی مجھے علم ہے۔"

عمارہ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ بے حد مسرت اور خوشی سے سب کو دیکھ رہی تھیں۔ ان سب سے ملنے اور انہیں دیکھنے کو وہ کتنا ترسی تھیں اور ان سب کی وجہ سے الریان میں خوب رونق ہوتی ہوگی۔ ایسی ہی رونق جیسی پہلے ہوا کرتی تھی…… جب سب تھے۔ اماں جان' زارا' مرتضیٰ' مصطفیٰ' عثمان' احسان' عبداللہ چچا' مروہ پھپھو' دادی جان…… کتنے اچھے تھے وہ دن۔ تب "الریان" پر کسی غم کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی۔ عبداللہ چچا' بینا چچی' مرتضیٰ بھائی' مروہ پھپھو چلی گئی تھیں پھر بھی "الریان" میں زندگی ہنستی تھی۔ ثنا بھابی آگئی تھیں۔ راحت بھابی تھیں۔ عثمان بھائی کی بیوی تھیں اسما…… اور پھر "الریان" کی ہنسی کو نظر لگ گئی۔

"کون کون آرہا ہے؟" ایبک پوچھ رہا تھا' وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"سب۔" منیبہ نے خوشی سے جھومتے ہوئے بتایا۔ "ثنا چچی' اسما چچی' عثمان چچی' عادل اور سب۔"

عمارہ کا دل چاہا' وہ پوچھیں کیا احسان بھی آرہا ہے اور ابھی انہوں نے منیبہ کی طرف دیکھا ہی تھا کہ باہر شور سنائی دیا۔ سب آگئے تھے۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے سب اندر آئے تھے اور ان کے جلو میں بابا جان تھے۔ ہمدان کے بازو کا سہارا لیے وہ اندر آئے تھے۔ ایبک نے بڑھ کر انہیں سہارا دے کر بیڈ پر بٹھایا تھا۔

"بابا جان پلیز۔ آپ ایزی ہو کر بیٹھ جائیں۔" اس نے فوراً" تکیے ان کے پیچھے رکھے تھے۔

نیم دراز ہوتے ہوئے انہوں نے عمارہ کی طرف دیکھا۔

"عمو میری بچی! ادھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔" عمارہ کی آنکھوں سے بہت آہستگی سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ایبک کی نظر ان پر پڑی تو وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے اور ان کے گرد بازو حمائل کیے کیے انہیں بابا جان کے پاس لے کر آیا۔

کمرہ بھر گیا تھا اور منیبہ سب کو بٹھا رہی تھی۔

"عثمان انکل! آپ ادھر کرسی پر بیٹھ جائیں اور اسما چچی آپ بھی۔" منیبہ کی ہدایات جاری تھیں۔

"عمو میرا مومی…… ایبک سے کہو۔ مومی کو لے آئے یہاں تو وہ آسکتا ہے نا۔ ایک بار مجھے آکر مل جائے۔ اب تو چراغ سحری ہیں بس کسی لمحے ٹمٹما کر بجھ جائیں گے۔"

"بابا جان!" عمارہ نے ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لیتے ہوئے ہونٹوں سے لگایا۔

"ایسا نہ کہیں…… آپ کو ابھی بہت جینا ہے۔ اتنے سال جتنے سال آپ مجھ سے جدا رہے۔"

"جھلی نہ ہو تو۔" وہ ہولے سے ہنسے اور پھر یکدم ہی ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"چھبیس سالوں کی جدائیاں کتنے گہرے گھاؤ لگا گئی

...... اور یہ گھاؤ بھر نہیں سکتے اور ان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔"

"بابا جان! رونا نہیں ...... بالکل بھی نہیں۔ آج تو خوشی کا دن ہے۔" عمارہ نے اپنی انگلی سے ان کے رخساروں پر ڈھلک آنے والے آنسوؤں کے قطروں کو پونچھا۔

"کیا میری گنجائش ہے؟" عادل ہاتھ میں کی رنگ تھما تا دروازے میں کھڑا تھا۔

"گنجائش دل میں ہونا چاہیے۔" عمر احسان نے جوتے اتار لیے اور بیڈ پر چڑھ گیا۔

"تم ادھر آجاؤ۔" ایبک نے جو عثمان شاہ کی کرسی کے قریب والی کرسی پر بیٹھا ان سے کوئی بات کر رہا تھا' کھڑا ہو گیا۔

"ارے نہیں' تم بیٹھو۔ میں ادھر بیٹھ رہا ہوں۔" عادل بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

"اور ابھی کس کس نے آنا ہے؟" مرینہ شاہ نے حفصہ کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے پوچھا تو منیبہ نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

"مصطفیٰ انکل اور ثنا چچی۔"

"وہ دونوں گھر پر نہیں تھے۔" عمر احسان نے اعلان کیا۔

"رابیل احسان اور مائرہ چچی۔"

"ان کے آنے کی امید نہ رکھیں۔ وہ والد محترم اور شہزادی رابیل کے ساتھ رحیم یار خان روانہ ہو چکی ہیں۔"

"کب؟ کس وقت؟ ہمیں کیوں نہیں پتا۔" منیبہ' حفصہ اور مرینہ ایک ساتھ چیخی تھیں۔

"یہ تو مجھے بھی علم نہیں۔" عمر احسان نے کان کھجائے۔ "لیکن صبح گیارہ بجے ان کا فون رحیم یار خان سے آیا تھا۔"

"او کے اب کون رہ گیا؟"

"عاشی اور ...... اور اریب فاطمہ۔"

"عاشی۔ ارے میری بچی۔ اسے کیوں نہیں لائے؟" بابا جان کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"وہ سو رہی تھی۔" عادل نے بتایا۔

"میں مصطفیٰ انکل کو فون کر دیتا ہوں کہ وہ اور ثنا چچی جہاں کہیں ہیں' آجائیں اور عاشی کو بھی لے آئیں۔"

زبیر احسان نے جیب سے موبائل نکالا۔

"ایبک بھائی! یہ اتنے سارے لوگوں کی خاطر تواضع کا کچھ انتظام بھی تو ہونا چاہیے۔"

حفصہ "الریان" کے کچن کی نگران تھی اور "الریان" میں آنے والے ہر فرد کی خاطر تواضع اس کی ذمہ داری تھی۔

"ایبک بھائی! آپ کا کچن کہاں ہے۔ اقصیٰ آپی کو بتا دیں۔ منٹوں میں چائے تیار کر لیتی ہیں۔"

عمر احسان نے عادل اور زبیر کے بیچ میں سے سر نکال کر مشورہ دیا۔ تب ہی کرنل شیر دل نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

"چائے تیار ہو رہی ہے بلکہ آپ سب لوگ ادھر ہمارے لونگ روم میں ہی آجائیں۔"

"نہیں انکل شیر دل! یہاں بہت مزا آ رہا ہے۔ محبت کی گرمی ہے اور دلوں میں گنجائش ہے۔ آپ بھی کہیں فٹ ہو جائیں۔"

زبیر احسان چہکا تھا۔ اور کرنل شیر دل نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ تب ہی ان کی نظر بابا جان پر پڑی۔

"ارے بابا جان آپ!" وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھے تھے۔

اور پھر بابا جان سے ملتے ہوئے انہیں بھی جانے کیا کیا کچھ یاد آگیا تھا کہ ان کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی۔ انہیں فلک شاہ کا رونا اور بلکنا یاد آیا تھا۔ کیسا کیسا تڑپے تھے وہ جب الریان کے دروازے خود انہوں نے اپنے اوپر بند کر لیے تھے۔

"شیر دل! اس ظالم کو لے آؤ میرے پاس۔ اس سے کہو' مجھے معاف کر دے۔ مجھے غصہ آگیا تھا۔ تم تو جانتے ہو نا۔ میں پسند نہیں کرتا تھا اس کا سیاست میں انوالو ہونا۔"

"بابا جان!" عمارہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ موی تو خود آپ سے شرمندہ ہیں۔ انہوں نے کل رات بھی مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے ان کے لیے معافی مانگوں۔ آپ انہیں معاف کر دیں بابا جان! انہوں نے آپ کا دل دکھایا۔"

"ارے میں کب ناراض ہوں اس سے۔ بھلا ماں باپ بھی بچوں سے خفا ہو سکتے ہیں اور موی سے تو میں کبھی خفا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"

پتا نہیں کیا بات تھی' وہ انہیں سلجوق سے بھی زیادہ پیارا تھا۔ ان کی عمو کا شوہر جو تھا۔ وہ ان کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا تھا ــــــ عمارہ کے امتحان کے بعد انہوں نے وعدہ کے مطابق عمارہ کی رخصتی کر دی تھی۔ بہت دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ مراد شاہ کا بس چلتا تو۔ وہ اس شادی میں پورے لاہور کو مدعو کر لیتے۔ انہوں نے ایک ماہ پہلے ہی ماڈل ٹاؤن میں ایک شان دار کوٹھی کرائے پر لے لی تھی۔ عمارہ کی بری اتنی شان دار تھی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ انہوں نے رونمائی میں عمارہ کو اقبال ٹاؤن میں ہی دو کنال کی ایک کوٹھی گفٹ کی تھی۔ آٹھ گھوڑوں والی بگھی پر فلک شاہ کی بارات آئی تھی۔

اور پھر اس کا ولیمہ بھی اتنا ہی شان دار تھا اور اس وقت جب دلہن کا جوڑا زیادہ سے زیادہ چھ سات ہزار میں بن جاتا تھا۔ لوگوں کے پاس نہ تو اتنا پیسہ تھا اور نہ ہی اتنی مہنگائی۔ انہوں نے عمارہ کا ولیمہ کا ڈریس پچاس ہزار کا بنوایا تھا۔ آج پچاس ساٹھ ہزار کا عروسی لباس عام خوش حال گھرانوں میں بھی بنا لیا جاتا ہے لیکن 73'74 میں ایسا نہیں تھا۔

فلک شاہ بہاول پور سے واپس آئے تو انہوں نے عبدالرحمٰن شاہ سے درخواست کی تھی کہ وہ عمارہ کے ساتھ اپنے گھر میں منتقل ہونا چاہتے ہیں۔

ابھی ان کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے انہیں کچھ عرصہ لاہور میں ہی رہنا تھا۔

"کیوں؟" انہیں حیرت ہوئی تھی۔ "کیا عمارہ اور تم اب الریان میں نہیں رہ سکتے؟ کیا عمارہ پرائی ہو گئی ہے؟ "الریان" تمہارا نہیں رہا؟"

"نہیں بابا جان!" وہ مسکرائے تھے۔ "نہ الریان پرایا ہوا ہے اور نہ عمارہ پرائی ہوئی ہے۔ لیکن بیٹیاں شادی کے بعد اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہیں۔"

انہیں قائل کرنے اور اپنی بات منوانے کا ہنر آتا تھا۔

"تم کالج چلے جایا کرو گے اور یہ گھر پر اکیلی۔ بہتر ہے کہ تم اسے بہاول پور چھوڑ آؤ۔" وہ ناراض ہوئے تھے۔

"کیوں بہاول پور کیوں' جب میں کالج جاؤں گا تو اسے "الریان" میں چھوڑ جایا کروں گا۔ یہ الریان کے ساتھ والے "ملک ہاؤس" کا ہی تو ایک پورشن لیا ہے میں نے کرائے پہ۔"

اور وہ ان کی بات نہیں ٹال سکتے تھے۔ حالانکہ ان کا دل بالکل نہیں مانتا تھا کہ وہ اور عمارہ "الریان" کے علاوہ کہیں اور رہیں لاہور رہتے ہوئے۔ یوں عمارہ اور وہ ملک ہاؤس میں رہنے لگے تھے۔ عمارہ صبح ان کے کالج جاتے ہی "الریان" آجاتی تھی۔ اور ان ہی دنوں انہیں ان کی سیاسی سرگرمیوں کا علم ہوا تھا۔ ان دنوں وہ "الریان" آتے تو عثمان' احسان اور مصطفیٰ کے ساتھ سیاسی بحثیں کرتے۔ لمبی لمبی بحثیں ہوتیں اور کبھی جو وہ سنتے تو اسے ضرور منع کرتے۔

"موی بیٹا! سیاست میں مت الجھنا۔ یہاں سیاست میں بہت خرابیاں ہیں۔"

وہ سر جھکا لیتے تھے لیکن مصطفیٰ نے انہیں بتایا تھا کہ وہ کسی سیاسی پارٹی کے سرگرم رکن بن چکے ہیں۔ انہوں نے اپنا ماسٹرز مکمل کر لیا تھا۔ عبدالرحمٰن شاہ چاہتے تھے کہ اب وہ واپس بہاول پور آجائیں لیکن وہ مستقل بہاول پور نہیں رہ سکتے تھے ...... یہاں پارٹی کے بہت سارے کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔

سو مہینے میں پندرہ دن بہاول پور اور پندرہ دن لاہور میں گزرنے لگے تھے۔ پھر ایبک پیدا ہوا اور ایبک کی پیدائش کے بعد احسان شاہ کی منگنی مائرہ سے ہو گئی تھی حالانکہ وہ مروہ کے سسرال میں رشتہ کرنے کے حق

میں نہ تھے لیکن بات احسان شاہ کی خواہش کی تھی۔ مروہ نے انہیں قائل کیا تھا۔

"شانی، مائرہ کے لیے بہت سنجیدہ ہے بابا جان۔"

اور پھر فوراً" ہی شادی کی تاریخ بھی طے پا گئی کہ احسان شاہ کو ایم ایس سی کے لیے اسکالرشپ مل رہا تھا۔ یوں مائرہ، احسان شاہ کی دلہن بن کر رحیم یار خان سے "الریان" میں آگئی تھی۔

اس روز عمارہ ان کے کمرے میں بیٹھی ایبک کے کپڑے تبدیل کر رہی تھیں جب انہوں نے عمارہ سے موی کا پوچھا تھا۔

"موی آج کل بہت دیر سے آتا ہے تمہیں لینے۔ کیا کوئی کام شروع کیا ہے؟"

اور عمارہ نے بے حد سادگی سے بتایا تھا۔

"نہیں تو، وہ تو پارٹی کے دفتر میں جاتے ہیں۔ ان انہوں نے پارٹی تبدیل کرلی ہے۔"

"پارٹی تبدیل کرلی ہے۔ کیا مطلب؟" وہ ششدر رہ گئے تھے۔

"موی کتنا خود سر ہوگیا ہے۔ میں نے کتنا سمجھایا تھا اسے کہ وہ سیاست سے باز رہے لیکن۔ میں چچا جان سے بات کروں گا عمارہ..... اب تک جو کچھ وہ کرتا رہا ٹھیک ہے لیکن اب وہ شادی شدہ ہے۔ بچے کا باپ ہے اب اسے ایسی حماقتوں سے گریز کرنا چاہیے۔"

وہ ناراض ہے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

اور باہر لاؤنج میں مصطفیٰ کو بیٹھے دیکھ کر وہ اس سے شکوہ کر بیٹھے تھے۔

"یہ موی کیا کرتا پھر رہا ہے طیفی بیٹا۔"

"وہ بہت سمجھ دار ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔"

مصطفیٰ نے ہاتھ پکڑ کر انہیں پاس بٹھالیا تھا۔

"وہ کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں ہے، یہ ایک ویلفیئر تنظیم ہے۔ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتی ہے۔"

اور تب ہی مائرہ جو نہ جانے پہلے سے ہی لاؤنج میں موجود تھی اور انہوں نے اپنی پریشانی میں دیکھا نہیں تھا یا پھر اسی وقت آئی تھی طنزیہ انداز میں کہا۔

"چھوڑیں مصطفیٰ بھائی! خوامخواہ میں موی کے کارناموں پر پردہ مت ڈالیں۔ میں بھی نا گورنمنٹ کالج میں سب جانتی ہوں۔ بابا جان نے بھی جانے کیا دیکھ کر ہماری عمو کو اس کے پلے باندھ دیا۔"

وہ بات مکمل کر کے وہاں رکی نہیں تھی اور تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

"یہ مائرہ کیا کہہ رہی تھی مصطفیٰ بیٹا۔" وہ پہلے سے زیادہ پریشان ہوگئے تھے۔

"کچھ نہیں بابا جان۔" مصطفیٰ نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ "مائرہ بھابھی کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

مصطفیٰ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ وہ مائرہ سے ضرور بات کریں گے۔ آخر کچھ تو ہوگا جو وہ اتنی بڑی بات کر گئی ہے۔

"خواتین و حضرات! آپ سب لوگ کھانا ہماری طرف کھائیں گے۔" کرنل شیر دل کہہ رہے تھے۔ بابا جان چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"اور میں دراصل یہی کہنے آیا تھا اور ہاں ہماری بچیوں کو ایبک کا کچن تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ..... چائے بھی آرہی ہے۔ ادھر ہی۔"

"چائے۔" مرینہ نے دہرایا اور ناک پر پھسل آنے والی عینک کو درست کیا۔

"ہاں چائے کی تو بہت ضرورت ہے اس وقت۔ مستقبل کی ڈاکٹر صاحبہ نے ٹھیک ایک گھنٹہ دس منٹ پہلے چائے نوش فرمائی تھی۔ اور اب دس منٹ اوپر ہو گئے ہیں۔ یہ ہر گھنٹے بعد چائے پینے کی عادی ہیں۔"

"تحکومت۔"

مرینہ کا ذہن ایبک کے کچن میں الجھا ہوا تھا۔

"ایبک سلطان کا کچن" اس نے برا سامنہ بنایا۔ "اے کاش کوئی ایبک سلطان کا نام تبدیل کردے۔ عمر صحیح کہتا ہے۔"

اس نے باہر جاتے ایبک کو دیکھا۔ "ایبک فلک شاہ اور لڑکیاں یوں ہی تو نہیں مرتیں ایبک فلک شاہ پر، کتنے شان دار ہیں نا ایبک بھائی!" اس نے حفصہ کے

کان میں سرگوشی کی جسے سب نے سنا اور بیڈ سے چھلانگ لگا کر ایبک کے پیچھے جاتے عمر نے برا سا منہ بنایا۔

"یہ الریان کی لڑکیاں بھی نا، دل میں کوئی بات رکھ ہی نہیں سکتیں اور سرگوشی کرنے کا ہنر تو انہیں آتا ہی نہیں ہے۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا اور جب انیکسی کا صحن عبور کر کے وہ لان میں آیا تو لان خالی تھا۔ ایبک جا چکا تھا۔ لیکن کہاں؟ وہ سوچتا ہوا واپس اندر جا رہا تھا اور ایبک جو کولڈ ڈرنک لینے کے لیے باہر نکلا تھا ابھی گیٹ سے چند قدم دور ہی گیا تھا کہ ٹھٹک گیا۔

عاشی کا ہاتھ تھامے ادھر ادھر پریشانی سے دیکھتی وہ اریب فاطمہ ہی تو تھی حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے اندر دور تک خوشی پھیلتی چلی گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے سب کو دیکھتے ہوئے اس کے دل نے خواہش کی تھی اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ بھی ان سب کے ساتھ ہوتی وہ ہرنی جیسی آنکھوں والی خوش خصال لڑکی۔

اور کبھی کبھی خواہشیں کیسے کس طرح اچانک پوری ہو جاتی ہیں اور کبھی عمریں گزر جاتی ہیں، آرزو کا کشکول اٹھائے اور کوئی کھوٹا سکہ بھی اس کشکول کا مقدر نہیں بنتا۔ لبوں پر مسکراہٹ لیے وہ ان کی طرف بڑھا۔ وہ مڑی تھی۔ اس کی سیاہ چادر کا ایک پلو زمین پر لگ رہا تھا۔

"عاشی!" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

عاشی نے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر اس سے ہاتھ چھڑا کر اس کی طرف بھاگی تھی۔ "ایبک بھائی۔"

اس نے بھی مڑ کر دیکھا اور عاشی کا گال تھپتھپاتا اس کا ہاتھ پکڑتا وہ چند قدم آگے بڑھا۔ وہ ابھی تک وہاں ہی ہراساں سی کھڑی تھی۔

"حور عین!" اس نے دل میں دہرایا اور اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"آپ اکیلی یہاں کیسے؟" وہ حیران سا تھا۔

"وہ....." اس نے تھوک نگلا۔ اس قدرے خنک دن میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ چادر کے پلو سے اس نے چہرہ صاف کیا۔

"ہم کرنل شیر دل کا گھر ڈھونڈ رہے تھے۔" عاشی نے بتایا تو اس نے مسکرا کر عاشی کی طرف دیکھا۔

"یہ پیچھے وہ کالا گیٹ..... کرنل شیر دل کے گھر کا ہی ہے نا۔"

"اور یہاں اتنے سارے گھروں کے کالے گیٹ ہیں۔ ہم کنفیوز ہو گئے تھے۔" اب بھی عاشی ہی بولی تھی۔

"آپ کرنل شیر دل سے کہیں، وہ اپنے گھر کے گیٹ پر گلابی یا بلیو پینٹ کروالیں۔ ادھر کسی گھر میں پنک یا بلیو گیٹ نہیں ہے۔"

عاشی نے مشورہ دیا تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔

ضرور، میں کرنل شیر دل کو مشورہ دوں گا۔ تاکہ آئندہ آپ کو گھر ڈھونڈنے میں مشکل پیش نہ آئے لیکن یہ گھر ڈھونڈنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ سب کے ساتھ کیوں نہیں آئیں آپ....."

اب وہ پھر اریب فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ مجھے تو نہیں آنا تھا۔ یہ عاشی جاگ کر رونے لگی تھی۔ بہت رو رہی تھی۔ میں نے عمر کو فون کیا تو اس نے کہا۔ میں عاشی کو لے کر آجاؤں۔"

اور آپ عاشی کو لے کر آگئیں۔ جبکہ لاہور ابھی آپ کے لیے اجنبی ہی ہے۔"

"وہ عمر نے بتا اچھی طرح سمجھایا تھا۔"

"یہ عمر بھی بس..... خود جا کر لے آتا عاشی کو۔"

"وہ میں نے تو کہا تھا۔ میں نہیں آؤں گی لیکن عمر نے۔"

"اور آپ انکار نہیں کر سکیں۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

You have to strong enough to say no

(آپ کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ آپ "نہیں" کہہ سکیں۔) جی!" وہ کچھ سمجھ نہیں سکی تھی۔

"میں چلتی ہوں، آپ عاشی کو لے جائیں۔"

"احمق لڑکی!" وہ بڑبڑایا اور اس کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کو جانے کے لیے نہیں کہہ رہا ہیں

آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ انسان کو غلط بات ماننے سے انکار کر دینا چاہیے۔"

"لیکن یہ غلط بات تو نہیں تھی نا!" اریب فاطمہ نے معصومیت سے کہا۔ "عاشی اتنا رو رہی تھی۔"

"او کے۔" وہ مسکرایا۔ "اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔ چلیں، آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔"

"آپ عاشی کو لے جائیں۔ میں اب گھر جاتی ہوں"۔

وہ روڈ پر کھڑے رکشے کی طرف بڑھی۔

ایبک نے غیر ارادی طور پر ایک قدم آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ کیا حماقت ہے؟"

وہ ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچا۔ ایبک نے یکدم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"سوری....."

"میں تو صرف عاشی کو چھوڑنے آئی تھی۔"

"تو چھوڑ آئیں، وہ سامنے گیٹ ہے۔ گیٹ میں داخل ہو کر دائیں طرف مڑ جائیں۔ لان عبور کریں..... سامنے ہی انیکسی کا دروازہ ہے۔"

وہ ذرا سا منہ کھولے ایبک کی طرف دیکھتی ہونق سی لگ رہی تھی۔ ایبک نے رخ موڑ کر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں ایبک بھائی؟" عاشی نے پوچھا تو اسے دیکھتی اریب بھی چونکی۔

"میں کام سے جا رہا ہوں گڑیا! آپ جائیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

"وہ..... عمر نے کہا تھا۔ گیٹ پر پہنچ کر اسے فون کر دوں وہ گیٹ سے لے جائے گا۔"

"تو کر دیں فون۔"

"فون نہیں ہے میرے پاس۔" وہ جھجکی۔ "عاشی اتنا رو رہی تھی، جلدی میں بیڈ سے فون اٹھایا ہی نہیں۔ وہ موبی کا فون تھا۔ عمر نے کہا تھا اس کے بیڈ پر پڑا ہے۔"

ایبک لمحہ بھر اسے دیکھتا رہا۔ وہ اب بھی ہراساں سی تھی۔

"آپ یہاں تک آگئی ہیں تو اب کیوں خوف زدہ ہیں۔"

"وہ مائرہ مامی کو شاید اچھا نہ لگے میرا آنا۔ بس عاشی کا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ اور میں سوچے سمجھے بغیر....."

"ہمیشہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے اریب فاطمہ"، اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایبک نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور مائرہ مامی وہاں نہیں ہیں۔"

"اچھا!" اس کے لبوں سے نکلا۔

ایبک کو لگا جیسے وہ ایک دم پر سکون ہو گئی ہو۔ اس نے عاشی کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اعتماد سے قدم اٹھا رہی تھی۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ میرا بھی جی چاہ رہا تھا عمارہ پھپھو سے ملنے کا..... وہ بہت اچھی ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کر کے مجھے لگا جیسے وہ مروہ مامی جیسی ہیں۔ حلیم۔ نرم خو..... لیکن میں نے صرف مائرہ مامی کی وجہ سے موبی آپا کو منع کر دیا تھا۔" وہ تیز تیز بول رہی تھی۔

کیا اسے مائرہ مامی کے وہاں نہ ہونے کی اتنی خوشی ہوئی ہے اور اس سے پہلے تو اس نے کبھی ایبک سے اتنی باتیں نہیں کی تھیں۔

ایبک نے حیرانی سے سوچا۔

اور کیا مائرہ مامی اسے پسند نہیں کرتیں اور کیا انہوں نے اس سے کچھ کہا ہے اور ان سے اور رابیل سے بعید بھی نہیں کچھ۔

ایبک نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ روانی سے بولتے بولتے رک گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک رہے تھے۔ عاشی ہاتھ چھڑا کر کھلے گیٹ کے اندر چلی گئی تھی۔ سامنے لان میں عمر کھڑا کرنل شیر دل سے باتیں کر رہا تھا۔ اپنے پیچھے گیٹ کو بند کرتے ہوئے ایبک نے اریب سے کہا۔

"آپ بے فکر ہو جائیں اریب فاطمہ! مائرہ مامی وغیرہ تو آج صبح چار بجے ہی رحیم یار خان چلے گئے تھے۔ بقول عمر احسان کے۔"

"کیا؟" اریب فاطمہ کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی "وہ رحیم یار خان گئے ہیں۔ کیوں؟"

"یہ تو معلوم نہیں شاید عمر کو پتا ہو۔"

ایبک نے کندھے اچکائے اور مڑ کر عمر کو دیکھا جو عاشی کا ہاتھ پکڑے انیکسی کی طرف جا رہا تھا اور پھر اریب فاطمہ کی طرف دیکھنے لگا جس نے گیٹ سے ٹیک لگائی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

"کیا ہوا؟" ایبک نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ لیکن اریب فاطمہ کے آنسو اسی روانی سے بہہ رہے تھے۔

"پلیز مت روئیں اس طرح۔ مجھے آپ کے رونے سے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔"

اریب فاطمہ نے ہاتھ میں پکڑا چادر کا پلو چھوڑ کر ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

وہ آنسو پونچھتی جا رہی تھی اور وہ مزید بہتے چلے آ رہے تھے جیسے آنکھوں میں دریا سما گیا ہو۔ سیاہ چادر کے ہالے میں لپٹا اس کا چاند چہرہ اور غزال آنکھوں سے بہتے آنسو۔ ایبک بے اختیار ایک قدم آگے بڑھا اور غیر ارادی طور پر ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے بہتے آنسوؤں کو پونچھنا چاہا اور پھر ہاتھ نیچے کر لیے۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ وہ اس کے اتنے قریب کھڑا تھا کہ اسے لگا جیسے وہ اس کے قرب کی حدت سے جل اٹھے گا۔

وہ یکدم پیچھے ہٹا تھا۔ اریب فاطمہ نگاہیں اٹھائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے بہتے آنسو رک گئے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں سہم اور ڈر سمٹ آیا تھا۔

"آپ کا رونا مجھ سے نہیں سہا جا رہا اریب فاطمہ! آپ نہیں جانتیں آپ مجھے کتنی عزیز ہو گئی ہیں اور میں شاید آپ سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

اپنی بات کہہ کر وہ رکا نہیں تھا اور تیزی سے لان کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اریب فاطمہ کی خوف زدہ آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ یوں ہی گیٹ سے ٹیک لگائے ایبک کی پشت پر نگاہیں جمائے اسے جاتے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ یہ ایبک فلک شاہ ابھی ابھی کیا کہہ گیا تھا۔

"نہیں..... شاید اس کے کانوں نے غلط سنا تھا۔

"بھلا یہ کیسے.....؟"

اور اس کی خشک آنکھیں ایک بار پھر بہنے لگی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نظیر فاطمہ



آفس سے واپسی پر میں گیٹ کھول کر گھر میں داخل ہوئی تو مجھے عجیب سی سوگواری کا احساس ہوا۔ سامنے برآمدے میں امی جی اور بھابھی بیٹھی نظر آئیں' جو غیر معمولی طور پر بہت خاموش اور اداس تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا اور ان سے پوچھا۔

"سب خیریت ہے؟" امی جی نے سر کے اشارے سے سب ٹھیک ہونے کا اشارہ کیا۔ میں ان کے رویے پر الجھتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میری چھوٹی بہن ہانی کچن میں مصروف تھی۔ میں نے کپڑے بدلے اور ہاتھ منہ دھو کر ہانی کے پاس کچن میں چلی آئی۔ وہ بھی تھوڑی پریشان تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

"ثانیہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔" ثانیہ میرے پھوپھی زاد سلیم بھائی کی سب سے بڑی بیٹی ہے۔

"کیا؟"

میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ وہ کہنے لگی۔

"تھوڑی دیر پہلے سلیم بھائی نے تایا جان کو فون کر کے بتایا ہے۔"

میں فوراً" امی کے پاس آئی۔ انہوں نے بتایا کہ ثانیہ عیدالاضحیٰ کے تیسرے دن رات کے وقت گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اپنے پیچھے خط چھوڑ گئی کہ وہ اپنی مرضی سے جارہی ہے۔ اسے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ سن کر مجھے فوراً" مریم بھابھی (ثانیہ کی امی) کا خیال آیا کہ ان بے چاری کا کیا حال ہوگا۔ میں نے امی سے کہا کہ ہم اتوار کو مریم بھابھی سے ملنے جائیں گے۔

اتوار کو میں اور امی سلیم بھائی کی طرف آئے۔ اس وقت گھر میں پھوپھو' مریم بھابھی اور ان کی تین بچیاں تھیں۔ بھابھی نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود چائے کا انتظام کرنے باہر چلی گئیں۔ میں اور امی مریم بھابھی کے چہرے پر پھیلا سکون دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پانچ دن سے ان کی بچی گھر سے غائب تھی اور وہ اتنی پرسکون تھیں۔ امی پھوپھو سے باتیں کرنے لگیں تو میں چپکے سے اٹھ کر کچن میں چلی آئی' جہاں مریم بھابھی چائے بنا رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں ان سے کن لفظوں میں افسوس کروں۔ مجھے چپ دیکھ کر مریم بھابھی نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگیں۔

"زہرہ! کیا بات ہے؟ ثانیہ کے گھر سے چلے جانے کی وجہ سے پریشان ہو؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ثانیہ کو میں نے خود گھر سے بھگایا ہے۔"

انہوں نے میرے سر پر جیسے بم پھوڑا تھا۔ میرے اردگرد دھماکے ہونے لگے۔ میں نے ان کو حیرت اور پریشانی سے دیکھا تو وہ مسکرانے لگیں اور بولیں۔

"جاننا چاہتی ہو نا کیوں؟ تو سنو! میں صرف تمہیں یہ سب بتاؤں گی کیونکہ مجھے معلوم ہے تم یہ بات صرف اپنے تک محدود رکھو گی۔ یہ سب میں نے سلیم سے بدلہ لینے کے لیے کیا ہے۔ سلیم کا میرے ساتھ جو رویہ ہے' وہ پورا خاندان جانتا ہے۔ بائیس سال پہلے جب میں اس گھر میں بیاہ کر آئی تو جذبوں اور امنگوں سے بھری ہوئی ایک لڑکی تھی لیکن سلیم نے کیا کیا...؟ مجھے ہر لمحہ کانٹوں پر گھسیٹا۔ انہوں نے کبھی مجھے کوئی مان یا

محبت نہیں دی۔ میری عزت کرنا تو درکنار' مجھے عزت سے بلانا بھی گوارا نہیں کیا۔ صبح اٹھتے ہی ان کی گالیوں' کوسنوں اور طعنوں کی آواز میرے کانوں میں پڑتی اور رات کو سوتے ہوئے بھی جو آخری بات میرے کان سنتے' وہ ان کی طرف سے دی جانے والی کوئی گالی یا طنز ہی ہوتا۔

بعض اوقات تو وہ ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان کے خاندان میں بیٹے زیادہ ہیں اور یہ لوگ اس چیز پر بہت فخر کرتے ہیں۔ لیکن میرے ہاں اوپر تلے چار بیٹیاں پیدا ہوئیں تو یہ بھی میرا قصور ٹھہرا۔ مجھے اس جرم کی پاداش میں دن رات تمہارے پھوپھا اور سلیم کے طعنے سننے پڑتے۔ گالم گلوچ کرتے ہوئے انہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ آس پاس کوئی مہمان بھی موجود ہے۔ ہر وقت اپنے خاندان کی عزت اور شرافت کا راگ الاپنے والے سلیم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ جس طرح کی زبان وہ استعمال کرتے ہیں' اس سے ان کے خاندان کی کتنی شرافت ظاہر ہوتی ہے۔

سلیم نے ہمیشہ مجھے اور میرے خاندان کو گھٹیا اور ذلیل سمجھا۔ میں بائیس سال سے یہ سب برداشت کرتی رہی اور تنہا سے تنہا ہوتی گئی۔ لیکن سلیم کو کبھی اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ میں بھی ایک جیتا جاگتا انسان ہوں۔ مجھے بھی ناقابل برداشت باتوں اور رویوں سے تکلیف ہوتی ہے۔ میں شاید تاحیات یہ سب برداشت کرتی رہتی' لیکن پھر یوں ہوا کہ میرا صبر جواب دے گیا...

ثانیہ بی اے کے پیپر دے کر فارغ تھی۔ اس کی ایک کلاس فیلو حرا تھی' جس کا تعلق سرگودھا سے تھا۔ حرا کا بھائی وقار یہاں ملازمت کرتا تھا اور حرا پڑھائی کی غرض سے اس کے پاس مقیم تھی۔ یہ لوگ یہاں کرائے پر رہتے تھے۔ ایک دن حرا کی امی اپنے بیٹے وقار کا رشتہ لے کر ہمارے گھر آئیں۔ میں اس گھر میں اپنی حیثیت سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔ لہٰذا میں نے انہیں ٹال دیا' لیکن تقریباً" ایک ماہ بعد وہ خاتون دوبارہ ہمارے گھر آگئیں۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ سلیم گھر پر تھے۔ ان خاتون نے اپنا

سوال دوہرایا تو سلیم نے ان کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر مجھے اور میرے خاندان کو گولیاں اور کوسنے دینا شروع کر دیے۔ اس وقت میرا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ وہ خاتون شرمندہ ہو کر واپس چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد سلیم نے مجھے اور ثانیہ دونوں کو مارا پیٹا اور الزام لگایا کہ ثانیہ کا اس لڑکے کے ساتھ چکر تھا اور میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

یہ الزام میری بیٹی سہہ نہیں سکی اور اس نے خود کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ سلیم نے اپنے بھائی کو فون کیا اور ان سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے سے ثانیہ کا نکاح کر دیں۔ ان کا بیٹا آوارہ' بد مزاج اور بے کار تھا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ساری دنیا کو آگ لگا دوں اور ہر چیز کو تہس نہس کر دوں۔ میں نے اس گھر میں جیسی زندگی گزاری تھی' ویسی ہی زندگی میری بیٹی کا مقدر بننے جا رہی تھی۔

اس روز پہلی دفعہ میرے اندر سلیم سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوا۔ میں نے وقار کو فون کیا اور اس کے سامنے ساری صورت حال رکھ کر کہا کہ "اگر میری بیٹی اسے دو کپڑوں میں قبول ہے تو میں اس رشتے پر راضی ہوں۔"

کچھ دنوں کی سوچ بچار کے بعد وقار نے اپنی رضا مندی دے دی کیونکہ وہ ثانیہ کو چاہتا تھا۔

ایک دن میں ثانیہ کو لے کر وقار کے گھر گئی۔ اس نے نکاح کا سارا انتظام کر رکھا تھا۔ تھوڑی دیر میں وقار اور ثانیہ کا نکاح ہو گیا اور ہم دونوں ماں بیٹی گھر واپس آ گئیں۔ میں نے اس بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔

سلیم نے اپنے بھائی کو نکاح کی تاریخ دے دی تھی۔ وہ لوگ نکاح سے ایک روز پہلے ہمارے ہاں پہنچنے والے تھے۔ جس روز ان لوگوں کو ہمارے ہاں پہنچنا تھا' میں نے وقار کو فون کیا کہ وہ اپنی امانت لے جائے۔ وہ آیا اور میں نے ان کے آنے سے پہلے اپنی بیٹی کو رخصت کر دیا۔ جب وہ لوگ ہمارے ہاں پہنچے تو میں نے شور مچا دیا کہ ثانیہ گھر سے بھاگ گئی ہے اور ساتھ ہی انہیں اس کے ہاتھ سے لکھا ہوا خط بھی دکھا دیا۔

سلیم نے مجھے بالوں سے پکڑ لیا اور بہت مارا لیکن میں نے زبان نہیں کھولی۔ تھک ہار کر وہ ثانیہ کو ڈھونڈنے نکلے' لیکن ابھی تک انہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ وقار' ثانیہ کو لے کر سرگودھا چلا گیا ہے۔

سلیم کے جھکے ہوئے کندھے اور اس کا شکست خوردہ رویہ دیکھ کر میں بہت سکون محسوس کرتی ہوں اور یہ سوچ کر خوش ہوتی ہوں کہ اب سلیم کو محسوس ہوتا ہو گا کہ بے عزتی کسے کہتے ہیں۔ جب لوگ اسے کہتے ہوں گے کہ اس کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے۔ اب سلیم اپنے خاندان کی شرافت کے قصے نہیں سنا سکے گا اور نہ ہی میرے خاندان کو نیچ اور گھٹیا کہہ سکے گا۔"

میں حیرت اور دکھ کی زیادتی سے بھابھی کو دیکھ کر رہ گئی۔ میری زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ وہ آرام سے کہہ کر چائے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ میں خاموشی سے اٹھ کر امی جی اور پھوپھو کے پاس جا کر بیٹھ گئی پھر چائے پی کر میں اور امی گھر واپس آ گئے۔ امی ابھی تک ثانیہ کے اس فعل پر افسوس کر رہی تھیں جبکہ میرا دل حقیقت جان کر بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ مجھے خود بھی سلیم بھائی کا رویہ اور بولنے کا انداز کبھی بھی پسند نہیں رہا لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ مریم بھابھی نے سلیم بھائی سے یہ کیسا انتقام لیا ہے کہ انہیں یہ احساس ہی نہیں کہ وہ نہ صرف اپنی ایک بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے غیروں کے حوالے کر چکی ہیں بلکہ باقی تین بیٹیوں کا مستقبل بھی تاریک کر چکی ہیں۔ نہ جانے وقار کے گھر والوں نے ثانیہ کو قبول کیا ہو گا یا نہیں۔ انہوں نے سلیم بھائی سے انتقام لیتے وقت صرف ایک عورت بن کر سوچا۔ ان کے انتقام لینے کا یہ جذبہ اتنا طاقت ور تھا کہ انہوں نے اپنی ممتا کو بھلا دیا اور نادانستگی میں اپنی ہی بچیوں کو نقصان پہنچا دیا۔ جب ان کے انتقام کا جذبہ ٹھنڈا ہو گا اور ان کی سوئی ہوئی ممتا جاگے گی تو نہ جانے وہ اپنے آپ کو کس دلیل سے مطمئن کریں گی۔

ستمبر کی یاد میں

اور تو کچھ یاد نہیں بس اتنا یاد ہے
اس سال بہار ستمبر کے مہینے تک آگئی تھی
اُس نے پوچھا
افتخار تم یہ نظمیں ادھوری کیوں چھوڑ دیتے ہو
اب اُسے کون بتاتا کہ ادھوری نظمیں اور ادھوری کہانیاں
اور ادھورے خواب
یہی تو شاعر کا سرمایہ ہوتے ہیں
پورے ہو جائیں تو دل اندر سے خالی ہو جاتا ہے
پھر دُھوپ ہی دُھوپ میں اتنی برف پڑی
کہ بہت اونچا
اُڑنے والے پرندے کے پر اس کا تابوت
بن گئے
اور تو کچھ یاد نہیں بس اتنا یاد ہے
اس سال بہار ستمبر کے مہینے تک آگئی تھی

افتخار عارف

عشق و مستی کی جب بھی کوئی بات نکلی، سدا چُپ رہا
تذکرے جب بھی اہلِ وفا کے ہوئے، فلسفہ چُپ رہا

طاق زنداں میں ضوپاشیوں کے لیے تیار تھے
جب سرِ راہ جلنے کی بات آئی تو ہر دیا چُپ رہا

رات دن کچھ مسافر یہاں سے کہیں اور جاتے تو ہیں
وہ گئے کون سی منزلوں کی طرف، نقشِ پا چُپ رہا

نام مقتول و قاتل کا سارے قبیلے کو معلوم تھا
کس لیے خون ناحق بہایا گیا، خوں بہا چُپ رہا

جانے کیوں وہ جواز اپنے افعال کا پیش کرتا نہیں
لاکھ ترکِ تعلق کا پوچھا سبب، بے وفا چُپ رہا

بے تکلف نہیں ہو سکا، مجھ سے شاہین چہرہ مرا
جب بھی نظریں ملیں، دوستانہ ہنسی ہنس دیا چُپ رہا

حمیدہ شاہین

تضاد

(موجودہ حالات کے بارے میں)

میرے شہر کی سڑکیں خون سے تر ہیں
ایسے میں، میں
تیرے گالوں کی سرخی کا ذکر کیسے کروں؟
میں کیسے، تیرے چاند چہرے کے
قصیدے لکھوں
جب میرے چاروں طرف
اداسی چھائی ہو، دل بوجھل ہو
میں زرد گلابوں کی بستی میں ہوں
میرے ارد گرد پھیلے تاحدِ نظر زرد گلاب ہیں
جب ان کے اداس چہروں پہ کرب کی چادر
ان کی مایوس آنکھوں سے ٹپکتے ان گنت
سوال دیکھتا ہوں تو
میں تیرے لہجے کی کھنک
تیری شوخ ادائیں بھول جاتا ہوں
تیرے ہونٹوں کے جام بہت پھیکے لگنے لگتے ہیں
جب میں فقیران بستی کو بوند بوند ترستے دیکھتا ہوں تو
تیری وہ میٹھی باتیں، جو کبھی
میرے کانوں میں رس گھولتی تھیں
اب وہ دور کہیں
ان کی چیخ و پکار میں دبتی جا رہی ہیں
اور اب تو بارود آلودہ فضاؤں نے
تیری سانسوں کی مہک بھی بہت مدھم کر دی ہے
تیری زلفوں کی نرم چھاؤں کے تقدس کی قسم
میں جب ان بے سروسائبان، بے سروسامانی میں
پڑے ہوئے لوگوں کو دیکھتا ہوں
تو میں سوچتا ہوں کہ
کہاں ان کے داغ داغ جسموں پہ تار تار چیتھڑے
کہاں تیرے خوشنما بدن پہ سجی یہ زرق برق قبائیں
تو اس قدر شاد، وہ اس قدر برباد کیوں ہیں؟
اگر ایک ہی بستی کے مکین ہیں
تو پھر آپس میں تضاد کیوں ہیں؟

وقاص ہاشمی



اک اک نقش مٹا سکتے تھے، مشکل کیا تھی؟
ہم اسے دل سے بھلا سکتے تھے، مشکل کیا تھی؟

ہم نے چاہا ہی نہیں چین سے رہنا ورنہ
دشت گلزار بنا سکتے تھے، مشکل کیا تھی؟

جو دیا ہم نے جلایا ہے، جلا کر خود کو
وہ دیا تم بھی جلا سکتے تھے، مشکل کیا تھی؟

ٹھیک ہے، ہم سے کوئی دوست بنایا نہ گیا
ایک دشمن تو بنا سکتے تھے، مشکل کیا تھی

کب سے سامانِ سفر باندھ کے بیٹھے ہوئے تھے
ہم تمہیں چھوڑ کے جا سکتے تھے، مشکل کیا تھی؟

اظہر عباس

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے بازو میں پیتل (یا تانبے) کا ایک کڑا دیکھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا۔

"یہ کیا ہے؟"

اس نے بتایا "یہ ایک بیماری کی وجہ سے (پہن رکھا) ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس سے تمہاری کمزوری (بیماری) میں مزید اضافہ ہی ہوگا۔ اسے اتار کر پھینکو۔ اگر تم اس حال میں مر گئے کہ یہ تمہارے ہاتھ میں ہو تو تم کبھی کامیاب نہ ہو گے۔"

(مسند احمد بن حنبل - 2042)

سگنل،

ایک خاتون کار چلا رہی تھیں کہ پیچھے سے ایک کار آکر ان کی کار سے ٹکرا گئی۔ خاتون غصے سے لال پیلی ہو کر بولیں کہ "انہوں نے باقاعدہ سگنل دیا تھا پھر ان کی کار کو ٹکر کیوں ماری گئی؟"

"محترمہ! آپ کا ہاتھ پہلے اوپر کی طرف اٹھا پھر نیچے گر گیا۔ اس کے بعد سیدھا ہو گیا اور پھر گھوم گیا۔ کیا ان حرکتوں سے آپ کی مراد سگنل دینا ہے؟"

ٹکر مارنے والی کار کے مالک نے کہا۔

"اوہ میرے خدا!" خاتون بولیں۔ "پہلے تین سگنل غلط تھے۔ کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ میں نے انہیں رد کر دیا تھا؟"

بینا صدیقی - کورنگی کراچی

کنجوسی،

اسکاٹ لینڈ کے باشندے اپنی کنجوسی کی وجہ سے عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا نام سنتے ہی ذہن میں "چمڑی جائے، دمڑی نہ جائے" والی صفت یاد آجاتی ہے۔ کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا کہ اسکاٹ کچھ خرچ بھی کر سکتے ہیں۔

پچھلے دنوں تین اسکاٹ ایک چرچ میں گئے۔ جب چندے کی پلیٹ ان کے سامنے آئی تو ایک اسکاٹ نے آہ بھر کر کہا۔

"برے پھنسے۔" اور بے ہوش ہو گیا۔

اس کے دونوں ساتھی اسے اٹھا کر طبی امداد کے لیے باہر لے گئے۔

افشاں فرقان - سخی حسن

جمہوری،

ڈاکٹر صاحب! جلدی آئیے۔ اسکور نے فاؤنٹین پین نگل لیا ہے۔"

"میں آرہا ہوں مگر یہ بتائیے آپ اس دوران کیا کر رہے ہیں؟"

"یقیناً پنسل ہی استعمال کرنی پڑے گی۔"

جویریہ وہاب - ملتان

بچھڑنے اور ملنے کا دکھ،

دکھ صرف بچھڑنے کا نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی کسی سے ملنے کا بھی ہوتا ہے۔ جب کوئی بہت پرانا ہمدم ساتھی برسوں بعد لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں سرد مہری سجا کر ملے تو یہ ضرور ماپنا کہ اس دوست سے بچھڑنے کا دکھ زیادہ تھا۔ یا ملنے کا۔

فوزیہ ثمر بٹ - گجرات

انمول راز،

- لوگ کہتے ہیں۔ کسی سے بھی کسی بھی چیز کی واپسی کی توقع مت رکھو، لیکن سچ یہ ہے کہ جب ہم کسی سے سچی محبت کرتے ہیں تو قدرتی طور پر ہم ان سے تھوڑی سی محبت، خیال اور اخلاص کی امید یا توقع رکھ لیتے ہیں۔
- اکیلے رہنا زیادہ بہتر ہے بجائے اس کے کہ کسی منافق کے ساتھ رہیں جو آپ سے نفرت کرتا ہو مگر ظاہر یہ کرے کہ وہ آپ سے بہت محبت کرتا ہے۔
- اچھے اور بہتر لوگوں کا ساتھ ایک پرفیوم کی دکان کی طرح ہوتا ہے۔ بے شک آپ اس کو خریدیں یا نہیں لیکن آپ کو بہت سی خوشبو مل جاتی ہے۔

فریحہ شبیر - شاہ نکڈر

عجیب مخلوق،

انسان عجب مخلوق ہے۔ خود تماشا ہے اور خود ہی تماشائی۔ انسان خود ہی میلہ لگاتا ہے اور خود ہی میلہ دیکھنے نکلتا ہے۔ ہجوم میں ہر انسان، ہجوم کا حصہ ہے اور ہر انسان اپنے علاوہ انسانوں کو ہجوم کہتا ہے۔ تنہائیاں اکٹھی ہو جائیں تو میلے بن جاتے ہیں۔ ننھے چراغ مل کر چراغاں بن جاتے ہیں۔

(واصف علی واصف)

زنیرہ، رخشندہ - جھنگ چونڈرہ

موتی مالا،

- سلامتی اور عافیت گمنامی میں ہے یا خلوت میں۔
- آخرت کے حساب کو برحق سمجھنے والے کا مال جمع کرنا تعجب خیز ہے۔
- صدقہ ہزاروں امکانی مصائب و آفات کا علاج ہے۔
- مشورہ لینا بری بات نہیں مگر اس پر بلا غور و تامل عمل کرنا برا ہے۔
- ہمیشہ حق بات کہو چاہے وہ تمہارے خلاف پڑے۔
- طمع کرنا مفلسی ہے، بے غرض ہونا تونگری اور بدلہ نہ چاہنا صبر ہے۔

کوثر خالد - جڑانوالہ

نکتہ ریزی،

- دوسروں کو ناکام بنانے کی کوشش، خود ہمیں ناکام بنا دیتی ہے۔ (ایمرسن)
- جو شخص یہ مان لے کہ وہ بے وقوف ہے، وہ دنیا کا سب سے عقل مند انسان ہے۔ لیکن جو بے وقوف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بے وقوفی سے لاعلم بھی رہے، وہ دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف ہے۔ (سقراط)
- سچی خوشی، جسمانی قوت اور دولت سے میسر نہیں آتی بلکہ اس کا راز سمجھ کی پختگی اور اعلا کردار میں پوشیدہ ہے۔ (ڈیموکریٹس)
- مہمان کے آگے تھوڑا کھانا رکھنا بے مروتی اور حد سے زیادہ رکھنا تکبر ہے۔ (امام غزالی)

ثمرہ، اقراء - کراچی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ "یہ تو تمہاری اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ تم نے جہاد میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تم سب اللہ کے غضب میں آگئے اور چالیس سال سے یہاں بھٹک رہے ہو۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ان کو راستہ ملا۔

کل اور آج،

ایک زمانے میں ہم قد آدم آئینوں میں اپنے آپ کو ٹھہر کر دیکھتے تھے اور اب آنکھ چرا کے چپکے سے نکل جاتے ہیں۔ ہم جب خوش شکل تھے تو نرگسیت پسند ہونے کے طعنوں کے باوجود کہتے تھے کہ ہاں ہم خوش شکل ہیں اور اب اگر بدشکل ہو چکے ہیں تو بھی اقرار کرتے ہیں۔

(مستنصر حسین تارڑ)

سفینہ اقبال - کورنگی

غلط انتساب

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

یہ شعر عام طور پر علامہ اقبال کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، مگر یہ شعر علامہ اقبال کا نہیں، بلکہ شکر گڑھ ضلع نارووال سے تعلق رکھنے والے ایک شاعر سیّد صادق حسین کاظمی کا ہے۔ سیّد صادق حسین کاظمی یکم اکتوبر 1898ء کو کشمیر کے ایک موضع کھادر یاڑا میں پیدا ہوئے تھے۔ 1915ء میں ان کا خاندان ہجرت کر کے ظفر وال، سیالکوٹ میں آباد ہو گیا۔ سیّد صادق حسین کاظمی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز درس و تدریس کے پیشے سے کیا تھا مگر پھر 1927ء میں وکالت کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ 1930ء میں وہ شکر گڑھ منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے بقیہ زندگی بسر کی۔

سیّد صادق حسین کاظمی شاعری میں علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی ظفر علی خان سے بے حد متاثر تھے۔ اور انہی کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ 1918ء کے لگ بھگ انہوں نے ایک غزل لکھی جس کا مطلع تھا۔

تو سمجھتا ہے حوادث ہیں ستانے کے لیے
یہ ہوا کرتے ہیں ظاہر کو آزمانے کے لیے

جبکہ دوسرا شعر تھا

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

یہ غزل 1918ء ہی میں لاہور کے ایک اخبار روزنامہ "آفتاب" میں شائع ہوئی تھی۔ سیّد صادق حسین کاظمی کا مجموعۂ کلام 1977ء میں "برگ سبز" کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں مندرجہ بالا غزل بھی شامل تھی۔ انہوں نے 4 مئی 1989ء کو اسلام آباد میں وفات پائی اور اسلام آباد کے مرکزی قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

سفینہ اقبال۔ کورنگی

جہاد سے منہ موڑنے کی سزا

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ میں تم کو ملک شام کا وارث بناؤں گا۔ جہاں تم سب اطمینان سے زندگی بسر کر سکو گے لیکن شرط یہ ہے کہ اس سرزمین کو حاصل کرنے کے لیے جہاد کرنا پڑے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ خوش خبری اپنی قوم کو سنائی۔ بنی اسرائیل اس بات سے خوش تو تھے لیکن جہاد کے لیے دل سے تیار نہ تھے۔

حضرت موسیٰ اپنی قوم لے کر کنعان پہنچے اور وہاں جا کر انہیں جہاد کے لیے تربیت دینے لگے۔

لیکن بنی اسرائیل لڑنے کے نام سے خوفزدہ تھے۔ انہوں نے کہا "شام کے باشندے طاقت ور اور موٹے تازے ہیں ہم ان زور آوروں سے نہیں لڑ سکتے۔"

حضرت موسیٰ نے انہیں بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانے اور کہا۔

"اے موسیٰ تم اور تمہارا خدا جا کر لڑے، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔"

حضرت موسیٰ نے اللہ سے دعا کی۔

"اے اللہ! مجھے اور میرے بھائی ہارون کو ان سے علیحدہ کر دے۔"

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول کی اور فرمایا۔

"بنی اسرائیل چالیس سال تک اسی بیابان میں بھٹکتے رہیں گے۔ انہیں یہاں سے نکلنے کا راستہ نہیں ملے گا۔"

حضرت موسیٰ اپنی قوم سے علیحدہ ہو کر شام روانہ ہو گئے۔ بنی اسرائیل ان کے جانے کے بعد طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ مصر واپس چلے جائیں۔ وہ مصر جانے کے لیے کچھ فاصلہ طے کرتے لیکن گھوم پھر کر اسی جگہ پہنچ جاتے جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔ بھوک و پیاس نے اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔ نہ کھانا تھا نہ پانی۔ جب موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام شام سے لوٹے تو ان کو تباہ حال پایا۔ قوم نے ان سے فریاد کی۔



امت الصبور

حاشیوں کی ڈائری

رابعہ رشید

لکھے ڈائری سے

انفرادی محبت کے مرکزی نقطے سے جہاں کائنات کی طرف تمام سمتوں میں سفر شروع ہوتا ہے وہاں اندر کی طرف بھی پیش رفت ہوتی ہے لیکن باہر کے سفر کے برعکس اندر کا سفر دشتِ تنہائی کا سفر ہے۔ دسمبر تو ہمیشہ سے ہی بہت اداس سا کر دیتا ہے۔ میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی "ایک دن" تمام بہنوں کے لیے۔

آخری چند دن دسمبر کے\
ہر برس ہی گراں گزرتے ہیں\
خواہشوں کے نگار خانے سے\
کیسے کیسے گماں گزرتے ہیں\
رفتگاں کے بکھرے سایوں کی\
ایک محفل سی دل میں سجتی ہے\
فون کی ڈائری کے صفحوں سے\
کتنے نمبر پکارتے ہیں مجھے\
جن سے مربوط بے نوا گھنٹی\
اب فقط میرے دل میں بجتی ہے\
کس قدر پیارے پیارے ناموں پر\
رینگتی بدنما لکیریں سی\
میری آنکھوں میں پھیل جاتی ہیں\
دوریاں دائرے بناتی ہیں\
دھیان کی سیڑھیوں پہ کیا کیا عکس\
مشعلیں درد کی جلاتے ہیں\
نام جو کٹ گئے ہیں ان کے حرف\
ایسے کاغذ پہ پھیل جاتے ہیں\
حادثے کے مقام پر جیسے\
خون کے سوکھتے نشانوں پر\
چاک سے لائنیں لگاتے\
پھر دسمبر کے آخری دن ہیں\
ہر برس کی طرح سے اب کے بھی\
ڈائری سوال کرتی ہے\
کیا خبر اس برس کے آخر تک\
میرے ان بے چراغ صفحوں سے\
کتنے ہی نام کٹ گئے ہوں گے\
خاک کی ڈھیریوں کے دامن میں\
کتنے طوفان سمٹ گئے ہوں گے\
ہر دسمبر میں سوچتا ہوں میں\
ایک دن اس طرح بھی ہونا ہے\
رنگ کو روشنی میں کھونا ہے\
اپنے اپنے گھروں میں رکھی ہوئی\
ڈائری دوست دیکھتے ہوں گے!\
ان کی آنکھوں کے خاکدانوں میں\
ایک صحرا سا پھیلتا ہو گا\
اور کچھ بے نشان صفحوں سے\
نام میرا بھی کٹ گیا ہو گا

میری بیاض سے

فوزیہ سید ________ سلانوالی

کیا ملا ہم کو، یہ نہیں معلوم
واقعہ یہ ہے، جان ہاری ہے
اک دو پل نثار کیا کرتے
ان پہ قربان عمر ساری ہے

رباب طاہر ________ ٹیکسلا

درخت کاٹ کے سایہ فروخت کرتے ہیں
اور اس کے بعد کڑی دھوپ سے گزرتے ہیں
ہمیں خود اپنے مسائل پہ غور کرنا ہے
کہ روز روز صحیفے نہیں اترتے ہیں

نفیسہ اکرم ________ گاؤں سلیاں شریف

روز و شب جو بھی ملے ہم کو، نرالے ہی ملے
نہ کٹی رات ستم کی، نہ اُجالے ہی ملے
یہ وطن ایسا شجر ہے کہ ظفر جس کو
بیشتر لوگ جڑیں کاٹنے والے ہی ملے

عطیہ صدیقی ________ نامعلوم شہر

میں اپنی ماں کی کہانی کو تب سمجھ پائی
جب اس کے لفظ مقدر نے مجھ پہ دُہرائے

اقرأ اکرم ________ گاؤں سلیاں شریف

کاروبارِ عشق میں ایسے بھی سودے ہیں جہاں
فائدوں کے گوشوارے اور خسارے ہیچ ہیں
ہے کہیں کوئی تعلق اور ہی انداز کا
جس کے آگے سب کے سب رشتے ہمارے ہیچ ہیں

سیدہ صائمہ سرفراز ________ ناریتھ کراچی

میں کیوں نہ ایک ہی قطرے سے سیر ہو جاؤں
کسی کی پیاس کو دریا کبھی ملا بھی ہے
میں اس چراغ کو دشمن کی صف میں کیوں رکھوں
یہ میرے نام پہ کچھ دیر کو جلا بھی ہے

نوشین اقبال نوشی ________ گاؤں بدرمرجان

خواب میں جس سے پریشان تھے ہم
آنکھ کھولی تو وہی نقشہ ہے

صومیہ ________ ہری پور

جنگ لڑنی پڑتی ہے اپنے زورِ بازو پہ
زندگی کے میدان میں معجزے نہیں ہوتے

عالیہ بتول ________ حویلی بہادر شاہ

پلکوں پہ چراغوں کو سنبھالے ہوئے اٹھنا
اس ہجر کے موسم کی ہوا تیز بہت ہے

آمنہ اُجالا ________ ڈہرکی

سب نے ملائے ہاتھ یہاں تیرگی کے ساتھ
کتنا بڑا مذاق ہوا روشنی کے ساتھ

سویٹھ ساند ________ روحل والی گاؤں

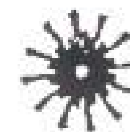
کہاں کہاں پہ لُٹے ہو شمار مت کرنا
مگر کسی پہ بھی اب اعتبار مت کرنا
میں لوٹنے کے ارادے سے جا رہا ہوں مگر
سفر سفر ہے میرا انتظار مت کرنا

عالیہ بتول ________ حویلی بہادر شاہ

یہ کس نے ہم سے لہو کا خراج پھر مانگا
ابھی تو سوئے تھے مقتل کو سرخرو کرکے

نورین ضیاء ________ سادوکی گجرات

ہے تعلق تو ایک سادہ لفظ
پھر جو بھی ہے وہ نباہ میں ہے
کب سے میں نے پلک نہیں جھپکی
کوئی امجد میری نگاہ میں ہے



روشن حرف وہ سارے

عروج انجم

1 ایسا تو نہیں ہے کہ ایک ہی شعر لبوں پر رہے۔ بلکہ مختلف مواقع پہ مختلف اشعار ذہن میں آتے ہیں۔ اسٹوڈنٹ لائف میں ہاسٹل لائف کا اپنا ہی مزا ہے۔ پیاری اور عزیز از جان دوستوں سے روٹھنے منانے کے سلسلے میں اکثر یہ کہا کرتی تھی۔

ہم نہ ہوں گے تو کون منائے گا تمہیں
یہ بری بات ہے، ہر بات پہ روٹھا نہ کرو

اور آج جب وہ حسین دن خواب ہوگئے ہیں تو دل میں کسک لیے لبوں پر اکثر یہ تلخ حقیقت آجاتی ہے۔

پھر یوں ہوا کہ ساتھ تیرا چھوڑنا پڑا
ثابت ہوا کہ لازم و ملزوم کچھ نہیں

(2) اگر صرف ایک ہی شاعر کو پسندیدہ کہہ دوں تو تشنگی رہ جائے گی۔ اقبال، غالب، مومن، میر، درد سب سے شناسائی رہی لیکن ابن انشاء سے میں اس وقت سے متاثر ہوں جب فرسٹ ایر میں خوب صورت اور طرح دار ٹیچر میڈم عنبرین۔ احبہ (پوسٹ گریجویٹ کالج فار ویمن سرگودھا) نے بہت دلربائی سے یہ شعر سنایا۔

چاند کسی کا ہو نہیں سکتا، چاند کسی کا ہوتا ہے؟
چاند کی خاطر ضد نہیں کرتے اے میرے اچھے انشا چاند

(3) ہاسٹل میں ایک بار میں نے ملٹی کلر کا سوٹ پہنا تو ایک روم میٹ نے دیکھتے ہی کہا۔

ے وہ سراپا بہاروں کا شجر لگتی ہے

اور میری عزیز از جان دوست نے ایم ایس سی کے بعد میرے اِن شکوے پر کہ "اب بھول نہ جانا" کے جواب میں بے ساختہ کہا تھا۔

میں اور اس کو بھولوں ناصر کیسی باتیں کرتے ہو
صورت تو پھر صورت ہے، وہ نام بھی پیارا لگتا ہے

(4) گائیکی کی وجہ سے میری پسندیدہ ہے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

وہ تیرا پردے کا کونا کھینچنا دفعتاً
وہ دوپٹے سے تیرا منہ کو چھپانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

بے رخی کے ساتھ سننا دردِ دل کی داستاں
وہ کلائی میں تیرا کنگن گھمانا یاد ہے

وقتِ رخصت الوداع کا لفظ کہنے کے لیے
وہ تیرے سوکھے لبوں کا تھرتھرانا یاد ہے

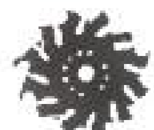
(5) کلاسیکی شاعری میں میرا انتخاب مومن خان مومن کی غزل کے چند اشعار ہیں۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر، وہ کرم کہ تھا میرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے جو سب میں روبرو تو اشارتوں سے ہی گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم کو بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو



نادرہ خاتون

ہمارے خط



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

وثیقہ زمرد... 440 فیض پور

نومبر کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ گوہ گراں تھے ہم بہت اچھا جا رہا ہے۔ جو بچے ہیں سنگ کی آخری قسط زبردست تھی اتنا اچھا لکھنے پر فرحت اشتیاق کو بہت بہت مبارک ہو۔ "خوشیوں کا اعلان" بھی بہت اچھا رہا لیکن اس ماہ کی بیسٹ کہانی "زمین کے آنسو" تھی۔ پڑھ کر بے اختیار رونا آیا جب حسن رضا احمد کو گھر سے نکالتے ہیں اور جب عمارہ اپنے بابا جان سے ملتی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے باقی ناولٹ اور افسانے زبردست تھے۔ غزلیں رنگا رنگ پھول میری بیاض سے پکوان اچھے تھے۔

ج : پیاری وثیقہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ معذرت کے ساتھ آپ نے جو شاعری بھجوائی ہے۔ وہ قابل اشاعت نہیں ہے۔ کسی اچھے شاعر کی نظمیں غزلیں انتخاب کر کے بھجوائیں۔

سمیعہ خالد مغل... احمد آباد نارووال

اس دفعہ کا ٹائٹل بہت ہی پیارا تھا۔ "کرن کرن روشنی" بہت اچھا ہے۔ سب سے اچھا افسانہ "محبت کہانی" لگا۔ اس لیے "سائرہ رضا" کو میری طرف سے سلام اور پیار۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ "ساحر لودھی" کا انٹرویو بھی شائع کریں۔ اگر میں اپنی شاعری افسانے وغیرہ بھیجوں تو کیا شائع ہوں گے۔

ج : پیاری سمیعہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کہانیاں بھجوا دیں۔ قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ ساحر لودھی کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

اسماء نسیم... لاہور کینٹ

فرحت اشتیاق کمال کا لکھتی ہیں۔ "ہم سفر" بھی بہت اچھی تھی لیکن جو بچے ہیں سنگ کی تو بات ہی الگ ہے۔ اور دوسرے نمبر پر ہیں نگہت سیما' مجھے اس میں اریب فاطمہ کا کردار اچھا لگا اب بات ہو جائے "کوہ گراں تھے ہم"۔ بہت ہی اچھا ہے۔ اس میں کھاری کی سادگی' معصومیت بہت اچھی لگتی ہے باجی میں خواتین ڈائجسٹ تب سے پڑھتی ہوں جب پرائمری میں پڑھتی تھی اور اب تو دو بچوں کی اماں جان ہوں۔ میں اتنے عرصے بعد اب خط لکھ رہی ہوں۔ اور میں کچھ اسکیچ بھیج رہی ہوں۔ یہ میری بہن بناتی ہے اس کی خواہش ہے کہ یہ خواتین ڈائجسٹ میں شامل ہوں اور میں کچھ کتابیں منگانا چاہتی ہوں آپ پلیز طریقہ بتا دیں۔

ج : اسماء! آپ جو کتابیں منگوانا چاہتی ہیں۔ اس نمبر پر فون کرلیں آپ کی مطلوبہ کتابوں کی قیمت اور منگوانے کا طریقہ بتا دیں گے۔ 32216361 یا آپ خواتین میں کتابوں کی فہرست دیکھ کر اپنی مطلوبہ کتاب کی قیمت منی آرڈر کردیں تو آپ کو کتاب بھجوا دی جائے گی۔ منی آرڈر اس ایڈریس پر کریں۔

مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی۔

ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی بہن نے جو تصاویر بنائی ہیں، وہ خواتین ڈائجسٹ میں شائع نہیں ہو سکتیں۔

بنت آدم... گوجرہ

السلام علیکم! آپی میں اپنی ایک نظم بھیج رہی ہوں۔ ایک کوشش میں نے گزشتہ ماہ بھی کی تھی۔ برائے مہربانی یہ تو بتا دیں کہ میں لکھنے کی صلاحیت رکھتی ہوں یا نہیں۔

ج : بنت آدم! ہمیں بے حد افسوس ہے آپ کی شاعری قابل اشاعت نہیں۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ لیکن بہت محنت کی ضرورت ہے۔ فی الحال آپ اچھی شاعری کا مطالعہ کریں۔

شبانہ عندلیب... گوجرانوالہ

ملٹی شیڈڈ سرورق بہت اچھا لگا سب سے پہلے اپنا فیورٹ ناول جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو پڑھا۔ زبردست بہت خوب کمال ہی کردیا فرحت جی آپ نے اس بار بھی اپنے سابقہ معیار کو برقرار رکھا بلکہ کچھ اونچا ہی کیا ہے... بہت ہی خوب صورت انداز سے آپ نے لیزا اور سکندر کو ملایا۔ زین کو اپنی غلطی کا احساس اور اس کا معافی مانگنا اور سکندر کا معاف کرنا بہت اچھا لگا اور جس طرح آپ نے ام مریم کو اس کے انجام تک پہنچایا۔ ویل ڈن۔

بس فرحت جی! مجھے آپ سے ایک چھوٹی سی شکایت ہے کہ آپ نے اینڈ میں یہ واضح نہیں کیا کہ سکندر اب مستقل پاکستان رہے گا کہ یا واپس دوبئی میں رہے گا سکندر کا کردار ہمیشہ ذہنوں پر نقش رہے گا۔ یہ آج تک کے آپ کے سب ہیروز سے ہٹ کر اور منفرد ہے۔ پلیز پلیز آپ اب لمبے عرصے کے لیے پھر غائب نہ ہو جایئے گا جلد ہی آپ کا نیا ناول آنا چاہیے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ آپ سے پیار بھری درخواست ہے۔

باقی پرچہ بھی بہت اچھا تھا۔ ایمن طارق سے باتیں اور علی پیر سے انٹرویو بس سو سو تھا۔ نگہت سیما کے ناول پر اختتام تک تبصرہ محفوظ ہے۔ آسیہ رزاقی کا خوشیوں کا اعلان پسند آیا۔ نزہت شبانہ کا ول جلا بس ٹھیک ہی تھا۔

شکر ہے ثمرہ بخاری کو ہماری یاد تو آئی۔ انہیں پڑھ کر بہت اچھا لگا باقی افسانے بھی اچھے تھے۔

البتہ رضیہ بٹ کے افسانے نے بہت اداس کردیا کہ ایسی کہنہ مشق رائٹر اب ہمارے بیچ نہیں ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ انہیں جنت فردوس میں اونچے درجے پر جگہ دے (آمین)

عنیزہ سید کا "کوہ گراں تھے ہم" حسب سابق بہت سی سنجیدگی اور فلسفہ لیے ہوئے تھا۔

آپی آپ کے پرچے میں کرن کرن روشنی مجھے اور میرے سب گھر والوں کو بہت پسند ہے۔ اس سے ہماری دین اسلام کی معلومات میں بیش بہا اضافہ جو ہوتا ہے۔ اور ہمیں اپنی زندگی بہتر طریقے سے اسلامی شعار کے مطابق گزارنے میں مدد ملتی ہے۔

ج : پیاری شبانہ! ہماری بھی دلی خواہش ہے کہ فرحت خواتین کے لیے نیا ناول لکھیں۔ انہوں نے وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ خواتین کے لیے جلد ہی اپنا ناول لکھیں گی۔

آپ کے جذبات ان سطور کے ذریعے فرحت تک پہنچا رہے ہیں۔

انیقہ انا... چکوال

ان دنوں خواتین میں بیک وقت چار چار سلسلہ وار ناول چل رہے ہیں یہ تو زیادتی ہے نا...!! پورے تیس' اکتیس دن انتظار کریں اور پھر سے باقی آئندہ...

"زمین کے آنسو!" کی یہ قسط بھی شاندار رہی...

نگہت سیما نے طویل غیر حاضری کا حق ادا کردیا۔ ان کے اکثر ناولوں کے یک یا دو لفظی عنوان بہت بھاتے ہیں۔ پچھلی بار ہم نے لکھا تھا کہ "ایبک اور رابیل کی جوڑی بنے گی۔ پر اب دل چپکے سے کہتا ہے "ایبک جیسے ابالو کے ساتھ تو اریب فاطمہ ہی جچے گی۔ (اللہ کرے...!!) نگہت جی! احمد رضا نے اس ناول میں بھٹکنا ضرور ہے پر واپسی کا رستہ کھلا رکھیے گا۔

سمیرا حمید کا ناولٹ بھی اچھا لگا۔ انسان کو یقین کامل ہو تو کیا کچھ نہیں ہو جاتا۔ انہونی بھی ہونی بن جاتی ہے۔ اسی یقین پر یقین کی مہر لگاتا تمینہ کا افسانہ "سنہری شامیں" بہت بہت اچھا لگا خصوصاً "یہ جملے۔

"میں مسافر نہیں تھا' میں اجنبی نہیں تھا' مگر تمہاری دعا ضرور تھا اور جب جب دعا محبت کو پکارتی ہے' اسے آنا پڑتا ہے۔ محبت کا دعا سے بہت پرانا رشتہ ہے۔" کتنا خوب صورت لکھا تمینہ نے... واہ واہ!!!

"کوہ گراں تھے ہم..." سعد اور کھاری کے کرداروں میں عجیب سی کشش، اور پراسراریت اور انسیت محسوس

ہوتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے تمام کردار ایک ہی مرکز کے گرد گھوم رہے ہوں اور راہ میں حائل مشکلات کو یاد کرتے ایک دوسرے کے قریب تر آرہے ہوں..... سارہ خان میں در آتی تبدیلی خوش آئند ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

اگرچہ میں نے اب ڈرامے وغیرہ دیکھنا چھوڑ دیے ہیں تاہم اسکول میں کولیگز بات کرتی ہیں تو پتا چلتا رہتا ہے۔ اور اس بات سے ضرور اتفاق کرتی ہوں کہ اکثریت کو ڈرامہ رائٹر کا نام تک معلوم نہیں ہوتا..... صرف ڈرامہ رائٹر پر کیا موقوف میری اکثر کولیگز اگر ڈائجسٹ پڑھتی ہیں تو انہیں ہیرو یا ہیروئن کا نام یاد ہوگا مگر ناول کا عنوان یا مصنفہ کا نام نہیں (ہائے زیادتی.....) اور مجھے یہ بات بہت ناپسند ہے کہ ہم کسی مصنفہ کی تحریر کو تو سراہیں، لیکن ہمیں مصنفہ کا نام تک نہ معلوم ہو۔ آپ بتائیے یہ زیادتی ہے نا.....!

ج : انیقہ! آپ کا شمار ہماری ان پرانی قارئین میں ہوتا ہے جو بڑی باقاعدگی سے خط لکھتی ہیں اور مفصل تبصرہ بھی کرتی ہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے آپ نے خط لکھنا چھوڑ دیا تھا آپ نے جب بھی انتخاب بھجوایا، ہم نے ضرور شائع کیا ہے۔ ڈائری کے لیے آپ اچھا انتخاب بھجوائیں بلکہ صرف ڈائری کے لیے ہی نہیں دوسرے سلسلوں کے لیے بھی انتخاب بھجوائیں اور افسانے بھی۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سیدہ صائمہ سرفراز..... نارتھ کراچی

درخواست ہے کہ پلیز پلیز پاکستان بالخصوص اپنے کراچی (چاہے آپ لاہور میں ہوں یا فیصل آباد، پشاور ہو کہ پسرور، بدین، کھاریاں وغیرہ مگر کراچی بھی آپ سب کا ہے) کے لیے ضرور دعا کریں، معلوم نہیں کس کی نظر لگ گئی اس کی رونق کو۔ ایک نحوست سی چھا گئی۔ پلیز اپنے گھر، اپنے بچوں اپنے لوگوں کو بتائیں کہ ہم نہ تو شیعہ ہیں نہ سنی نہ پنجابی نہ سندھی، بلوچی، پٹھان بلکہ ہم پہلے مسلمان اور پھر پاکستانی ہیں ہم ایک اللہ ایک قرآن کو ماننے والے ہیں تو پھر یہ تفرقہ کیوں؟ پلیز سوچیے اور سمجھیے کہ ہم واقعی ایک ہیں۔

ج : پیاری صائمہ! کراچی کے لیے دعا کرتے ہوئے آپ کا پیغام اپنی قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔

شیعہ، سنی، سندھی، پنجابی، مہاجر، پٹھان کی بات کرنے والے اور قتل و غارت کرنے والے چند ہزار لوگ ہیں۔ پاکستان اور کراچی کے لوگوں کی اکثریت آپ کی طرح ہی سوچتی ہے۔ کچھ لوگ بیرونی اشارے پر دہشت گردی کر کے کراچی سے صنعت کو ختم کرنا چاہتے ہیں تاکہ پاکستان کی معیشت تباہ و برباد ہو جائے، یہاں بے روزگاری پھیلے۔ بھتہ وصولی فیکٹریوں کو آگ لگانا، ٹارگیٹ کلنگ یہ سب حربے صنعت کو تباہ کرنے کے لیے اختیار کیے جا رہے ہیں۔

ظل ہما..... فیصل آباد

سب سے پہلے فرحت اشتیاق کے ناول کی جانب دوڑ لگائی۔ آخری قسط ہونے کی تسلی کر کے پچھلے 12 ماہ کے شمارے نکالے اور پہلی قسط سے آخری قسط تک تسلسل سے ناول ختم کیا۔ زبردست فرحت جی! بہت خوب صورت اختتام کیا۔ "زمین کے آنسو" جب ناول مکمل ہوگا تو ایک ساتھ پڑھوں گی۔ آسیہ رزاقی بھی ایک خوب صورت لکھاری ہیں۔ کافی سلیقہ سکھاتی ہیں ہم جیسے نکموں کو۔ عنیزہ کی تحریر کو سمجھنے کے لیے کافی توجہ سے پڑھنا پڑتا ہے۔ ان کے کردار کافی منفرد ہوتے ہیں۔ ماہ نور اور سعد تو رشتہ دار ہی ہیں، نزہت شبانہ حیدر حالات کی تلخیوں سے حوصلے اور ہمت کے ساتھ نکلنے کا ہنر سکھاتی ہیں۔

میرے خط لکھنے کی وجہ سائرہ رضا کا افسانہ بنا ہے۔ سائرہ! اس حادثے نے ہر حساس انسان کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے۔ بہت رلا دینے والا یہ سانحہ جسے تیسرے درجے کی آگ قرار دے کر معاملہ ختم کر دیا گیا، نجانے کتنے شفاعت اور شفا جیسی لڑکیاں ساتھ لے گیا۔ سائرہ آپ کے افسانے نے واقعی بہت رلایا۔ موت تو سب کو آتی ہے مگر ایسی موت ہمارے اداروں کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہاں سب کو اپنے اپنے مفاد کی فکر ہے۔ ڈاکٹرز کی ہڑتال سے مرتے مریض بھی ہم نے دیکھے ہیں اور اپنے ہی بیٹے کے قاتلوں کو پکڑوانے کے لیے پولیس کو رشوت دینے والے مظلوم وارث بھی، مگر اثر کسی پر نہیں ہے۔ سپریم کورٹ ایسے معاملات پر کیوں چپ ہے؟ کیا قائد اور اقبال کا یہ پاکستان تھا؟ جہاں دہشت باعزت شہری اور حلال کمانے والا مزدور محنت پر شرمندہ ہے۔ جس کا بھی ضمیر زندہ ہے وہ ان حالات پر نوحہ کناں ہے۔ الیکشن پھر آنے والے ہیں، خدا کرے کہ چہرے ہی نہیں کردار اور عمل بھی تبدیل ہوں۔ انصاف کے لیے ہمیں میتیں سڑکوں پہ رکھ کے احتجاج نہ کرنا پڑے۔

ج : ظل ہما! سائرہ رضا کا افسانہ پڑھتے ہوئے ہماری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے بلدیہ ٹاؤن کی فیکٹری میں آگ لگنے والا سانحہ جس میں تین سو زندہ انسان جل کر کوئلہ ہو گئے۔ اب تک اس کی تحقیقات نہیں ہو سکی ہے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ فیکٹری مالک سے بھتہ طلب کیا گیا تھا۔ بھتہ نہ دینے پر فیکٹری کو آگ لگا دی گئی۔ یہ اتفاقی حادثہ ہو یا بھتہ وصولی کا شاخسانہ یہ انتہائی المناک سانحہ ہے۔ حکمران تو اپنے فرائض سے غافل ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکتے ہیں۔ ظالموں کو بے نقاب کرے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچائے۔

سپریم کورٹ ہر معاملے پر ایکشن نہیں لے سکتی کچھ کام حکومت کے کرنے کے ہیں۔

عائشہ اسما..... پشاور

خواتین ڈائجسٹ میں اپنی پسندیدہ مصنفہ رضیہ بٹ کے بارے میں پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور دکھ بھی۔ خوشی اس وجہ سے کہ کوئی تو انہیں یاد کر رہا ہے۔ ان کی رحلت کی خبر تو میں اخبار میں پڑھ چکی تھی لیکن ان کے بارے میں تفصیل سے پہلی بار پڑھا۔ میں پٹھان ہوں اور اکثر اردو لکھنے میں غلطی کر جاتی ہوں مگر اب میں رضیہ بٹ کی وجہ سے خود کو لکھنے سے نہ روک پائی۔ میں نے پہلا ناول جوان کا پڑھا تھا وہ تھا "عاشی" میں نے سوچا تھا کہ جب مجھے موقع ملا میں ضرور پوچھوں گی ان سے کہ "عاشی" ناول کہیں سچا واقعہ تو نہیں ہے کیونکہ دو ناموں کا فائدہ لینا۔ اس طرح نہ کبھی میں نے دیکھا تھا نہ پڑھا تھا۔ مجھے ان سے دل ہی دل میں انس تھا ہے اور رہے گا۔

اس دفعہ ساری ہی تحریریں اچھی تھیں۔ نگہت عبداللہ کو نہ پا کر اک کمی سی محسوس ہوئی۔ فرحت اشتیاق کو اتنا اچھا ناول لکھنے پر مبارک باد۔ ام مریم کو اس کی کیے کی سزا آخر مل ہی گئی۔ نبیلہ عزیز، نبیلہ ابر راجہ، رخسانہ نگار عدنان کوئی ناول تحریر کریں اور ہاں راحت جبیں بھی۔

ج : پیاری عائشہ! بہت خوشی ہوئی آپ کا خط پڑھ کر آپ نے بہت اچھا خط لکھا۔ اور یہ کیا بات ہوئی کہ پٹھان ہیں اس لیے غلط اردو لکھتے ہیں یا غلطی کر جاتی ہیں غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے پٹھان تو بہت اچھی اردو جانتے ہیں اردو کے بڑے بڑے شعراء پٹھان ہی تھے۔ اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

روشن ہاشم..... کراچی

اس ماہ کا ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ خوب صورت رنگوں سے سجی ماڈل کے کپڑوں نے بہت اٹریکٹ کیا۔ سب سے پہلے کرن کرن روشنی پڑھا ایمن طارق اور علی گل پیر سے ملاقات اچھی رہی۔ "صورت گر کچھ خوابوں کے" خاص طور پر رضیہ بٹ صاحبہ کے لیے لکھا گیا مضمون اچھا لگا۔ رضیہ بٹ صاحبہ کی یاد میں جو آپ نے افسانہ اس ماہ شامل کیا ہے۔ بہت شکریہ۔ ان کی لکھی ہوئی خوب صورت تحریر تھی۔ ان کے بے شمار ناول ایسے ہیں جو بھلائے نہیں جا سکتے، وہ ایک بے انتہا اچھا لکھنے والی تھیں ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا آسیہ رزاقی صاحبہ کا "خوشیوں کا اعلان" دیکھ کر دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ بہت

سانحہ ارتحال

ہماری قاری ثمینہ اکرم، جو خواتین اور شعاع کے سلسلوں میں بڑی باقاعدگی سے شرکت کرتی ہیں، ان کے 21 سالہ نیک اور فرماں بردار بیٹے معیز اکرم کا 11 نومبر 2012ء کی رات ماڑی پور پر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا ہے۔

ہم ثمینہ اکرم کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ثمینہ اکرم اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل اور معیز اکرم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

شان دار ناول تھا۔ فرحت اشتیاق صاحبہ کا ناول اختتام کو پہنچا میں اس کے لیے خاص طور پر الگ سے لکھنا چاہوں گی کوہ گراں اچھا جارہا ہے۔ اب آتے ہیں نگہت سیما کے "زمین کے آنسو" کی طرف۔ بے حد، بے حد شاندار ناول اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے تاکہ اس کے کردار کھل کر سامنے آجائیں۔ نگہت نے بہت اچھا موضوع لیا ہے۔ ناولٹ میں دونوں ہی اچھے لگے۔ افسانے تو خیر خواتین میں سب ہی اچھے ہوتے ہیں خاص طور پر اس ماہ "سبق اور چھاؤں" سے پسند آیا۔

ج: پیاری روشن! خوشی کی بات ہے کہ آپ نے ہمت نہیں ہاری اور مزید کوشش کا عزم وارادہ رکھتی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلسل کوشش ہی کامیابی کی منزل تک جانے کا واحد راستہ ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مزلفہ عارف بھنڈر۔۔۔ گاؤں ہاری بھنڈراں نوشہرہ ورکاں

میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے والد کو ناول پڑھتے دیکھا وہ ناول اکثر رات میں بیڈ پر لیٹ کر پڑھتے تھے اس وقت مجھے پڑھنا وغیرہ نہیں آتا تھا لیکن میں اپنے ابو کے مطالعہ سے بہت متاثر تھی تو میں ان کی نقل اتارنے کے لیے ہاتھ میں ناول لے کر بیڈ پر لیٹ کر ان کے انداز میں صرف ہونٹ ہلاتی رہتی تھی جب پڑھنے کے قابل ہوئی تو ابو جان سے بڑھ کر ناولز کی شوقین نکلی۔

میں ایک جوائنٹ فیملی سے تعلق رکھتی ہوں اور جوائنٹ فیملی سسٹم کی وجہ سے کوئی کام کرنے یا باہر نکلنے پر بڑی باتوں اور چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

میں نے کچھ اشعار اور غزلیں لکھی ہیں۔

ج: مزلفہ! مطالعہ کا شوق بہت اچھی بات ہے۔ اس سے انسان کا ذہن روشن ہوتا ہے۔ شعور آتا ہے زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ شاعری کے سلسلے میں معذرت خواہ ہیں۔

اقراء اکرم، سائرہ مختار۔۔۔ گاؤں سہیلیاں شریف

ہمارے گھر میں خواتین اور شعاع کافی عرصے سے پڑھے جارہے ہیں۔ اس کے سب ہی ناول اچھے ہوتے ہیں۔ میں نے تو ناول دل دیا دہلیز پڑھ کر رسالے پڑھنا شروع کیے تو اب تک پڑھ رہی ہوں پلیز میری غزل ضرور شامل کریں۔

ج: اقراء! خواتین اتنے عرصے سے پڑھ رہی ہیں تو پہلے خط کیوں نہیں لکھا۔ غزل کے لیے معذرت۔ فی الحال آپ اچھی شاعری کا مطالعہ کریں۔

صبیحہ عفیرا۔۔۔ گاؤں چھوکر خورد

ٹائٹل بس سو سو ہی تھا، رضیہ بٹ کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں (آمین)

کرن کرن روشنی سے مستفید ہونے کے بعد عنیزہ سید کے ناول کو پڑھا۔ اس ناول کی تعریف تو گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ فرحت آپی کو اتنا زبردست لکھنے پر مبارک باد۔

دونوں ناولٹ اور مکمل ناول بھی ہمیشہ کی طرح بہت اچھے تھے۔ افسانوں کی تو بات ہی الگ ہے 'خواتین ڈائجسٹ کے افسانے ہمیشہ سبق آموز ہوتے ہیں' اس دفعہ جہاں سائرہ رضا نے رلایا وہیں ثمرہ بخاری نے ہنسنے پر مجبور کردیا۔

"ہمارے نام" میں حبیبہ ساجد کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ میری بیاض سے تمام بہنوں کا انتخاب اچھا تھا۔

ج: صبیحہ اور عفیرا! آپ نے دیکھا، آپ کا ڈر کتنا بے معنی تھا۔ زندگی میں بہت سے مواقع ہم محض اپنے ڈر اور خوف کی بنا پر ضائع کردیتے ہیں۔ اور اس طرح ہماری بہت سی صلاحیتیں سامنے نہیں آتیں۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے آپ کے ممنون ہیں متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

مسرت ظہور سپرا۔۔۔ نارووال

خوب صورت سرورق سے مزین خواتین ڈائجسٹ میرے ہاتھوں میں ہے۔ فہرست پہ نظر ڈالی تو انشاء جی کا نام نظر آیا اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کی تحریر پڑھے بغیر بندی آگے چل دے۔ بات ہوجائے عنیزہ سید کے سلسلے وار ناول "کوہ گراں تھے ہم" بہت شان دار اس کے علاوہ

کیا لکھوں مجھے تو انہوں نے پہلی قسط سے ہی اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور عنیزہ جی پلیز سعد اور ماہ نور کو الگ مت کریں اور سارہ کے لیے اس کا جو کرجو کہ اب ہوٹل میں ملا ہے تو اسے سارہ سے بھی ملوا دیں۔ پلیز سعد کے پلے مت سارہ کو باندھنا۔ باقی کردار تو وقت کے ساتھ ساتھ ہی کھلیں گے۔

"جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" فرحت اشتیاق نے حسب معمول چھکا مارا ہے۔ مجھے یہ دھڑکا لگا تھا کہ کہیں سکندر اکیلا نہ رہ جائے اور اس کی بیلا Bella اسے چھوڑ ہی نہ دے۔ زین نے جب سکندر کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی تو سکندر تو نہیں رویا مگر میں بہت دیر تک روتی رہی تھی زین کی ندامت اور اس نے جو سکندر کو دکھ دیے اس کی وجہ سے۔ بہرحال فرحت اشتیاق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ثمرہ بخاری کافی عرصے بعد دکھائی دیں اور حسب معمول موڈ کو خوشگوار کر گئیں۔ فیضیہ عامر مجھے نیا نام لگا مگر "کمائی" اچھا ناولٹ ہے۔ سائرہ رضا کے کیا ہی کہنے۔ جب بھی لکھا۔ شاندار لکھا میں تو ان کی تحریر "سرسوں کے پھول" سے ہی فین ہوں اور اب محبت کہانی بھی بہت اچھی تحریر ہے۔ نگہت سیما ایک منجھی ہوئی لکھاری ہیں۔ زمین کے آنسو کی تیسری قسط چل رہی ہے لیکن ابھی ایک بھی نہیں پڑھی (حیران نہیں ہوں) جب آخری قسط آئے گی تو اکٹھا ہی ناول پڑھ ڈالوں گی اس وقت تک کے لیے تبصرہ محفوظ ہے۔ "خوابوں کے صورت گر" رضیہ بٹ یہ تحریر بہت ہی خوب صورت اور ایمان داری سے لکھی گئی ہے اور ان کی اس بات سے میں بھی متفق ہوں کہ نائلہ صائقہ قسم کے ناول ایک مخصوص عمر کی لڑکیوں کے لیے ہی تھے۔ آسیہ رزاقی کی تحریریں ہمیشہ اندر ہی اندر سوچ کے در وا کردیتی ہیں۔ ان کی تحریروں کا ہمیشہ ہی انتظار رہتا ہے۔ ہما کوکب بخاری بہت اچھا لکھتی ہیں مگر اب نظر نہیں آتیں۔ کیا ملک سے باہر ہیں یا مصروف بہت زیادہ ہیں۔ پلیز ان سے کہیں، تھوڑا سا وقت ہم جیسے قارئین کے لیے ضرور نکالیں۔ اب کنیز نبوی بھی تو اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال ہی لیتی ہیں۔ مہر گل کا افسانہ "بندھن" کچھ متاثر کن نہیں تھا۔ شاید شوبز سے متعلق لوگوں کے اس قسم کے بندھن کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوتی ہے۔ ایمن طارق سے ملاقات بہت پسند آئی۔ شاہین رشید سے فرمائش ہے کہ طلاق کے بعد والی ڈاکٹر شائستہ سے ملاقات کروائیں۔ ویسے آپی! مجھے بہت حیرت ہوتی ہے کہ اتنی پڑھی لکھی خاتون نے اس قسم کی حرکت کیوں کی۔ بقول ان کے ان کے شوہر انتہائی بے ضرر قسم کے میاں تھے۔ آپی فریدہ اشفاق کہاں ہوتی ہیں۔ پلیز ان سے مکمل یا سلسلے وار ناول لکھوائیں۔ بہت لمبی غیر حاضری ہے ان کی۔

ج: پیاری مسرت! تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

عنیزہ سید کے دو ناول شائع ہو چکے ہیں۔ "شب گزیدہ" اور "دل من مسافر من" آپ جو ناول منگوانا چاہتی ہیں ان کی قیمت منی آرڈر کردیں۔ ایک ساتھ جتنے ناول چاہیں منگوا سکتی ہیں۔ اپنا ایڈریس صحیح اور صاف صاف لکھیں۔

عالیہ بتول۔۔۔ حویلی بہادر شاہ

بہت خوشی ہوئی ٹائٹل دیکھ کر۔ ماڈل کا جدید سوٹ اور خوب صورت اسٹائل کلر کمبی نیشن بھی اچھا تھا۔ سب سے پہلے کرن کرن روشنی پڑھا۔ جبری نکاح شادی میں گانا بجانا نکاح کی شرائط سب بہت اچھا لگا پڑھ کر۔

عنیزہ جی کے کیا کہنے بہت خوب فرحت اشتیاق نے بھی اچھا اینڈ کیا ام مریم کے لیے دکھ محسوس ہوا لیکن برائی کا انجام ایسا ہی ہونا تھا نگہت سیما کے ناول میں مائرہ کا کردار بہت غلط ہے سب بھائی بھی عمارہ سے دور ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ سے۔ آسیہ رزاقی کا "خوشیوں کا اعلان" اچھا تھا۔ فیضہ عامر کا کمائی بہت اچھا تھا۔ سائرہ رضا "محبت کہانی" بہت دکھی کر گئی۔ فیصل آباد اور کراچی والوں کا دکھ تازہ ہوا۔ چھاؤں سے دھوپ تک رضیہ مہدی کی کہانی اچھی تھی۔

ج: پیاری عالیہ! خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند آیا یہ جان کر خوشی ہوئی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

عائشہ خان۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

ٹائٹل بہت بہت ہی پیارا لگا۔ مجھے ایسے ٹائٹل پسند ہیں۔ سب سے پہلے "جو بچے ہیں سنگ" پڑھا بہت اچھا اینڈ کیا

اور Bella کہنا تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ میں اپنی بھانجی زینب کو بھی Bella کہوں گی۔
"زمین کے آنسو" اف نگہت سیما جی آپ نے کیا موضوع اٹھایا ہے۔ اسماعیل کے بارے میں پڑھتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
احمد رضا جیسا کردار میں نے حقیقت میں دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کا ایمان برقرار رکھے آمین۔ سیما جی پلیز احمد رضا کو اس پاتال سے نکال لیں۔ اس کو بروقت عقل دے دیں۔
رضیہ بٹ کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ ان کا ناول "آگ" میں نے پڑھا ہوا ہے۔ اچھی رائٹر تھیں۔
ثمرہ بخاری واہ کیا بات ہے۔ جب بھی آتی ہیں' ہنسا ہنسا کر پیٹ میں درد کر دیتی ہیں مگر ہمیں اتنا نہیں ہنسنا' ہمیں بہت سارا ہنسنا ہے۔ پلیز ناول یا ناولٹ لکھیں۔ افسانے سے کام نہیں چلے گا۔ پلیز ثمرہ جی پلیز۔

ج : پیاری عائشہ! خط اس لیے مختصر کر دیے جاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ خطوط کو جگہ مل سکے۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عارفہ راجپوت.....نامعلوم شہر

"کوہ گراں" ہمیشہ کی طرح پرفیکٹ تھا اور فرحت جی کے تو کیا ہی کہنے اور نگہت عبداللہ کی کہانی میرے خواب لوٹا دو بھی اچھا جا رہا ہے۔ اور باقی سلسلے بھی اچھے ہیں۔
شاعری بھیج رہی ہوں۔ پلیز بتائیں قابل اشاعت ہے یا نہیں۔

ج : عارفہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاعری کے لیے معذرت آپ شاعری کے بجائے نثر پر توجہ دیں۔

حافظہ سمیرا.....157 این بی

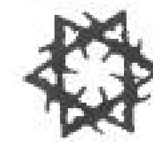
ہمارے گھر میں ہر ماہ خواتین رسالہ آتا ہے۔ اس ماہ کا سرورق دیکھ کر دل خوش ہو گیا آپی آپ سے گزارش ہے کہ نمرہ احمد' عمران عباس' اور فہد مصطفیٰ کے انٹرویو تصویر کے ساتھ شائع کریں۔ آپی خواتین ڈائجسٹ بہت دیر سے ملتا ہے ہم سالانہ خریدار بننا چاہتے ہیں۔ پیسے کیا لفافہ میں ڈال کر ڈاک کے ذریعے بھیج سکتے ہیں۔ ماہا ملک کا ناول "جو چلے تو جان سے گزر گئے" کہاں سے ملے گا ضرور بتایئے گا۔

ج : سمیرا! اگر آپ نے لفافے میں پیسے بھجوائے تو خدشہ ہے کہ ہم تک پہنچ نہ پائیں۔ راستے میں گم ہو جائیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ منی آرڈر کریں یا ڈرافٹ بنوا کر بھجوائیں۔
آپ خواتین ڈائجسٹ کے نام 600/ روپے منی آرڈر کر دیں۔ آپ کو ایک سال تک پرچہ گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔ منی آرڈر اس ایڈریس پر کریں۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37 اردو بازار کراچی۔

سائرہ عبید.....ڈنگہ

اس دفعہ پرچا تھوڑا سا جلدی دستیاب ہو گیا تو دل مچلنے لگا کہ فرحت اشتیاق کے لیے اس دفعہ کچھ نہ لکھنا زیادتی ہو گی۔ اتنا زبردست' اتنا خوب صورت' اتنا شان دار' بے مثال اور سحر انگیز ناول پڑھ کر دل چاہا کہ فرحت اشتیاق میرے سامنے آجائیں تو میں لیزا کی طرح فٹ سے ان کے گلے لگ جاؤں۔
ایسا بے مثال ناول تو شاید صدیوں تک لوگوں کے ذہنوں پہ طاری رہے گا سکندر اور لزا بے مثال کردار ہیں انسان کو اسی طرح بلند کردار' بلند حوصلہ اور اعلیٰ ظرف والا ہونا چاہیے۔

ج :۔ پیاری سائرہ! اتنے عرصے بعد آپ نے قلم اٹھایا بھی تو صرف ایک تحریر پر تبصرہ۔ آپ کا خط پڑھ کر تشنگی محسوس ہوئی۔ آئندہ تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔



میری خامشی کو بیاں ملے

ادارہ

شاہانہ بلوچ ’خان پور

(۱) میرا نام تو آپ لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ کیونکہ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا۔ قارئین بہنوں کو پڑھ کر دل چاہا کہ میں بھی لکھوں۔ پتا نہیں اب کیسا لکھ پاؤں گی یہ تو آپ لوگ بہتر بتائیں گے۔ نام میرا شاہانہ بلوچ۔ شہر خان پور سے تعلق ہے۔

(۲) خواتین سے وابستگی بہت پرانی ہے اتنی پرانی جتنا پرانا خود شعاع ہے یعنی پہلے شمارے کے ساتھ ہی سے میرا اور شعاع کا ساتھ ہے درمیان میں ساتھ چھوڑ بھی دیا تو پھر کچھ عرصے بعد دوبارہ جوڑ لیا۔ کزنز کہتی تھیں کہ شادی کے بعد آپ کا یہ شوق ختم ہو جائے گا۔ مگر مجھے شادی اور پھر ماشاء اللہ دو بچے۔ الہیان اور فاطمہ اور ان کی مصروفیات بھی ان تینوں شماروں سے دور نہ کر سکیں ہاں اتنا ضرور ہوا کہ پہلے والا شوق اور جنون ختم ہو گیا اور وجہ صرف اس کی یہ ہے کہ نئی رائٹرز کا انداز تحریر مجھے پسند نہیں۔ سوائے ثروت نذیر اور نایاب جیلانی کے۔ ابھی جنوری کا شعاع دیکھ رہی تھی کیونکہ یہ رسالہ مجھ سے مس ہو گیا تھا۔ اب میرے بھائی نے کراچی سے بھیجا ہے اس میں شمع فراز صاحبہ کا خط شائع ہوا۔ انہوں نے بہت خوب صورتی سے اس کی تعریف کی اور سب سے اچھی بات مجھے ان کی یہ لگی کہ اتنے لمبے عرصے تک سلسلے وار ناولز نہیں چلنے چاہئیں۔ بیس یا پچیس اقساط پر ناول ختم ہونا چاہیے۔ تینوں شماروں میں جو آج کل ناولز چل رہے ہیں میں بالکل بھی نہیں پڑھتی۔ میری کزنز اور مجھ سے بڑی بہن چمن شوق سے پڑھتی ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ہمارے شہر میں یہ رسالے نہیں ملتے۔ میں جب کراچی جاتی تھی۔ تو پی آئی بی اور کریم آباد سے پرانے رسالے خریدتی تھی۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ سارے رسالے ختم ہو گئے۔ تو ایک دن اسٹال والے انکل کہنے لگے بیٹا اتنا شوق میں نے کسی میں نہیں دیکھا۔ اب شعاع ’کرن اور خواتین تو ختم ہو گئے‘ آپ دوسرے پرچے خرید لیں۔ میں نے کہا آپ خریدنے کی بات کرتے ہیں۔ میں یہ سب مفت نہ لوں۔ میں نے جب یہ بات ریاض صاحب کو بتائی۔ تو وہ کہنے لگے۔ ”بیٹا اس طرح نہیں کہتے۔“

مجھے ریاض صاحب کی محبتیں اور شفقت بھرا انداز بہت یاد آتا ہے۔ انہوں نے مجھے نادرہ خاتون ’سلمیٰ کنول کے بہت ناولز پڑھوائے۔ مجھے کہتے تھے کہ آپ کے شہر میں رسالہ نہیں ملتا تو اپنا ایڈریس یہاں لکھواؤ۔ میں آپ کو رسالے بھجوا دوں گا۔ وہ مجھے رسالے بھجواتے تھے۔

2۔ خوبیاں اور خامیاں۔ انسان اپنے بارے میں خود تو نہیں بتا سکتا۔ یہ تو آپ کے بارے میں دوسرے بہتر بتا سکتے ہیں۔

میری بہترین دوست صدف اور چمن کی رائے یہ ہے کہ دنیاداری بالکل نہیں آتی۔ جھوٹ ’منافقت اور سیاست سے کوسوں دور ہے اور خامی یہ کہ غصہ بہت جلدی آتا ہے اور وہ بھی صرف اپنے پیارے سے بچوں پر اور وہ دونوں ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ میں جو کچھ ان کو سمجھاؤں ’وہ دونوں اسی طرح کریں۔ روز اسکول اور ٹیوشن میں پینسل شاپنر اور ربڑ گم کرتے ہیں میں اکثر بہنوں کے خط پڑھتی

ہوں کہ رسالہ پڑھتے دیکھ کر ابو یا پھر بھائی سے ڈانٹ پڑی یا کوئی اور بہن لکھتی ہیں کہ ہمارا سالن جل گیا۔ امی نے رسالہ جلا دیا۔ اللہ کا شکر کہ ہمارے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ جس دن رسالہ آتا اسی دن ختم۔ پھر باقی کا مہینہ بڑا بور گزرتا تھا۔ اتنی شدت سے پہلی کا انتظار کرتے کہ کوئی تنخواہ دار ملازم پہلی کا انتظار نہ کرے۔

خیر اب تو وہ باتیں نہیں رہیں۔ اب تو ایک ختم نہیں ہوتا دوسرا آجاتا ہے وجہ صرف گھر کا کام بچوں کی مصروفیات اسکول ’ٹیوشن ’مدرسے ’دن ختم۔ ساون کبھی اچھا نہیں لگا۔ وہ صرف جبین سسٹرز کو ہی اچھا لگتا ہے اور نہ اس سے وابستہ کوئی خوب صورت یاد ہے۔ عام دنوں میں بادلوں کو دیکھ کر کوفت شروع ہو جاتی ہے اور ساون تو میری بیزاری کو شدید ڈپریشن میں مبتلا کر دیتا ہے وجہ صرف لمبی لوڈشیڈنگ ہے۔

(3) پسندیدہ رائٹرز۔ بہت زیادہ پسند تو اقبال بانو ہے اور پھر رفعت سراج ’فریدہ اشفاق اور فارحہ ارشد ہیں اقبال بانو سے تو کبھی کبھی فون پر باتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ میری بہت اچھی دوست بھی ہے۔ اس کی ہر تحریر میں نے پڑھی ہے۔ جو اس نے شعاع خواتین اور کرن میں لکھی۔ رفعت سراج کا شاہکار تو شاہکار ہی تھا۔ فریدہ اشفاق کا موسم بے قرار۔ فارحہ ارشد کا (میں نیل کرائیاں نیکیاں) مجھے بہت پسند ہے۔ میں اپنی کزنز کلاس فیلو اور اپنی بہنوں کو ان کی ہر کہانی سناتی تھی۔ اب بھی مجھے لانگ ٹائم کی کہانیاں یاد ہیں۔ لیکن جو آج پڑھا وہ بالکل یاد نہیں۔ اس لیے تو اب کسی بھی کہانی پر تبصرہ نہیں کرتی ’کیونکہ کچھ پتا ہی نہیں رہتا۔

مجھے یاد ہے شکست شب کے اختتام پر فریدہ اشفاق کی رائے۔ اس نے لکھا کہ شاہانہ بلوچ کی تنقید میں بھی میرے لیے پیار ہوتا ہے۔ وہ میری تحریر میں معمولی سا بھی جھول برداشت نہیں کرتی اور سب ہی رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ماہا ملک عمیرہ احمد ہما کوکب

(4) پسندیدہ اقتباس۔ سب سے عام جھوٹ وہ ہے جو آدمی خود سے بولتا ہے۔ دوسروں سے جھوٹ بولنا غیر معمولی ہے۔ سچائی آج کل عنقا ہے اور جھوٹ اس قدر ہے کہ جب تک ہم سچائی کے شیدا نہ ہوں۔ ہم اس کو نہیں پہچان سکتے۔ سچائی کی راہ دشوار اور سخت ہے۔ اس راہ پر چلنا کٹھن ہے اور اس پر آخر تک گامزن رہنا ’صرف باہمت ’باوفا اور مردان خدا کا ہی خاصہ ہے۔

یہ دور ایسا ہے کہ لاکھوں ڈھب سے
فرعون یہ کہتا ہے کہ میں موسیٰؑ ہوں

ادراک کرو ’زندگی دوسروں کے عیوب پر نہیں اپنے محاسن پر گزاری جاتی ہے۔

اصل المیہ یہ نہیں کہ بدی کی بربریت اپنے عروج پر ہے ’بلکہ المیہ یہ ہے کہ اچھائی اپنے منہ پر قفل ڈالے بیٹھی ہے۔

سونیا ربانی قاضیاں محلّہ بالا

مسکرانا عادت ہے مسکراہٹیں بانٹتی ہوں
بس اتنا تعارف ہے یہی پہچان ہے میری

(1) نام ’آپ سب جانتے ہی ہیں۔ ویسے جس کو مجھ پہ پیار آ رہا ہو۔ وہ سونیا سے سوہنی بنا ڈالتا ہے۔ ویسے مجھے اکثر لوگ لیلیٰ بھی کہتے ہیں۔ اکیلی بہن ہونے کی وجہ سے جس کا جو دل چاہتا ہے کہہ لیتا ہے مجھے بھی اچھا ہی لگتا ہے۔ میری ماما کی صحت اکثر خراب رہنے لگی ہے تو میں گھر کے کاموں میں ہی لگی رہتی ہوں۔ پھر فارغ وقت میں کتابیں ’رسالے ’ڈائریاں ’فون ’میرے پودے وغیرہ۔ ایک خاص کام جو میں اپنے دل کے سکون کے لیے کرتی ہوں کہ تلاش رہتی ہے کسی معصوم سی لڑکی کی ’جو خود میں ہی قید ہو چکی ہو ’اسے واپس زندگی کی طرف لاتا۔

یعنی ڈپریشن والے دماغ کو فریش کر کے واپس اپنوں کی سچی خوشیوں میں لاتا۔۔۔ اور مجھے فخر ہے کہ میں کامیاب ہوں۔ وہ لمحے میرے لیے بڑے انمول ہوتے ہیں ’جب میرے کان یہ سنتے ہیں کہ سوہنی مجھے تو

تمہاری باتیں ہی واپس زندگی کی طرف لائی ہیں۔ کیونکہ لڑکیاں بہت معصوم اور تھوڑی سی بیوقوف ہوتی ہیں۔ جلد زندگی اور اس کی مشکلوں سے ہار جانے والی تو میں ان کی بہت اچھی دوست بن جاتی ہوں۔

(2)

عجیب ہوں میں اور عجیب لفظوں کی دنیا ہے
اکثر جو جو کہتی ہوں، وہ باتیں ضروری رہ جاتی ہیں

ہاں جی! خامیاں پہلے ہو جائیں۔ میری سب سے عجیب خامی یہ ہے کہ جہاں کسی کی بات اور مسئلہ آسانی سے سمجھ لیتی ہوں، وہاں اپنا مسئلہ چاہ کر بھی کسی کو سمجھا نہیں سکتی۔ دوسری جی چاہتا ہے، ہر وقت کوئی مجھ سے بچپن کی باتیں کرتا رہے۔ تیسری خامی اگر کسی کے لیے دل میں نفرت پیدا ہو جائے تو لاکھ کوشش کر لوں، دل صاف نہیں ہوتا میرا اور آخری خامی، میں ہر مسئلے کو ہر حد سے زیادہ سوچتی ہوں۔ یہ کافی ہیں ناں۔

جس کے دامن میں الٹ دیں اپنے دل کی کرچیاں
اس ہجوم شہر میں اک چارہ گر ایسا تو ہو

خوبیاں۔ ہاں! ہم ایسے ہی چارہ گر ہیں۔ میں بہت اچھی دوست ہوں، یہ مجھے معلوم بھی ہے اور سب کہتے بھی ہیں۔ کوشش ہوتی ہے کہ کسی کو میری وجہ سے دکھ نہ ملے اور کبھی کسی کا مسکرا کر بات کرنا بھی نہیں بھولتا، یعنی ہر بات یاد رہتی ہے۔

(3) خواتین کو شعاع میری دنیا میں لایا تھا اور اب تین سال سے زیادہ ہونے کو ہیں۔ شعاع کی طرح خواتین کی بھی ہر تحریر کو اعلیٰ پایا۔ رخسانہ آپا کی ہر تحریر مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ خواتین میں شائع ہونے والی ہر کہانی بہت اچھی ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات انسان سبق حاصل کر سکتا ہے۔ جو ابھی ناول چل رہا ہے رفعت ناہید کا 'چراغ آخر شب' بہت اچھا لگتا ہے مجھے۔ کبھی کبھی کسی تحریر کی کوئی ایک بات ہی دل کو برا کر دیتی ہے اور برداشت پیدا ہو جاتی ہے۔

اب وقت جیسے ہاتھ ہی نہیں آتا ہے اور نہ دل چاہتا ہے کہ جو جگنو اور تتلیاں دماغ میں اڑتے پھر رہے ہیں ان کو کاغذ پہ قید کیا جائے، مگر میں وقت ہی نہیں نکال پاتی۔

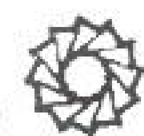
(4) سالگرہ۔ ہاں سالگرہ مناتی ہوں، مگر ایک دنیا سے الگ بات، میری سالگرہ 12 فروری کو ہوتی ہے اور نایاب 13 فروری کا دن میرے ساتھ گزارتی ہے اور اس کی 8 مارچ کو ہوتی ہے۔ میں 9 مارچ کو گاؤں اس کے گھر جاتی ہوں۔ گفٹ بہت سارے ملتے ہیں۔ کیونکہ میں خود ہر کسی کی سالگرہ یاد رکھتی ہوں تو سب کو میری بھی یاد رہتی ہے۔ میری یادگار سالگرہ وہ تھی جو گاؤں میں منائی تھی۔ 5 سال پہلے جب ہم 15 سال کے ہوئے تھے۔ سخت بارش ہو رہی تھی اور ہم منہ بنا کر بیٹھے تھے کہ ہمیں کیک کھانا بھی نصیب نہیں ہوگا۔ مگر میرے ابو شہر چلے گئے اور ایک خوب صورت سا کیک لے آئے۔ کہ میرے بیٹے کی سالگرہ ہو اور کیک نہ آئے، یہ کیسے ہو سکتا ہے اور میں بہت خوش ہو گئی تھی۔ رضی نے مجھے وصی شاہ کی کتاب گفٹ کی۔ مجھے بہت اچھا لگا اور اس بار ایمن آپی نے بھی وصی شاہ کی نئی کتاب گفٹ کر دی۔ جو میں خریدنے ہی والی تھی۔ بائی ہم نے تو اک پیاری سی نظم نایاب کی سالگرہ پہ خود لکھ کر اسے گفٹ کی تھی۔ اپنی ایسی قسمت کہاں! بس وہی 5 سال پہلے والی سالگرہ یادگار تھی، بارش میں بڑا مزا آیا تھا۔ اب تو جیسے 13 فروری کو ہی سالگرہ ہوتی ہے میری، نایاب کے آنے کی وجہ سے۔

(5) پسندیدہ شعر ہزاروں ہیں، بلکہ لاکھوں ہیں۔ مگر چلو! ایک ہی سہی۔ مگر نہیں ہم دو لکھیں گے۔

محبت اپنی بھی اثر رکھتی ہے فراز
بہت یاد آئیں گے ذرا بھول کر تو دیکھو

کب سے بارش کر رکھی تھی تم نے لاکھ سوالوں کی
خود پر اک سوال ہوا تو باتیں کرنا بھول گئے

اوکے جی! خوش رہو سب۔ اللہ حافظ۔



خبریں وغیرہ

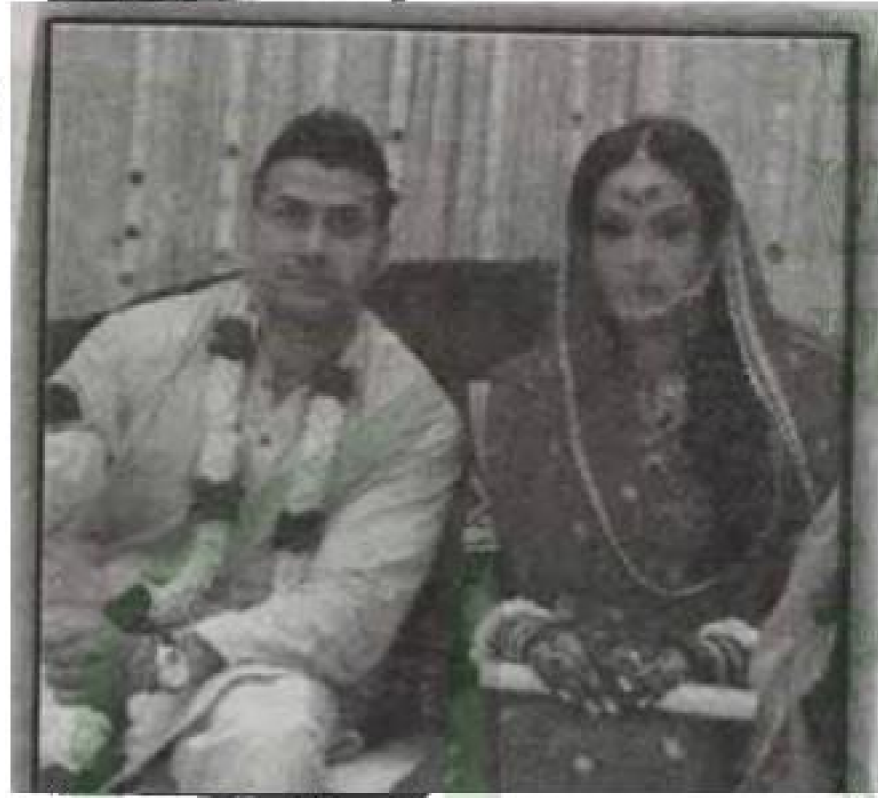
تبصرہ نشاط

شادی مبارک

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اور جب کسی فنکارہ کا فن اور عمر ڈھلنے لگتی ہے تو وہ شادی کر لیتی ہے مثلاً"..... چلیے جانے دیجیے۔

معروف اداکارہ سعدیہ امام کو مبارک ہو کہ وہ گزشتہ دنوں نکاح کے مقدس بندھن میں بندھ گئی ہیں۔ ان کے شوہر کا تعلق کراچی کے ایک اعلا خاندان سے ہے۔

واضح رہے کہ معروف اداکارہ سعدیہ امام اس سے قبل ایک "غیر معروف" شادی بھی کر چکی ہیں۔ ان کے پہلے شوہر اسلم پاکستانی نژاد آسٹریلوی شہری تھے۔ وہ شادی 2005ء میں ختم ہو گئی تھی۔ اس شادی کے ہونے اور پھر ٹوٹنے کی خبر پتا نہیں کیوں منظر عام پر نہ آسکی تھی، سوا کثر لوگ اس سے بے خبر ہی رہے۔ اب



اس شادی کے موقع پر اس کی بازگشت سنائی دی ہے۔ (ایک بار پھر "پتا نہیں کیوں؟")

سعدیہ امام کی رخصتی جنوری 2013ء میں ہونا قرار پائی ہے۔ وہ رخصت ہو کر جرمنی جائیں گی، کیونکہ ان کے دولہے میاں وہیں مقیم ہیں۔ سعدیہ امام شادی کے بعد ملک اور اداکاری، دونوں کو خیرباد کہہ دیں گی۔ وہ اپنے شوہر کی خواہش پر صرف اداکاری ہی نہیں چھوڑ رہیں، بلکہ انہوں نے اسکارف بھی لینا شروع کر دیا ہے۔ سعدیہ امام سے قبل اداکارہ سارہ چوہدری اور عروج ناصر نے بھی شادی کے بعد اسکارف لینا شروع کیا تھا اور تاحال لے رہی ہیں۔ دیکھیں! سعدیہ کب تک لیتی ہیں۔

بے گناہ

معروف اداکارہ نرگس کا شمار ان اداکاراؤں میں ہوتا ہے، جن کے فن سے زیادہ ان کی ذات زیر موضوع رہتی ہے۔ گویا نرگس بھی وہ اداکارہ ہیں، جو فن اداکاری کے رموز سے زیادہ خبروں میں رہنے کے فن سے خوب واقف ہیں۔ اتنی زیادہ کہ وہ ملک میں نہ بھی ہوں، تب بھی خبروں میں ضرور رہتی ہیں۔ وہ گزشتہ ماہ یورپ کے ایک ماہ کے دورے پر تھیں۔ مگر پیچھے ملک میں رہ جانے والے بدخواہوں کو ان کا یہ سیر سپاٹا ایک آنکھ نہ بھایا۔ فوراً "ایک کرائے کا قاتل پکڑا اور اس سے بیان دلوا دیا کہ جی! میرے کسٹمرز میں تو اداکارہ نرگس بھی شامل ہیں۔ انہوں نے مجھے ایک شخص کو ٹھکانے لگانے کا آرڈر دیا تھا، مگر پیمنٹ نہ ہونے کی



وجہ سے میں نے ان کا آرڈر پورا نہیں کیا۔

نرگس تک یہ اطلاع پہنچی تو وہ اپنی سیر ادھوری چھوڑ کر بھاگم بھاگ وطن واپس آئیں اور جھٹ پٹ ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔ انہوں نے اسکارف لیا ہوا تھا اور ہاتھوں میں قرآن پاک اٹھایا ہوا تھا۔ تاہم اس سے بھی ان کی تسلی نہ ہوئی تو انہوں نے قسمیں کھا کھا کر اپنے اوپر لگائے جانے والے اس الزام کی تردید کی۔

اس موقع پر نرگس نے اپنے "ستی ساوتری" ہونے کا مزید ثبوت پیش کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اب وہ اسٹیج پر رقص نہیں کریں گی (واضح رہے فلموں میں یا پرائیوٹ سی ڈیز کے لیے رقص نہ کرنے کا انہوں نے نہیں کہا ہے۔ لہٰذا شائقین خاطر جمع رکھیں اور نرگس کے بدخواہ اپنا سکھ چین ایک طرف اٹھا رکھیں۔)

نرگس نے کہا کہ جب کبھی وہ ملک سے باہر ہوتی ہیں تو ان کے مخالف ان کے بارے میں گمراہ کن خبریں پھیلا دیتے ہیں۔ (تو ملک میں ہی رہا کریں ناں نرگس جی!)

نرگس نے رو رو کر قسمیں کھائیں کہ ان کا یقین کیا جائے کہ وہ بے گناہ ہیں (قسمیں کھانے والے کتنے سچے ہوتے ہیں؟) ابھی وہاں موجود صحافیوں نے اس پر یقین کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ نرگس نے یہ کہہ دیا کہ وہ سینتیس سال کی ہیں اور تین سال بعد چالیس کی ہو جائیں گی۔ (لو جی! کر لو گل)

خوش نصیب

دنیا کا ہر شخص حق پانے کی خواہش رکھتا ہے، مگر اپنا حق..... یعنی وہ جو صرف اس کی ذات کے لیے ہوتا ہے..... اور وہ حق جو ساری کائنات کا سچ ہے۔ اسے پانے کی تمنا میں صرف وہی سرگرداں رہتا ہے جو خوش نصیب ہو اس خوش نصیب کا انتخاب بھی قدرت خود ہی کرتی ہے۔

امریکا کے ایک یہودی گھرانے میں جنم لینے والی مارگریٹ بچپن ہی سے اپنے اردگرد کے ماحول سے متنفر رہتی۔ فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم پر جب اس کے ساتھی خوشیاں مناتے تو یہودی ہونے کے باوجود اس کی روح تڑپتی رہتی۔ کوئی اس کے اندر چیختا رہتا۔

"یہ ظلم ہے..... یہ غلط ہے۔"

اسی ذہنی کشمکش نے اسے بیمار کر ڈالا۔ وہ اپنے مذہب سے بے زار ہو گئی۔ غیر محسوس طریقے سے اس نے اسلامی کتب کا مطالعہ شروع کیا۔ یوں فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم پر ناپسندیدگی کی صورت میں اس کے اندر حق کو پہچاننے کی جو ہلکی سی



کرن پیدا ہوئی تھی' ان کتب کے مطالعے سے نوری چراغ میں تبدیل ہو گئی۔ (سچ ہے کہ روشنی اگر تھوڑی بھی ہو تو تیرگی کو چیرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے) مارگریٹ نے معروف مذہبی اسکالر مولانا مودودی سے رابطہ قائم کیا اور وہ مسلمان ہو گئیں۔ مارگریٹ کا اسلامی نام مریم جمیلہ رکھا گیا۔

مریم جمیلہ پاکستان آگئیں۔ اجنبی دیس، اجنبی لوگ اور اجنبی ماحول کو مذہب نے اپنائیت کے رشتے میں سمو دیا۔ پھر یہ تعلق مرتے دم تک قائم رہا۔ مریم جمیلہ نے اپنے اعلیٰ کردار اور سیرت سے ایسا بلند مقام حاصل کیا کہ سب چھوٹے بڑے انہیں "آپا مریم جمیلہ" کہنے لگے۔ آپا مریم جمیلہ کے حسن اخلاق کی گواہی اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ مولانا مودودی کے ایک دیرینہ رفیق کار یوسف خاں صاحب کی بیگم کو آپا مریم جمیلہ ایسی بھائیں کہ وہ ان کے لیے اپنے شوہر کا رشتہ لے آئیں۔ مولانا کی مشاورت سے آپا مریم نے یہ رشتہ قبول کر لیا اور پھر دونوں سوکنوں نے تمام عمر ایک ساتھ ایک ہی گھر میں بسر کی۔ بے شمار سنہری یادوں کے نقش ثبت کر کے آپا مریم جمیلہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

(سچ ہے کہ عزت و ذلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہے۔ وہ چاہے تو امریکا کے ایک عام سے گھرانے میں پیدا ہونے والی "مارگریٹ" کو "آپا مریم جمیلہ" کا بلند رتبہ عطا کر دے یا سپر پاور امریکا کی سپر پاور کرسی پر بیٹھنے والے صدر کو ایک مسلمان کی اولاد ہونے کے باوجود ذلت و گمراہی کے رستے پر ڈال دے یا پھر مسلمان ملک کے مسلمان گھرانے میں جنم لینے اور ارباب اختیار میں شمار ہونے کے باوجود حق کو پہچاننے والے دیدۂ بینا سے محروم کر دے اور باطل قوتوں کے تلوے چاٹنے پر مامور کر دے..... اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ عزت دینے کے لیے منتخب کرتا ہے۔

ادارۂ خواتین ڈائجسٹ کے چیف ایڈیٹر عامر محمود سی پی این ای کے سیکریٹری جنرل منتخب ہو گئے

کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز (سی پی این ای) کے سالانہ انتخابات میں خواتین ڈائجسٹ گروپ کے چیف ایڈیٹر عامر محمود سیکریٹری جنرل منتخب ہو گئے۔ جمیل اطہر صدر، شاہین قریشی سینئر نائب صدر منتخب ہو گئے۔

وزیر اطلاعات قمر الزماں کائرہ، وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف اور وزیر اعلیٰ سندھ قائم علی شاہ کی مبارک باد۔



سی پی این ای کے سالانہ انتخابات 2012-13 کے لیے منتخب اسٹینڈنگ کمیٹی کے اراکین کا گروپ فوٹو



آپ کا باورچی خانہ

بشریٰ نوید باجوہ

بشریٰ نوید باجوہ..... اوکاڑہ

خواتین ڈائجسٹ سے وابستگی کو کافی سال گزر چکے ہیں۔ مگر جب سے سائرہ رضا کا ناول "سرسوں کے پھول رہا" تب سے ہم نے بھی اس سلسلے میں شرکت کرنے کی ٹھان لی اور آج آخر کار قلم اٹھانے کی جسارت بھی کر لی۔

1 - "ہمارے ہاں کھانے بناتے وقت پسند اور غذائیت دونوں کا ہی خیال رکھا جاتا ہے۔"

2 - مہمان اچانک آنے کا تو رواج ہی ختم ہو گیا ہے۔ آج کل تو لوگ اطلاع دے کر ہی آتے ہیں۔ میرے بچپن میں ایسا ہوتا تھا کہ مہمان اچانک چلے آتے۔ لیکن اب تو کبھی شاید ہی ایسا ہو۔

پہلے تو جب مہمان آتے تھے تو ان کے لیے دیسی ککڑ (مرغ) کا انتظام کیا جاتا تھا۔ جی جناب اپنے گھر نہ ہو تو اور کسی کے گھر سے ککڑ خریدنے جانے اور پھر پکڑنے کا الگ مسئلہ' سارے محلے کی سیر ہو جاتی تھی' ککڑ کو پکڑنے میں اور سب کو ہی پتا چل جاتا تھا کہ ان کے گھر مہمان آئے ہیں۔ ساتھ میں میوے ڈال کر زردہ تیار کیا جاتا تھا۔ کیا وقت تھا وہ بھی۔

ہم گاؤں میں رہتے ہیں۔ گاؤں کے 99 فیصد لوگ ایسے ہی مہمانوں کی میزبانی کرتے تھے۔ آج کل فاسٹ دور ہے۔ مہمان آئے بھاگ کر بازار سے چکن لایا جاتا ہے۔ جو جھٹ پٹ پک بھی جاتا ہے۔ ساتھ پلاؤ اور میٹھے میں سویاں یا کسٹرڈ۔ مہمان اچانک آجائیں یا بتا کر' یہی مینو ہوتا ہے۔ ہاں کوئی زیادہ قریبی رشتہ دار آجائے تو جو بھی پکا ہو کہہ دیتے ہیں۔

"آؤ بھئی آجاؤ۔ بسم اللہ کرو۔ جو پکا ہے حاضر ہے۔"

اور اگلے کھانے پر اہتمام ہو جاتا ہے۔ فروٹی سویاں بنانے کی ترکیب لکھ رہی ہوں' جو آسانی سے اور

جلدی بھی بن جاتی ہیں۔

فروٹی سویاں

اشیا :

کلرڈ سویاں	آدھا پیکٹ
دودھ	دو کلو
چینی، حسب ذائقہ	
انگور	آدھا کپ
سیب (کٹے ہوئے)	ایک چوتھائی کپ
کیلے (کٹے ہوئے)	دو عدد
چھوٹی الائچی	تین عدد

ترکیب :

دودھ میں الائچی ڈال کر پکالیں اور سویاں ڈال دیں۔ جب دودھ تھوڑا رہ جائے اور سویاں گاڑھی ہونے لگیں تو چینی، بادام، میوہ ڈال دیں۔ پانچ منٹ بعد اتار کر ڈش میں نکال کر اس میں تمام پھل شامل کرلیں اور ٹھنڈا ہونے کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔

3 ۔ گاؤں میں تو لوگ ہوٹلز میں جاکر کھانا نہیں کھاتے۔ نہ ہی اس کا رواج ہے۔ ہاں کبھی شہر میں رہنے والے رشتے داروں کے ہاں جائیں تو چانس بن جاتا ہے۔ (ہاہا) میں نے ایک بار ہی ہوٹل میں کھانا کھایا تھا۔ باجی کی فیملی کے ساتھ میاں چنوں میں۔

4 ۔ ناشتے میں ہمارے ہاں پراٹھے، مکھن کے ساتھ رات کا سالن، چائے اور اچار اگر کسی کی مرضی ہو تو لے سکتا ہے۔ ناشتے میں انڈے کے پراٹھے بنانے کی سادہ سی ترکیب ہے۔ حاضر خدمت ہے۔

انڈے کے پراٹھے

اشیا :

انڈے	دو عدد
پیاز (چوپ کرلیں)	ایک عدد
ہری مرچ (باریک کاٹ لیں)	تین عدد
ہرا دھنیا حسب ضرورت	
زیرہ پاؤڈر 1/2 چمچہ	
آٹا	دو کپ
گھی	حسب پسند

ترکیب :

انڈے توڑ کر تمام چیزیں اس میں مکس کرلیں۔ پراٹھا بنا کر توے پر ڈالیں پھر پلٹ کر اس کے اوپر کے حصے پر انڈے والا مکسچر ڈال دیں۔ کچھ دیر بعد الٹ دیں۔ اور دوسری سائیڈ پر گھی لگا کر تل لیں۔ گرما گرم نوش کریں۔

5 ۔ موسم کے حساب سے ہی کھانے کا لطف دوبالا ہوتا ہے۔ جو مزا بارش میں پکوڑے کھانے میں ہے 'وہ گرمی میں نہیں۔ سردی میں ساگ میں مکھن ڈال کر مکئی کی روٹی کے ساتھ کھانے کا مزہ ہی اور ہوتا ہے۔ مٹر پلاؤ سردی میں کھایا جائے۔ وہ گرمی میں مزا نہیں دیتا۔

6 ۔ کچن تو ہمارے گاؤں میں صحن میں ہی اونچی جگہ پر چولہا بنا کر بنالیا جاتا ہے۔ گیس بھی ہو تو چولہا گھسیٹ کر باہر صحن میں لے آتے ہیں۔ (ہاہا) ہاں البتہ سردیوں میں اندر آگ جلائی جاتی ہے۔ ٹپ تو یہی ہے کہ کھانا بناتے وقت اللہ کے نام سے آغاز کریں۔ کھانے میں بہت برکت پڑ جاتی ہے' کچن کے کاؤنٹر پر لگے زنگ کے داغ مٹانے کے لیے لیموں کا رس ملیں داغ ختم ہوجائیں گے۔



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

تلے ہوئے جھینگے

اجزا :

جھینگے	ایک کلو
کارن فلور	تین کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
پسی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

جھینگے اچھی طرح صاف کر کے دھولیں۔ ایک پیالے میں انڈا پھینٹ لیں۔ اس میں نمک، کالی مرچ، لیموں کا رس اور کارن فلور ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب اس آمیزے میں جھینگے خشک کر کے ڈال دیں۔ ہاتھ سے اچھی طرح مکس کریں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کر کے تھوڑے تھوڑے جھینگے تلیں۔ سنہرے ہو جائیں تو ٹشو پیپر پر نکال لیں تاکہ اضافی چکنائی جذب ہو جائے۔ کیچپ یا چلی ساس کے ساتھ پیش کریں۔

کھویا چھوہارے

ضروری اشیا :

دودھ	چار لیٹر
چھوہارے (بیج نکال لیں) (رات بھر پانی میں بھگو کر گٹھلیاں نکال لیں)	ایک کلو
کھویا	آدھا کلو
چینی	125 گرام

دودھ گرم کر کے اس میں چھوہارے پکنے کے لیے ڈال دیں۔ یہاں تک کہ دودھ گاڑھا ہو جائے تو جب دودھ میں ہلکا پانی باقی رہے تو اس میں کھویا ڈال دیں اور اوپر سے چینی بھی چھڑک دیں۔ جب چینی کا پانی خشک ہوجائے تو سمجھ لیں کہ کھویا چھوہارے تیار ہیں۔ چاند رات میں بنائیں اور عید کی صبح شیر خورمے کے ساتھ پیش کریں۔

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

بہت سے خطوط ایسے آتے ہیں جن میں بہنیں خود کو بد نصیب لڑکی سمجھتی ہیں، لکھتی ہیں یا کسی قسم کے وہم، گناہ کی وجہ سے ڈر اور خوف میں مبتلا ہوتی ہیں۔

آپ لوگوں نے کبھی سوچا ہے؟ اس حقیقت کا اندازہ ہے آپ کو، قدرت نے آپ کو کتنی نعمتوں سے نوازا ہے؟ آپ کو آنکھیں دی ہیں۔ ہاتھ پیر دیے ہیں۔ صحت دی ہے۔ آپ معذور نہیں ہیں۔ محتاج نہیں ہیں۔ آپ کو والدین جیسی نعمت دی ہے، پھر بھی آپ خود کو بد نصیب کہتی ہیں؟

جہاں تک قدرت کی طرف سے سزا اور گناہ کا تعلق ہے تو جب آپ نے توبہ کرلی تو آپ گناہوں سے پاک ہو گئیں۔ توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ آپ یہ وہم دل سے نکال دیں کہ آپ کی ناکامی کا سبب اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہے۔ اللہ تو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔

حسن و خوب صورتی، دولت، شہرت، اہم ضرور ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ اگر یہ چیزیں آپ کے پاس نہیں ہیں تو آپ کو زندگی میں کوئی خوشی حاصل نہ ہو۔ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ کامیابی اور خوشی آپ کے مقدر میں ہے تو آپ کو ضرور ملے گی۔

S-N

جب میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی تو میرے والد صاحب کی وفات ہوگئی تھی۔ اور جب سیکنڈ ایئر میں تھی تو میری باجی کی منگنی میری پھوپھو کے بڑے بیٹے سے ہوگئی اور ساتھ ہی میری ہلکی سی بات چھوٹے کے لیے ہوئی۔ چھوٹا بھائی عباس پڑھا لکھا نہیں تھا۔ وہ مجھے قطعاً "پسند نہیں تھا۔ میں نے اس رشتے کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا کیونکہ میرا ارادہ بی اے کرنے کا تھا۔ میں نے امی سے انکار کر دیا جس کا اثر کچھ نہ ہوا بلکہ امی سے ڈانٹ پڑی۔

پھر یہ ہوا کہ میری پھپھو کا بڑا لڑکا جس کی منگنی باجی سے ہوئی تھی۔ باہر چلا گیا۔ اس نے وہاں جانے کے کچھ عرصہ بعد رشتہ سے انکار کر دیا۔ اس کے بدلے میں عباس سے شادی کرنے کو کہہ دیا۔ میری امی اس رشتہ کو قبول نہیں کر رہی تھیں اور ہم سب بہن بھائی بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ خیر کافی دنوں یہ مسئلہ چلتا رہا۔ آخر کار یہ رشتہ منظور کر لیا گیا۔ کیونکہ میری باجی کو دورے پڑتے تھے۔ غیروں میں گئیں تو کہیں مسئلہ نہ بن جائے۔ باجی کی شادی عباس سے ہوگئی۔ شادی کے بعد وہ اکثر یہاں رہتے ہیں۔ باجی کی شادی کو تین سال ہونے والے ہیں، ابھی بچے نہیں ہیں۔ عباس بھائی اکثر سب بہنوں کو فلم دکھانے لے جاتے تھے۔ جو مجھے پسند نہیں لیکن مجبوراً "ساتھ دینا پڑتا تھا۔

پھر کچھ عرصے بعد عباس سعودی عرب چلے گئے..... اور جیسے میری دوسری بہنوں نے خط لکھے۔ میں نے بھی لکھے بھائی سمجھ کر اور بھائی بنا کر۔ واضح رہے کہ ہمارا بڑا بھائی کوئی نہیں ہے۔ ہم انہیں بھائی سمجھتے ہیں۔ وہاں جانے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے کچھ عجیب قسم کے خط لکھنے شروع کر دیے۔ جنہیں میں سمجھ کر بھی انجان بنی رہی کیونکہ میں انہیں (عباس کو) شرمندہ کرنا نہیں چاہتی تھی کہ میں ان کی باتوں کو سمجھ گئی ہوں۔ ہر خط میں لکھا ہوتا تھا کہ خط جلا دینا اگر خط نہ جلائے تو میں پاکستان واپس نہیں آؤں گا۔ جواباً "میں نے بھی لکھ دیا کہ میرے خط پھاڑ دیں۔ میں نے کوئی غلط بات کبھی نہیں لکھی تھی انہیں یہی گھر کی باتیں، سہیلیوں اور ملک کی سیاست کی خط پھاڑنے یا جلانے کو اس لیے کہتی تھی کہ میری لکھائی کافی گندی ہے۔

ایک سال بعد وہ اب آئے ہیں، سب کے لیے چیزیں لائے ہیں۔ میرے لیے سونے کا لاکٹ لائے ہیں۔ میں نے لے لیا۔ یقین کریں میں محبت وجبت کو بالکل اچھا نہیں سمجھتی اور نہ ہی کبھی کسی سے غلط نیت سے محبت کی ہے۔ بہن بھائی، والدین کیا کم ہوتے ہیں محبت کے لیے لاکٹ میں نے ان سے اپنا بھائی سمجھ کر ایک بہن کی حیثیت سے لیا تھا۔ ابھی کل ہی وہ طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ میرے دل میں ان کے لیے بھائی جیسی محبت ہے ـــــــــ ہم تینوں بہنیں ان کے پیچھے چلی گئیں کہ نجانے کیا بات ہے۔ میری دونوں بہنیں ایک کھانا بنانے اور دوسری چائے بنانے کے لیے باہر آگئی۔ میں واپس باہر آنے لگی تو انہوں نے مجھے روک لیا اور پھر انہوں نے جو باتیں کیں، وہ میرا ہوش اڑانے کے لیے کافی تھیں۔

انہوں نے کہا کہ تم میرے خط پڑھ کر ساری باتیں سمجھ چکی ہوگی۔ میں نے کہا "نہیں تو" انہوں نے کہا تم اتنی بھولی بھی نہیں ہو۔ پھر انہوں نے مجھ سے اظہار محبت کیا کہ وہ صرف مجھے دیکھنے کے لیے روزانہ یہاں آتے ہیں۔ ورنہ ان کے دوست مذاق اڑاتے ہیں کہ تم روزانہ سسرال کیوں جاتے ہو۔ یہ سب باتیں انہوں نے رو رو کر کی تھیں شاید ان کی باتیں سچ بھی ہوں۔ پھر کہنے لگے "مجھ سے ناراض نہ ہونا۔" انہوں نے ہاتھ جوڑ لیے۔ پھر اس کے بعد زور دینے لگے کہ تم اقرار کرو۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے اور تمہیں شادی والے دن افسوس ہو رہا تھا۔ میں ان کو کوئی جواب نہ دے سکی۔ میری شروع سے عادت ہے کہ بہت کم بولتی ہوں اور ہر ایک کی بات جیسی بھی ہو، ضرور مان لیتی ہوں اپنا چاہے جتنا نقصان ہو جائے۔

مجھے ان سے محبت نہیں ہے۔ میں صرف انہیں اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ گھر والوں کو یہ بات بتا نہیں سکتی۔ ہماری والدہ نے ہم پہ اندھا اعتماد کیا ہے میں ان کے اعتماد کو توڑنا نہیں چاہتی ہوں ساتھ اب یہ بھی کہتے ہیں کہ میں تمہاری شادی اپنے بھائی سے کروانا چاہتا ہوں تاکہ ہمیشہ تمہیں دیکھتا رہوں۔ کل انہوں نے یہ باتیں کی ہیں اور میں کل سے بہت پریشان ہوں۔ کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔

ج: میرے نزدیک تو بیوی کی بہن کا رشتہ بہت مقدس رشتہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بیوی کی بہن میں اور اپنی بہن میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ جس عورت کے ساتھ آپ نے عمر گزارنی ہوتی ہے۔ جس سے انسان کی نسلیں چلنی ہوتی ہیں۔ وہاں کسی قسم کی گراوٹ انسانیت سے گری ہوئی چیز ہے۔ لیکن زمانے کو کیا کہا جائے۔ اب اخلاقی اور انسانی گراوٹ ایک بے معنی چیز ہو کر رہ گئی ہے اور مقدس رشتوں کو پامال کرنے اور تباہ کرنے والوں کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کی مثال آپ کے بہنوئی کی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ آپ کو محتاط رہنا چاہیے تھا۔ بہنوئی کے ساتھ زیادہ بے تکلفی اور بے باکی سے ہنسی مذاق غیر مناسب بات ہے۔ وہ بھائی جیسے تھے بھائی تو نہیں تھے۔ آپ کو علیحدہ سے خط بھی نہیں لکھنا چاہیے تھے اور جب آپ سمجھ گئی تھیں کہ ان کی نیت صحیح نہیں ہے تو خط لکھنے کا سلسلہ فوراً بند کر دینا چاہیے تھا۔ سمجھ کر بھی انجان بنے رہنے سے ان کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔

میں آپ کو بتا دوں کہ آپ کو خود میں ہمت پیدا کرنی ہوگی۔ آپ نے کوئی گناہ تو نہیں کیا لیکن اب آپ نے ذرا سی بزدلی دکھائی تو آپ کی زندگی تباہ بھی ہو سکتی ہے۔ آپ ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ میں وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں۔ میں سب کے سامنے آپ کی حقیقت کھول دوں گی۔ میں زبان بند نہیں رکھوں گی۔

اچھی بہن! یہ سب آپ کو کہنا اور کرنا ہوگا۔ ایک بات میں یہاں اور بتا دوں کہ محبت کا یقین دلانے کے لیے [illegible] عیار اور زیادہ مکار ہوتے ہیں اور اپنے مکر و فریب کا جال مضبوط کرنے کے لیے

امت الصبور

بیوٹی بکس

عائشہ ریاض..... گاؤں تل سیداں

امید ہے کہ آپ بالکل ٹھیک ہوں گی۔ مجھے آپ سے صرف ایک ہی بات پوچھنی ہے۔ وہ یہ کہ سردیوں میں میرے ہاتھ پاؤں بہت کالے ہو جاتے ہیں بہت کولڈ کریمیں لگائیں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گلاب کے عرق اور گلیسرین کے محلول سے بھی مزید کالے ہو جاتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا طریقہ بتائیں جس سے ہاتھ پاؤں سفید ہو جائیں اور فریش۔

ج : عائشہ! اچھی بہن آپ گاؤں میں رہتی ہیں اس لیے پہلی احتیاط تو یہ کریں کہ جب لیموں اور گلسرین کا محلول لگائیں تو دھوپ سے احتیاط رکھیں۔ بہتر یہ ہے کہ رات سونے سے پہلے لگائیں۔

جو کا آٹا	دو چمچ
لیموں کا رس	دو چمچ
زیتون یا بادام کا تیل	دو چمچ

ان تمام چیزوں کو ملا کر پیسٹ بنالیں۔ فرصت میں ہاتھ دھو کر پندرہ منٹ تک اس پیسٹ کو ہاتھوں پر لگائے رکھیں۔ پھر اچھی طرح رگڑ کر اتار دیں اور نیم گرم پانی سے ہاتھ دھولیں۔ اس سے ہاتھ پیروں کی جلد میں خصوصی چمک اور نکھار آجائے گا۔ ہاتھوں کے لیے بازار میں اچھے ہینڈ لوشن بھی دستیاب ہیں۔ عموماً" یہ بڑے شہروں میں ملتے ہیں۔ اگر آپ منگوا سکتی ہیں۔ وہ ہاتھ پیروں پر رات کو لگا کر سو جائیں اور صبح صاف پانی سے دھولیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں اجلے ہو جائیں گے۔

نجمہ..... گوٹھ کھاہی

میری آنکھیں، سوجی ہوئی اور بے رونق نظر آتی ہیں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی ہیں۔ کبھی کبھی پیلی لگنے لگتی ہیں۔ بال بھی خشک' روکھے اور بے جان ہیں خصوصاً" سردیوں میں بہت خراب ہو جاتے ہیں۔

نجمہ! سب سے پہلے اپنی خوراک پر توجہ دیں۔ چکنی' تلی ہوئی بیکری کی اشیاء کھانا کم کردیں۔ غذا میں پھل' دودھ اور سبزیاں زیادہ مقدار میں شامل کریں۔ آج کل گاجروں کا موسم ہے' جتنا ممکن ہو' کچی گاجریں کھائیں۔ گاجر کا رس ویسے بھی آنکھوں میں چمک پیدا کرتا ہے۔ جلد کو نکھارتا ہے۔ صحت مند آنکھوں کے لیے وٹامن اے بھی بہت ضروری ہے۔ وٹامن اے انڈے کی زردی' مچھلی' مکھن اور سبز پتوں والی سبزیوں میں پایا جاتا ہے۔

آنکھوں میں چمک نہ ہونے کی ایک وجہ نیند کی کمی ہے۔ اچھی صحت' شفاف جلد اور چمک دار آنکھوں کے لیے آٹھ گھنٹے کی نیند لازمی ہے۔

آنکھوں کے گرد بادام کا تیل لگا کر بہت نرم ہاتھوں سے ہلکے ہلکے مساج کریں۔

کھیرے کے قتلے پتلے پتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھیں۔ آنکھیں روشن اور چمک دار نظر آئیں گی۔

بالوں کے لیے درج ذیل نسخہ استعمال کریں۔

دہی	ایک چھٹانک
انڈا	ایک عدد
لیموں کا عرق	ایک چمچہ

انڈے اور دہی کو اچھی طرح پھینٹ کر ملالیں۔ پھر اس میں لیموں کا عرق بھی ملالیں اور بالوں میں اس طرح لگائیں کہ جڑوں تک پہنچ جائے۔ 15 منٹ لگا رہنے دیں پھر نیم گرم پانی اور شیمپو سے دھولیں۔

ہفتہ میں ایک بار یہ عمل کرنے سے بال خوب صورت' نرم اور چمکدار ہو جائیں۔

مہینہ میں ایک بار مہندی لگانا بھی بالوں کے لیے بہت مفید ہے۔

